

# اسلامیت

فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی

مؤلفہ

سید ابوالا علی مودودی

مترجمہ

خورشید احمد

---

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ  
۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)



نام کتاب	اسلامی ریاست	
مصنف	سید ابوالاعلیٰ مودودی	
اشاعت	ایڈیشن	تعداد
۱	۲۱۰۵۰۰	اگست ۱۹۹۸ء
۲	۱۱۰۰	اکتوبر ۱۹۹۸ء
اہتمام	پروفیسر محمد امین جاوید، مینیجنگ ڈائریکٹر	
ناشر	اسلامک بلی کیشنز (پرائیویٹ) لیمیٹڈ	
شوروم	10 شہری روڈ ارڈوبازار لاہور	7248676
مطبع	منصورہ ملکان روڈ لاہور۔	448022
قیمت	228 روپے	شہزادہ کالج روڈ بالمقابلِ نو اردو بازار اوپنڈی شریف پر نظر لاہور

## عرض ناشر

”اسلامی ریاست“ کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت پر اعلیٰ علمی طقوں میں اس کی جس گرجوشی سے پذیرائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایڈیشن تکمیل عرصہ عی میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یونیورسٹیوں کے طلباء اور علم سیاسیات و اسلامیات کے شاگقین کی زبردست طلب کے پیش نظر ہم پہلے ایڈیشن عی کو دوبارہ جلد طبع کرانا چاہتے تھے، لیکن مرتب محترم کے اس ارادہ کے اظہار پر کہ وہ اس پر نظر ہافی کر کے ہر یہ تفصیلات و تشریحات کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں، ہم نے اس کی طباعت و اشاعت کو قدرے موخر کر دیا۔ الحمد للہ، اب ہم اب کتاب کو ایک ایسی جامع شکل میں پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسلام کے نظریہ سیاسی کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث ملے گی۔

اس کتاب کی علمی و استادی حیثیت کے لیے محترم مصنف و مولف کا نام کافی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامیات و سیاسیات کے یونیورسٹیوں کے طلباء اور تحقیقیں اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

اس ایڈیشن کو ہم بلند پاریہ تالیف کے شایان شان آفت کی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ قارئین اس کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں کہ ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں۔

مینیچن ڈائریکٹر

اسلامک پبلی کیشنز (پرمیویٹ) لمیڈیا

لاہور۔ ۳۱ اشوال المکرتم ۱۴۸۶ھ

مطابق ۲۲ رب جنوری ۱۹۶۷ء

# فہرست مضمون

16±15	دیباچہ	مصنف
36±17	مقدمہ	خوشید احمد
	ریاست اور اسلام۔ دور جدید اور اسلامی ریاست۔ عالم اسلام میں اسلامی ریاست کی چد و جهد۔ کچھ اس کتاب کے بارے میں۔	
<b>حصہ اول: اسلام کا فلسفہ سیاست</b>		
36	باب 1: دین و سیاست	
(۱)		
51±41	مذہب کا اسلامی تصور: مذہب اور تہذیب۔ ہماری سیاست میں جانشی تصور مذہب کے اثرات۔ قرآنی ذہن۔	
(۲)		
60±52	اسلامی ریاست کیوں؟	
(۳)		
79±61	اسلام اور اقتدار	
اسلام کا مشن۔ رواداری کا غلط تصور اور اس کا جائزہ۔		
حضرت یوسف علیہ السلام اور اقتدار حکومت		
(۴)		
84±80	دین و سیاست کی تفریق کا باطل نظریہ اور قصہ یوسف سے غلط استدلال	
(۵)		
117±85	تفریق دین و سیاست کا دفاع اور اس کا جائزہ	
دفاع۔ جواب۔ کیا اسلام میں تقاض ہے؟ دین کا مفہوم۔ تفریق دین و سیاست کا تاریخی اور نفیسیاتی جائزہ۔ چند بنیادی سوالات اور ان کا جواب۔ قصہ یوسف		

سے غلط استدلال۔ بحث جس سے غلط استدلال

118

## باب 2: اسلام کا سیاسی نظریہ

(۱)

135t122

بنیادی مقدمات۔

انہیاء علیہم السلام کا مشن۔ اللہ اور رب کا مفہوم۔ (۱) راست دعوے دار

(ii) بالواسطہ دعویدار۔ فتنہ کی جڑ۔ انہیاء کا اصل اصلاحی کام

(۲)

138t136

نظریہ سیاسی کے اولیں اصول

(۳)

149t139

اسلامی ریاست کی نوعیت

ریاست کی نوعیت۔ اسلامی ریاست کا مقصد۔ اسلامی ریاست کی خصوصیات

(الف) ایجادی اور ہمسرکیر ریاست۔ (ب) جماعتی اور اصولی ریاست

(۴)

155t150

نظریہ خلافت اور اس کے سیاسی مضرات

اسلامی جمہوریت کی حیثیت

156

## باب 3: قرآن کا فلسفہ سیاست

205t157

علم سیاست کے بنیادی سوال۔ چند بنیادی حقیقتیں۔ اسلامی تصور حیات۔

دین اور قانون حق۔ حکومت کی ضرورت و اہمیت۔ تصور حاکیت و خلافت۔

اصول اطاعت و وفاداری۔

206

## باب 4 : معنی خلافت

217t208

لغوی بحث۔ خلافت میں فرمانروائی کا مفہوم۔ قرآنی اشارات۔

خلافت الہی سے مراد کیا ہے؟

## باب 5: اسلامی تصور قومیت

(۱)

200±220

قومیت کے غیر حقیقی لوازم۔ قومیت کے عاصر ترکیبی۔ قومیت کے حاضر پر ایک عقلی تقدیم۔ اسلام کا وسیع نظریہ۔ عصیت اور اسلام کی دشمنی۔ عصیت کے خلاف اسلام کا جہاد۔ اسلامی قومیت کی بنیاد۔ اسلام کا طریق جمع و تفریق۔ اسلامی قومیت کی تغیر کس طرح ہوئی؟ مہاجرین کا اسوہ۔ انصار کا طریقہ عمل۔ رشتہ دین پر ماڈی ملائق کی قربانی۔ جامعہ اسلامیہ کی اصلی روح۔ رسول اللہ کی آخری وصیت۔ اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ۔ مغرب کی انگلی تقدیم۔

(۲)

280±261

### اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم

استدراک

## حصہ دوم: اسلامی نظمِ مملکت: اصول اور نظام کار

282

### باب 6 : اسلام کے دستوری قانون کے مأخذ

(۱)

291±286

### قرآن مجید

(۲)

308±292

سنن رسول اللہ۔ رسول بحیثیت معلم و مرتبی۔ رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ۔ رسول بحیثیت پیشواؤ نمونہ تعلیم۔ رسول بحیثیت شارح۔ رسول بحیثیت قاضی۔ رسول بحیثیت حاکم و فرمادہ۔ سنن کے مأخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع

(۳)

311±309

### خلافت راشدہ کا تعامل اور مجہدین امت کے فعلے

(۴)

316±312

مشکلات اور موافع۔ اصطلاحات کی اجنبیت۔ قدیم فتحی لشیخ پیر کی ناماؤں ترتیب۔

نظام تعلیم کا نقش۔ اجتہاد بلا علم کا دعویٰ

329t317

ضمیریہ۔ سنت رسول بحیثیت مأخذ قانون

330

باب 7 : اسلامی ریاست کی بنیادیں

(۱)

342t334

حاکیت کس کی ہے؟ حاکیت کا مفہوم۔ حاکیت فی الواقع کس کی ہے؟  
حاکیت کس کا حق ہے؟ حاکیت کس کی ہوئی چاہیے؟ اللہ کی قانونی حاکیت۔

رسول کی حیثیت۔ اللہ ہی کی سیاسی حاکیت۔ جمہوری خلافت

(۲)

344t343

ریاست کے حدود و عمل

(۳)

355t345

اعضا ریاست کے حدود و عمل اور ان کا باہمی تعلق  
majlis qanun saz کے حدود۔ انتظامیہ کے حدود و عمل۔ عدالیہ کے حدود و عمل  
 مختلف اعضا نے ریاست کا باہمی تعلق۔

(۴)

357t356

ریاست کا مقصد وجود

(۵)

369t358

حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟ صدر ریاست کا انتخاب۔ مجلس شوریٰ کی تشکیل  
حکومت کی شکل اور نوعیت

(۶)

373t370

اولی الامر کے اوصاف

(۷)

377t374

شہریت اور اُس کی بنیادیں

(۸)

381t378

حقوق شہریت

(۹)

**383t382**

شہریوں پر حکومت کے حقوق

**384**

باب 8: اسلامی دستور کی بنیادیں

(۱)

**390t388**

حاکمیت الہی

(۲)

**392t391**

مقام رسالت

(۳)

**395t393**

تصور خلافت

(۴)

**398t396**

اصول مشاورت

(۵)

**401t399**

اصول انتخاب

(۶)

**402**

عورتوں کے مناصب

(۷)

**404t403**

حکومت کا مقصد

(۸)

**409t405**

اولی الامرا اور اصول اطاعت

(۹)

**414t410**

بنیادی حقوق اور اجتماعی عدل

(۱۰)

**417t415**

فلح عامہ

**باب ۹: اسلامی ریاست کا مشائی دور  
(دور نبوی اور خلافت را شدہ پر ایک نظر)**

(۱)

441 ۴۲۰

دور نبوی۔ قانون خداوندی کی بالاتری۔ عدل میں الناس۔ مساوات  
میں المسلمين۔ حکومت کی ذمہ داری۔ شوری۔ اطاعت فی المرف۔ اقتدار  
کی طلب و حرص کا منوع ہوا۔ ریاست کا مقصد وجود۔ امر بالمعروف و نهى  
عن المکر کا حق اور فرض۔

(۲)

460 ۴۴۲

خلافت راشدہ۔ انتخابی خلافت۔ شوری حکومت۔ بیت المال کے امانت  
ہونے کا تصور۔ حکومت کا تصور۔ قانون کی بالاتری۔ عصیتوں سے پاک  
حکومت روچ جمہوریت۔

461

**باب 10: اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد**

(۱)

471 ۴۶۳

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس میں اجتہاد کا مقام  
قانون سازی کا دائرہ عمل۔ تعمیر احکام۔ قیاس۔ استنباط۔ آزادانہ قانون  
سازی کا دائرہ۔ اجتہاد۔ اجتہاد کے لیے ضروری اوصاف۔ اجتہاد کا صحیح  
طريق۔ اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔

(۲)

476 ۴۷۲

**چند اعراض اور آن کا جواب**

(۳)

485 ۴۷۷

**قانون سازی، شوری اور اجماع**

قانون سازی کا اصول۔ قانون سازی کے چار شعبے۔ مصالح مرسل اور استحسان۔  
عدلی فیصلوں اور یکلی قانون کا فرق۔ اجماع۔

(۲)

499t486

### نظامِ اسلامی میں نر زادی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

قرآن کی اصولی ہدایات۔ عہدہ رسالت میں رفع نر زادع کا طریقہ۔ خلافت راشدہ کا تعامل۔ عقل عام کا تقاضا۔

500

### باب 11: چند دستوری اور سیاسی مسائل

(۱)

515t502

### اسلامی ریاست کے چند پہلو

لادینی جمہوریت، تھیا کر لی اور اسلامی ریاست۔ اسلام میں قانون سازی۔ اسلامی ریاست کیوں؟ اسلامی ریاست میں ذمیوں کی حیثیت۔ مرتد کی سزا اسلام میں۔ اسلامی قانون جنگ اور غلامی۔ اسلام اور فنون لطیف۔ فتحی اختلافات اسلامی ریاست کے قیام میں حائل نہیں ہیں۔

(۲)

528t516

### خلافت و حاکمیت

اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات۔ الخلافت یا الحکومت۔ حکومت الہیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق۔ اسلامی حکومت اور مسلم حکومت۔ مسئلہ خلافت اور فرقہ پرستی۔

(۳)

544t529

### ملکی سیاست میں عورتوں کا حصہ

مجالس قانون ساز میں عورتوں کی شرکت کا مسئلہ۔ اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل۔ معاشرہ کی اصلاح و تربیت۔

(۴)

560t545

### ذمیوں کا حقوق

اسلامی ریاست میں ذمی رعایا۔ مزید تصریحات۔ ذمیوں کے حقوق

(۵)

568:561

## چند متفرق مسائل

تعیر دستور کا حق۔ اسلام اور جمہوریت۔ صدور ریاست کو دینوں کا حق

### حصہ سوم: اسلام کے اصول حکمرانی

#### باب 12: انسان کے بنیادی حقوق

بنیادی حقوق کا سوال کیوں؟ دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقاء۔  
 حرمتِ جان یا بھینے کا حق۔ معدودیں اور کمزوروں کا تحفظ۔ تحفظ ناموس خواتین۔  
 معاشی تحفظ۔ عدل و انصاف۔ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعادن۔  
 مساوات کا حق۔ معصیت سے اجتناب کا حق۔ ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق۔  
 سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق۔ آزادی کا تحفظ۔ تحفظ ملکیت۔ عزت کا تحفظ۔  
 نجی زندگی کا تحفظ۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق۔ آزادی انہمار رائے۔ ضمیر و  
 اعتقاد کی آزادی کا حق۔ مذہبی و لی آزاری سے تحفظ کا حق۔ آزادی اجتماع کا  
 حق۔ عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت۔ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی۔

#### باب 13: غیر مسلموں کے حقوق

598:596

(۱) غیر مسلم رعایا کی اقسام۔ معاہدین۔ مفتوحین

603:599

(۲)

618:604

### ذمیوں کے عام حقوق

حقافتِ جان۔ فوائد اداری قانون۔ دیوانی قانون۔ تحفظ عزت۔ ذمہ کی  
 پائداری۔ شخصی معاملات۔ مذہبی مراسم۔ عبادت گاہیں۔ جزیہ و خراج کی  
 تحصیل میں رعایات۔ تجارتی نیکس۔ فوجی خدمت سے استثناء۔

(۳)

620:619

فقہائے اسلام کی حمایت

(۲)

626t621

زاد حقوق جو غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں۔ رئیسِ مملکت کا منصب مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ۔ آزادی تحریر و تقریر وغیرہ۔ تعلیم۔ ملازمتیں۔ معاشی کاروبار اور پیشے۔ غیر مسلموں کے لیے تحفظ کی واحد صورت۔

627

### باب 14: اسلام اور عدل اجتماعی

634t629

دُورِ جدید کے چند فریب  
عدالت اجتماعی کی حقیقت۔ اسلام ہنی میں عدالت اجتماعی۔ عدل ہی اسلام کا مقصد۔

640t634

عدل اجتماعی کیا ہے؟  
انسانی شخصیت کا نشوونما۔ انفرادی جوابدی۔ انفرادی آزادی۔ اجتماعی اوارے اور ان کا اقتدار۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی خامیاں۔ اشتراکیت۔ ظلم اجتماعی کی بذریعیں۔

645t640

اسلام میں عدل کا تصور  
آزادی فرد کے حدود۔ انتقال دولت کے شرائط۔ صرف دولت پر پابندیاں۔  
محاذیتی خدمت۔ استیصال ظلم۔ مصالحہ عامہ کے لیے قومی ملکیت کے حدود۔  
بیت المال میں تصرف کے شرائط۔ ایک سوال۔

646

### باب 15: اسلامی ریاست کا رہنمای اصول (قرآن کی روشنی میں)

(۱)

653t648

حکومت کا مقصد

(۲)

660t654

اسلامی حکومت کا مزاج

(۳)

665t661

شورائیت

(۴)

عدل و احسان

(۵)

قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول

(۶)

دفائی اور اصول جنگ و صلح

(۷)

معاشرتی، سیاسی اور قومی پالیسی کے عمومی اصول

(۸)

شہریت اور خارجہ پالیسی

## حصہ چہارم: اسلامی انقلاب کی راہ

باب ۱۶: اسلامی انقلاب کی راہ

(۱)

اسلامی انقلاب کی راہ

(۲)

اسلامی حکومت کی خصوصیات۔ خلافت اسلامیہ

(۳)

اسلامی انقلاب کی نیکیں

(۴)

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

(۵)

پُرانی انقلاب کا راستہ

(۶)

ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار

(۷)

نظام اسلامی کے قیام کی سچی ترتیب

(۸)

سیاسی انقلاب پہلے یا اسلامی انقلاب؟

669t666

672t670

677t673

682t678

702t693

703

708t706

714t709

717t716

732t718

735t733

739t736

742t740

744t743

## دیباچہ

از مصنف

پچھے بیس سو سی سال کے دوران میں مجھے اور اس کے یا اسی نظام پر بہت کچھ لکھنے اور لکھنے کا موقع ہے۔ میں نے اس موجود پر اور اس کے بہت سے تعلقات پر اصول و نظری بحثیں بھی کی ہیں، اور اس لئے پہلی اچھی خاصی تفصیل کے مقابلہ و شذی ڈالی ہے کہ اس زمانے میں ملا ایک اسلامی ریاست کس نقشے پر بن سکتی ہے۔ یہ مضمایں اس طویل ترتیب کے دوران میں مختلف موقع پر مختلف مناسبتوں سے لکھے گئے ہیں یا تقریبی حدودت میں بیان کیے گئے ہیں، اور مختلف حصہ توں میں بین بھی ہوتے ہے ہیں، لیکن ایک ترتیب میں ان کو لے کر ایک کتابی شکل میں ترتیب نہیں کیا جاتا تھا۔ چند سال پہلے جانب خود شیخ احمد صاحب نے یہ رے مسند دعویٰ میں کوہ اسلامی ریاست کے عروزان سے ترقی کیا تھا، لیکن اس وقت مدارا مولا دامتا عال ذکر یا جاتا تھا۔ نیز اس مجموعہ میں نظری بحاثت اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے مسئلے پر بھی کچھ کوشش کی گئی تھی۔ اب اور مدارت اسلامی کے ذریعہ اسلامی جانب خود شیخ احمد صاحب کے موضع سے متصل ہیے کہ تم مضمایں کو دعویٰ میں ترقی کر دیا ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی ریاست کے تمام نظری بحاثت محدود ہیں اور دوسرا حصہ مدارت پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد اور کے مسئلے کے سب معنای میں کچھ کوشش کی گئی ہے۔ اب ایک تاری کے سامنے بیکہ وقت اسلام کے یا اسی نظریہ اور اس کے نظام ریاست کی پیدی تصور رکھا جاتی ہے۔ اس سے پہلے اس تصور کا ایک کوئی تعلق اوقات میں لکھا یا جانا نہ ہوا مگر کیا ہے ہی مرتے میں پیدی تصور رکھنے نہیں اُسکی تھی۔ یہی اس مجموعہ کا اصل مقصد ہے۔

میں نے اس پر کتاب پر از سر زدن ظرفی کر لی ہے اور ترتیب میں بھی میرا شروع شامل رہا ہے۔  
 جسے تو قرئے کر اپنی موجودہ صورت میں یہ کتاب درجت عالم ناظرین کے لیے مفید ثابت ہوگی، بھرنا میں طور پر اسلامیات اور علم سیاست کے طالب علم اسے اپنے لیے بہت فائدہ مند پائیں گے۔

لا ہدایہ بر شوال المکرم ۱۳۸۷ھ

مطابق ۱۹۶۵ء

خاکسار

ابو الاعلیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

## مقدمة

### از: مرتب

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ اہمیت سیاسی ہے جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امن قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفری میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے قیام و احکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروع و ارتقا کی تاریخ ہے۔

دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نئی مسجدیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کاربر ابر بڑھ رہا ہے۔ اب دنیا کے تقریباً تمام عی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظام و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ آج ریاست نے ایک ثابت کردار (Role) اختیار کر لیا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر رہی ہے۔

(۱)

## ریاست اور اسلام

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں

کیا۔ انہیاء کرام علیم السلام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تلحیح کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخلیقی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لئے خالص ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خنی ٹھل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار بھی تھی کہ:

يَأَيُّهَا أَيُّهَا الَّذِينَ يَرْجُونَ إِيمَانَنَا مَالِكُمْ مِّنَ الْأَنْبَيْرِ (الاعراف: ۶۵)

”اے برادران! قوم! اللہ کی بندگی کو اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ نہیں

ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنی قوم سے مخالفہ کیا کہ:

اتَّقُوا اللَّهَ وَاطِّيعُوهُ (الشراط: ۱۶۳)

”اللہ سے ذرخ اور میری اطاعت کرو“۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کے لئے جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم ہو اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لئے تھی اور ریاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری ٹھل میں چلا�ا بھی۔ باسیل اور تلمود کے مطالعہ سے دوسرے انبیاء نبی اسرائیل کے پارے میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ انہوں نے ریاست کے اوارے کی اصلاح کی کوشش کی اور نہلٹ قیادت پر بھرپور تنقید کی۔

<sup>۱</sup> اللہ۔ رب۔ عبارت اور دین، ان اصطلاحات کی صحیح مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو۔ ”قرآن کی بنیادی اصطلاحیں“ از سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک میل کیفتوں لینڈ لاہور

گر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ  
خالق ارض و سماءات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکتا ہے کہ:  
وَقُلْ رَبِّ الْجَنَّاتِ وَالْأَرْضِ مَدْخُلٌ مَّا تَرَكَ وَمَخْرُجٌ مَّا صَدَقَ وَاجْعَلْ لِي مِنْ  
لِدْنِكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (آنے اسرائیل: ۸۰)

”اور دعا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو داخل کر، سچائی کے  
ساتھ داخل فرم اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی  
طرف سے ایک اقتدار کو میرا مردگار ہنادے۔“

یہ آیت بھرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی بس مہرے  
اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ریاست کے ادارہ کی  
اہمیت بالکل روشن ہو جاتی ہے۔ اس آیت کا مفہوم مولانا مودودی صاحب کے  
الفاظ میں یہ ہے کہ:

”یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مردگار ہنادے تاکہ  
اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش  
اور معاصی کے اس سیلاپ کو روک سکوں اور تیرے قانون عدل کو  
جاری کر سکوں۔ یہی تغیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؓ اور فقارؓ  
نے کی ہے اور اسی کو این جریؓ اور این کیشؓ جیسے جلیل القدر مفرین  
نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ان اللہ لیزع  
بالسلطان مالا لیزع بالقرآن۔ یعنی ”اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے  
ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے، وہ صرف  
وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی  
طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود  
سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت

اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہتا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو، رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا عین مقام ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوسم، صفحہ ۶۳۸)

اس پر مزید روشنی مندرجہ ذیل آیات و احادیث سے پڑتی ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رَسُولًا إِلَيْنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَاسٌ شَدِيدٌ وَمَنْفَاعٌ لِلنَّاسِ (الحدید: ۲۵)

”ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری ہے۔ تاکہ انسان انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد ہیں۔“

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَهِّرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (الصف: ۹)

”وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام اوریان پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناکوار کیوں نہ ہو۔“

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَلَوْلُكُمْ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ: ۲۲)

”اور وہ جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔“

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الاسلام والسلطان لخولن توامان لا يصلح واحد منها الا بصاحب  
فالاسلام اس والسلطان حارس وما لامس له ليهدم وما لا حارس له  
ضيائع۔ (کنز العمال)

”اسلام اور حکومت و ریاست دو جتوں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت کویا اس کی نگہبان ہے جس عمارت کی بنیاد نہ ہو۔ وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔“

اسلامی گھر میں دین اور سیاست کی دوئی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان بیشہ اپنی ریاست کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یہ جدوجہد ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے۔ وہ قرآن پاک اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس طرح اخلاق اور حسن کردار کی تعلیمات پاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرت، تمدن، میہمت اور سیاست کے بارے میں واضح احکام بھی پاتے ہیں۔ اس دوسرے حصے پر عمل کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست ہو اور اگر اس حصے پر عمل نہ کیا جائے تو شریعت کا ایک حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن کے تصور کا محاشرہ وجود میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت نے مختلف طور پر نصب امامت کو فرض قرار دیا ہے اور اس بارے میں کوتاہی ایک دینی حکم کی بجا آوری میں کوتاہی ہے۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب ”الفصل بین الملل والنحل“ میں لکھتے ہیں:

اتفق جميع أهل السنة وجميع المرجينة وجميع الشيعة وجميع  
الخارج على وجوب الامامة وان الامامة واجب عليها الانقياد لامام  
عدل يقيم احكام الله ويسوسهم باحكام الشريعة التي انس بها رسول

الله صلی اللہ علیہ وسلم

”کل ائل سنت“، مرجیہ، شیعہ اور خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نسب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر آئے ہیں۔

اور شاہ ولی اللہ<sup>ؐ</sup> لکھتے ہیں:

”مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفا یہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے“ ۔ ۲

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ علا مصحابہ کرامہ نے نسب امام کو کتنی اہمیت دی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کبھی کہ وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جد مطر کی جمیزو تدفین سے بھی پہلے امام کا انتخاب عمل میں آیا، جس نے آپ<sup>ؐ</sup> کے قائم کیے ہوئے نظام کو تھام لیا اور پھر پوری شان مرکنت کے ساتھ سارے کام انجام دیئے۔ اسلام مادی اقتدار چاہتا ہے اور اس کے بغیر وہ اپنا مشن پورا نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ اقتدار بجائے خود مقصود نہیں ہے لیکن دعوت کی محیل اور اصلاح انسانیت کے عظیم کام کی انجام دینی کے لئے ہاگز بزریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے اس نکتہ کو واضح کر دیا کہ اسلام کا مادی اقتدار اس کے روشنی اقتدار کا ذریعہ ہے اور اس کے نتیجہ میں نیکیوں کا قیام اور برائیوں کا استعمال واقع ہوتا ہے۔

الفصل بین المل والخل از ابن حزم جلد چہارم صفحہ ۸۷۔

شاہ ولی اللہ<sup>ؐ</sup>، ازالۃ الخفاء، مقصد اول، فصل اول۔

الذين ان مكناهم في الارض اقلعوا الصلوة واتوا الزكوة ولمروا  
بالمعروف ونهوا عن المنكر والله عاقبة الامور (الحج: ٢١)

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے ائمیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا  
(یعنی ان کا حکم پڑنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے، اداۓ زکوٰۃ میں  
سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور  
تمام باتوں کا انجام کار اللہ علی کے ہاتھ میں ہے۔

ہماری اپنے عکس کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

۱ - ریاست کا ادارہ انسانی محتاج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر  
منظمه اجتماعی زندگی کا تصور مشکل ہے۔

۲ - اسلام انسان کی پوری زندگی کے لئے پدایت ہے اور اس نے اجتماعی  
زندگی کے لئے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

۳ - اسلام دین و سیاست میں کسی تفرقہ کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو  
خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے سیاست کو بھی  
اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اہل کے  
انتظام کے لئے استعمال کرتا ہے۔

۴ - یہ روشن دنیا اور آخرت دونوں میں عتاب الہی کی موجب ہے کہ کچھ  
اہکام الہی کو تو تسلیم کیا جائے اور کچھ دوسرے اہکام سے صرف نظر اور  
روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش اور نفس کی اندر وہی وحشت کی بنا پر  
با کسی بیرونی دباؤ یا مرجوبیت کی وجہ سے۔

۵ - دین اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے  
سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو  
ظلم اور بے انسانی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں "چنگیزی"  
رو نہا ہوتی ہے اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کا ایک

حصہ م uphol ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا کا دین حکمرانی اور نسلیہ کے بجائے غلامی اور مظہریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لئے سرگرم عمل رہے۔

(۲)

## دور جدید اور اسلامی ریاست

یہ تو ہے مسئلہ کا دینی پلو۔ لیکن اگر ہم دور حاضر کے تجربات کی روشنی میں اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہی ہے۔ مغرب میں لاوینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے۔ وہاں پاپائی قائم نے جو عقل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گئے جوڑ کے ذریعہ جن مظالم کو سند جواز دی گئی انہوں نے ایک رد عمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب یعنی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لاوینی ریاست تھی۔

یکورزم کی تحریک کا ہاتھ اعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل مکار و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس ملک کو سیاسی قویت حاصل ہو گئی، مخترا اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ افرادی زندگی تک محدود رہتا چاہیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی بندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملہ میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت

اور چار جانہ ماویت اور اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب میں لاوینی ریاست کے جو اثرات رونما ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) سیکولرزم نے تھیک اور ذہنی پر انگدگی کو پیدا کیا ہے۔ کوئی ایک نسب الحین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک حتم کی بے عقیدگی انسان میں پہلی گئی ہے۔ یہ اسی ذہنی ایشوار اور گھری تشتت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی اتنا کی طرف لے گئی۔ اشتراکیت کا مشور نقاد آر۔ این کریونٹ لکھتا ہے:

"اشتراکیت غرب و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصلی کوشش مچھے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تجوہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لئے ہے۔ یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خبائشوں اور بے انصافوں کا شور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی آکتا دینے والی بیکانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لا آتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلاء کو پر کیا ہے جسے منظم نہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لاوینیت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جاسکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جاسکتا ہے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علمبردار ہو۔" اب اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے وہ ذہنی بے اطمینان،

اضطراب، جذباتی تکون اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں۔

(۲) فرد کے سامنے نیا نسب الحین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی سمجھیل رہ گتیا اور قوی بیانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو علم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ اخلاقی محلی اور قوی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً اس صدی نے دو الی ہولناک عالی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی محتولین و مجرد میں کی تعداد سے کمیں زیادہ ہے۔

(۳) اس کے عام اخلاقی اثرات بھی جاہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی، جرات، اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور افادیت، مصلحت بینی اور ابنِ الواقعی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو معاشرہ کو سکون و اطمینان سے محروم کیے ہوئے ہیں۔

(۴) تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ارنولد تائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

”یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے۔ ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمیمی نتیجہ کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے۔“<sup>۱</sup>

(۵) پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم ملکہ تاریخ نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے لکھ چکی ہے۔ اگر ہمہ ناہ سے دیکھا جائے تو سیکولرزم آج ایک دیناںوی اور اذکار رفتہ تصور ہے اور مگر دش ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں، سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضائی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن اگر مزید تجویز کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم، انفرادیت، قومیت اور محاذی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے۔ اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مریوط ہیں۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ریاست صرف ایک دفائی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو یعنی اس کی ذمہ داری مختص نظم و نقق کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملہ اور اندرونی بد امنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری پوری آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کو روک کر سکتی ہے اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ آج ریاست مختص ایک عظیم الشان بت نہیں، آج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائرہ کو چھوڑ کر ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہے، ریاست عدم مداخلت پر کار بند رہے گی۔ آج اس کے وغایف نہایت عظیم اور اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ کی صورت گری کرتی ہے اور اپنی پالپی کے ذریعہ سے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے۔ یہ

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جمالت کو ختم کرے اور علم کی ہمس روش کرے، غربت کو ختم کرے اور دولت کی منصانہ حیثیم کی کوشش کرے۔ سماجی بہائیوں کا قلع قلع کرے اور شریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے۔ بیماریوں کا علاج، معلوموں کی فریاد رہی، مجبوروں کی مدد و استھانت کا اہتمام کرے۔ مختصرًا آج کی ریاست ایک فلاجی ریاست ہے اور اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی فیرجانب داری برداشت کے۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہو گا، کسی نہ کسی نظریہ کو قبول کرنا ہو گا، خرد شر اور فلاج و خران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہو گا۔ اور اس کی روشنی میں اپنی پوری پالیسی کو ترتیب دنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے اور وہ بیوادیں جن پر یکو لرزم کا نظام لگر قائم تھا، تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دنیاۓ حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بیوادوں پر یہ تکھہ تغیر ہوا تھا وہ مگر چیزیں اور محض تمناؤں کے ذریعہ اس خلاء کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی دنیا میں یکو لرزم کے لئے کوئی محفوظ نہیں، تاریخ اسے بہت بیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو یکو لرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔

(۳)

## عالم اسلام میں اسلامی ریاست کی جدوجہد

اس پس منظر میں جب ہم قدرت کے اس انظام پر غور کرتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلمان ممالک برسوں کی غلائی کے بعد پھر آزادی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کے قیام کی تحریک زور پکڑ رہی ہے تو ہمیں فطرت کا یہ اشارہ صاف

حسوس ہوتا ہے کہ گواہدہ تذہب کے زوال سے جو خلا رونما ہو رہا ہے۔ اسے پر کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہیوں صدی میں مسلمان ممالک ایک ایک کر کے مغربی استھان کے چھپل میں پٹے گئے۔ اور صرف دو تین عی ملک ایسے رہ گئے جو سیاسی فلامی کی تاریک رات سے محفوظ رہے۔ بیسویں صدی میں حالات نے کوٹ لی اور خصوصیت سے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مسلمان ممالک کی آزادی کا رجحان رونما ہوا۔ اس وقت ۳۲ آزاد مسلمان ملک موجود ہیں جو اپنے سیاسی اور تمدنی مستقبل کو خود تغیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سیاسی آزادی کے ساتھ عی بہت سے اہم مسائل رونما ہو گئے ہیں۔ جب تک مسلمان استھانی طاقتیں کے غلام تھے، ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی اجتماعی زندگی کی صورت گری اسلام کے اصولوں کے مطابق کر سکیں۔ ان کا دین زندگی کا ایک مکمل، شایطہ، فراہم کرتا ہے اور وہ اس وقت تک اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے جب تک انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جاری ذہاری نہ کر لیں۔ فطری طور پر آزادی کے فوراً بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب مجموعی نظام حیات کو اور خصوصیت سے ریاست اور قانون کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ لیکن وہ احساس ہے جو اسلامی نظام حیات اور اسلامی ریاست کے قیام کے عوامی مطالبات کی پشت پر کار فرمائے۔

تاریخ کے وسیع ترین منظر میں یہ تحریک بڑی حوصلہ افزا ہے اور اس سے مستقبل کی بہترن امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں لیکن غور و نگر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آخر ایک مسلمان ملک میں اسلامی ریاست کے مطالبات کی ضرورت عی کیوں پیش آئی۔ اسے تو فطری طور پر اسلامی ریاست عی ہونا چاہیے اور اس کی ساری قویں اسی مقصد کے لئے صرف ہونی چاہیں کہ وہ اسلام کے معیار

سے مطابقت پیدا کرے۔۔۔ لیکن بد صحتی سے اصل صورت حال یہ نہیں ہے اور اس کی بیادی وجہ یہ ہے کہ دور استعمار میں جو علیمی انقلاب آیا اس نے خود مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے دور کر دیا۔ ان میں سے ایک عظیم اکثریت کی معلومات اسلام کے پارے میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے ذہنوں کو اتنا مسوم کر دیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے پارے میں چند در چند غلط فہیموں کا فکار ہو گیا ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بد عن ہے اور ان کو مغرب کے پیدا کردہ تحصیلات کی عینک سے دیکھتا ہے۔ یہ گردوں آج کے دور میں اسلام کو اذکار رفتہ سمجھتا ہے اور مغرب کی اندر می تقلید اس کا دین و ایمان بن چکی ہے۔ یہ طبقہ خود اپنے ملک کے لوگوں کے جذبات و احساسات سے بر سر پیکار ہے اور آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ ایک طرف فقلات اور جمالت ہے اور دوسری طرف سوء عنین اور عداوت اور کمی چیزوں اسلامی ریاست کے فروغ کی راہ میں اہم ترین رکاوٹیں ہیں۔ ہماری لگاہ میں ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف اسلامی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیکانے پر پھیلایا جائے اور عوام کی ذہنی اور فکری تربیت ہو اور دوسری طرف زندگی کے تمام شعبوں میں ایک ایسی تیادت کو ابھار کر اوپر لایا جائے جو مسلمانوں کے سوا واعظیم کے جذبات و احساسات کو سمجھتی ہو، اسلام پر پکا یقین رکھتی ہو اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسے جاری و ساری کرنے کا دامیہ رکھتی ہو۔ لیکن وہ صورت ہے جس میں قوم کی ملا صیفیں اور قومیں باہم سکھش کے بجائے مثبت تغیریں صرف ہوں گی اور اس طرح برسوں کی منزلیں میتوں میں ملے ہو سکیں گی۔

(۲)

## کچھ اس کتاب کے بارے میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بیک وقت ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی کماحتہ کوشش کی ہے۔ ایک طرف انہوں نے اسلام کے پورے نظام حیات کو دینی اور عقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسلام کی اصل تعلیمات کو دور حاضر کی زبان میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحریرات کے مطالعہ سے قاری کو زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کا کلی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ پوری تصوری کو بیک نظر دیکھ سکتا ہے۔ انہوں نے ہر مرجوبیت سے بالا ہو کر دور حاضر کے ہر فتنہ کا مقابلہ کیا ہے اور اسلام کے نظام زندگی کی برتری اور فوائد کو ثابت کیا ہے۔ پھر سب سے پہلے کر اسلامی نظام کی محض نظری تشرع و توضیح ہی نہیں کی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس نظام کو دور حاضر میں کیسے قائم کیا جا سکتا اور آج کے اداروں کو کس طرح اسلام کے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ دیسے تو مولانا مودودی صاحب نے یہ کام زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں کیا ہے لیکن اسلامی ریاست کے تصور اور اس کے نظام کا کی تشرع و توضیح ان کا خاص میدان رہی ہے۔ انہوں نے جس اعتماد اور یقین کے ساتھ، جس بالغ نظری کے ساتھ، جس و بعثت مغل اور گراں کے ساتھ اور جس شرح و بسط کے ساتھ اسلامی ریاست کے ہدایت پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، اس میں دور حاضر میں ان کا کوئی شریک اور مدعی مقابلہ نہیں۔ بلاشبہ وہ اس پہلو سے عرب و محمد میں منفرد ہیں، موصوف نے دور جدید کے قاضوں کو سامنے رکھ کر اسلامی ریاست کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے اور اجتماعی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے اور تمام عملی مسائل کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کیا

ہے۔۔۔ اور یہی ان کا انتیازی کارنامہ ہے۔

اسلامی ریاست کے پارسے میں مولانا کے یہ مضمین و مقالات منتشر تھے۔ ان میں سے کچھ مختصر پیغفلشن کی ٹکل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، لیکن تمام مضمین ایک جگہ کتابی ٹکل میں پیش نہیں کیے جاسکے تھے۔ میں نے جس وقت اسلامی قانون اور اسلامی ریاست کے موضوعات پر مولانا کی تحریرات کا انتخاب انگریزی میں "اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹوشن" (Islamic Law & Constitution) کے نام سے پیش کیا تھا، اسی وقت اس ضرورت کا احساس بھی پیدا ہوا تھا کہ یہ مجموعہ اردو میں بھی شائع ہونا چاہیے لیکن مولانا اپنی بوصتی ہوئی مصروفیات کے باعث خود یہ کام نہ کر سکے۔ پھر جب میں نے انگریزی کتاب کا دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن تیار کیا تو یہ احساس دوبارہ تازہ ہو گیا اور چند احباب کے اصرار پر مولانا کے ارشاد کے مطابق میں نے ہی اردو کتاب کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا۔ تمام موارد جمع کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اسلامی ریاست اور اسلامی قانون کے موضوعات پر الگ الگ کتابیں تیار کرنی ہوں گی۔ ایک ہی کتاب دونوں تم کے مقالات کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ۱۳۸۰ھ (مطابق ۱۹۶۰ء) میں میں نے "اسلامی ریاست" کے نام سے مولانا کے اہم مضمین کو مرتب کیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب ہوئی مقبول ہوئی۔ اہل علم نے اسے بہت پسند کیا اور یونیورسٹیوں میں اسے نصاب میں شامل کیا گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کتاب کئی پہلوؤں سے ہاصل تھی اور میرے اصل منصوبہ کے مطابق نہ تھی لیکن چونکہ اس وقت کام کرنے کی وہ سوالتیں موجود نہ تھیں جو کام کی تجویز کے لئے درکار تھیں اس لئے اس حالت میں کتاب کو طباعت کے لئے بھیج دیا گیا۔ اب الحمد للہ اوارہ معارف اسلامی میں مولانا محترم کی تمام تحریرات جمع کر لی گئی ہیں اور یہاں مولانا کی تمام نگارشات کو نئی ترتیب کے ساتھ لائے کا کام کیا جا رہا ہے۔ کافی مبنی ہے کہ عنت کے بعد ہم اپنی پہلی پیش سش

”اسلامی ریاست: قلمہ قام کار اور اصول حکمرانی“ پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں حتی الوضع مولانا مودودی صاحب کی ان تمام تحریرات کو ایک عالی ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا جو اسلامی ریاست سے متعلق ہیں۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن میں نظری مباحث اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے سلسلہ کی تحریرات گذشتہ تھیں، اب ان کو بھی الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں صرف نظری اور علمی مباحث ہیں۔ پاکستان کے سلسلہ کی تکاریفات کو انشاء اللہ الگ مرتب کیا جائے گا۔ اس کتاب میں ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں سے وہ مضامین بھی لے لئے گئے ہیں جو اب تک کتابی شکل میں نہیں آئے تھے۔ البته ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ پرانی تحریرات میں سے صرف ان حصوں کو شامل کیا جائے جو موضوع زیر نظر سے متعلق ہیں۔ زہیں وہ بحثیں جو دقیقی نوعیت کی تھیں یا جن کا تعلق مخصوص شخصیات اور ان کے اس وقت کے نظریات سے تھا، ان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے پیش نظر ان بحثوں اور اختلافات کو زندہ کرنا نہیں ہے، اس لئے وہ چیزیں اب غیر ضروری تھیں۔ البته ہم نے ان تمام حصوں کو محفوظ کر لیا ہے جن میں اصولی مباحث سنئے اور اس طرح وہ اپنی دائمی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے فائلوں کے علاوہ ہم نے تفسیم القرآن کو بھی بغور پڑھا ہے اور اس کے حواشی میں کی ہوئی علم سیاست کی تمام اہم بحثوں کو بھی نکال لیا ہے اور انہیں دو مستقل مقالات کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں مقالے اپنی موجودہ شکل میں پہلی مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں اور ان سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ تفسیم القرآن میں کتنی ٹھنڈی بحثیں آگئی ہیں جن کے منتشر ہونے کی وجہ سے ان سے بیک نظر استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مرتب نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مولانا کی تحریرات کو زیادہ سے زیادہ حسن ترتیب اور منطقی ردیل کے ساتھ پیش کرے۔ اسے اس سلسلہ میں

کچھ حذف و اضافہ ہے بھی کام لینا پڑا ہے۔ اس کے لئے مولانا کی تحریر میں ذرا ہی تبدیلی بھی ایک بڑا ہی مشکل اور شاق کام تھا۔ لیکن ایسے صفاتیں کو جو تقریباً پہنچ سال کے عرصہ میں خلاف نوعیت کی ضرورتوں کے پیش نظر لکھے گئے ہوں اور جن میں لکھتے وقت کسی کتابی ترتیب کو سامنے نہ رکھا گیا ہو، کتابی محل میں لائے وقت کچھ تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ حق تو یہ تھا کہ یہ کام مولانا محترم خود انجام دیتے لیکن ان کی مصروفیت نے انہیں اجازت نہ دی اور حالات تقاضا کر رہے تھے کہ یہ قسمی تحریرات مرتب محل میں اہل علم کے سامنے آ جائیں۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا پورا پورا احساس ہے اور شایدی میں یہ کام کبھی نہ کر پاتا اگر خود مولانا کی حوصلہ افزائی مہیز کا کام نہ کرتی۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ پر انعام اعتماد فرمایا اور یہ اہم خدمت میرے پردازی۔ میرے لئے اس کتاب کی تیاری ایک بہت بڑی سعادت کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مولانا نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی ہے اور اپنے مشوروں سے مجھے نوازتے رہے ہیں۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اس ذمہ داری کو کس حد تک ادا کر سکا ہوں۔ اگر میں اس میں کچھ بھی کامیاب رہا ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کام میں جو بھی کوتائی رہی ہے، اس کا بار میرے اوپر ہے۔ و ما توفیق الا باللہ۔

خورشید احمد

اوارہ معارف اسلامی، کراچی

۲۷ صفر ۱۴۸۶ھ

## حصہ اول

### اسلام کا فلسفہ سیاست

- دین و سیاست
- اسلام کا سیاسی نظریہ
- قرآن کا فلسفہ سیاست
- معنی خلافت
- اسلامی تصور قومیت

## باب اول

### دین و سیاست

- مذہب کا اسلامی تصور
- اسلامی ریاست کیوں؟
- اسلام اور اقتدار
- دین و سیاست کی تفرقہ کا باطل نظریہ اور ----  
قصہ یوسف علیہ السلام سے غلط استدلال
- تفرقہ دین و سیاست کا روایع اور اس کا جائزہ

اسلام کے سیاسی نظام کے معاملہ میں ہو سوال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا تصور مذہب کیا ہے اور وہ سیاست، اقتدار اور اجتماعی امور حیات کے بارے میں کیا نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ مذہب کے محدود تصور کی وجہ سے اس ہمارے میں بہت سی قلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور مذہبی اور سیاسی دونوں ہی ملتوں کے بہت سے لوگ اس ہمارے میں ٹھری انتشار میں جلتا ہیں۔ اس لئے ہم اسلام کے فلسفہ سیاست کے بارے میں سب سے پہلے اس بحث کو پیش کر رہے ہیں۔

دورِ جدید کی اسلامی ٹھری میں مولانا مودودی صاحب کا یہ مخصوص کارنامہ ہے کہ انہوں نے تفرق دین و سیاست پر ایک کاری ضرب لگائی ہے اور اسلام کے جامع اور انتہائی تصور کو آئینہ کی طرح صاف کر کے پیش کیا ہے۔ ہم اس باب کو مولانا موصوف کی مختلف تحریرات سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس میں مسلمان اور موجودہ سیاسی سکھش حصہ اول اور ترجمان القرآن کے فائدوں میں پائی جانے والی بہت سی بحثوں سے ضروری حصے لئے گئے ہیں۔ اور مرتب نے ان موتیوں کو ایک لڑی میں پروکر ذیر نظر مضمون کی شکل دی ہے۔

## دین و سیاست<sup>۱</sup>

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحث سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یادوں سے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیر کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سریعیت کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیتہ<sup>۲</sup> صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبد کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبد ان پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیر کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند نہ ہی رسموں کو اوایکر کے معبد کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابھائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبد سے ایک دوسری چیز، ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

<sup>۱</sup> یہ مضمون تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ جلد اول۔ باب ۱ سے ماخوذ ہے۔ (مصنف یہ ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لیٹڈ۔ لاہور۔) مرتب

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے حق انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیر ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت، ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن بیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر خواڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متصاد چیزوں کے سمجھا ہونے سے مرتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کمیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبائیت، مادی علاائق سے نفرت، لذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلق، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافس اور تحصیب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سمجھ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے بیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے، تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے، نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہے سکے، اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادات توں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بد اخلاقی سے تعمیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعالیٰ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے، کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

چچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی گھر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات

و دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر، جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے، جس طرح چنانچہ جلالا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبد کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیرہ تھا۔ اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیرہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی علما و ستم، ہر قسم کی معاشری بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدنی کیج را یہوں کے ساتھ یہ ضمیرہ غسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے صحی اور فرازی کا بھی ساتھ دیا۔ جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی، نیش کاری اور فجیہ گری کا بھی۔

(۱)

## ذہب کا اسلامی تصور

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ذہب کے اس جاہلی تصور کو مناکر ایک عقلی و نکری تصور پیش کریں اور صرف پیش نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھاویں۔ آپؐ نے بتایا کہ ذہب قطعاً "بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیر ہے۔ ایسی چیز کو دین و ذہب کے ہم سے موسم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جنس ہے بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوت محکم ہو۔ فہم و شور اور نکرو نظر ہو، سمجھ و نظر میں انتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہ کج سے بچائے، راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشنے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار بے۔

اسی ذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیر بننے کے لئے ہمیں آیا ہے، بلکہ اس کے آئے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیر زندگی قرار دیا جائے، یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آئے کا اصل مقصد انسان کو

اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شےبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترتیب ہی پر انسان کی فلاحت کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خالق کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی محیل و صیحہ کرتے ہیں۔ دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لئے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“ (آل عمران: ۱۹)

## مذہب اور تہذیب

اسلام ایک خاص طریق فکر (Attitude of Mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر (Outlook of Life) ہے۔ پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اسی طریق فکر اور اسی نظریہ زندگی سے متین ہوتا ہے۔ اس طریق فکر اور طرز عمل نے جو بیان حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریق فکر اور نظریہ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں۔ خود اس کے پہنچنے کے کیا حقوق ہیں۔ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا یعنی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا۔ بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو

دوسرے حق پر قوان کرے۔

پھر یہی طریق گلر اور نظریہ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ دوہائی منتها تھے نظر متعین کرتا ہے اور زندگی کی تمام سی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، اپنے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجح ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) تعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے، جو شے اس مرکزی مقصد تک چکنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور جو شے سرراہ ہوتی ہے، اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک، یہ معیار یکسان کار فرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، صنعتی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملاحظہ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف چانے والی سیدھی را پر ہائی رہے اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے، اہمیتی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، میشیت، سیاست، غرض ہر شعبہ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کی طرف چانے والے ہوں، اور وہ را ہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتیوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لئے مسخر کی جائیں، ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو نیز اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراك اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، ظہر کی حالت

میں اور مظلوبی کے دور میں "علوم و فنون" کے اکتساب میں، اور تہذیب و تہذن کے لیکن دین میں کتنے اصولوں کو ملاحظہ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو، میں تو ع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً و کرہاً "شوری طور پر یا غیر شوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی دیسائی مقصد ہے جیسا کہ یہ روانہ اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کا رزار تک، طرق عبادت سے لے کر ریڑیو اور ہوا کی جماز کے طرق استعمال تک، حسل و دفسو اور طمارت و استخاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، کتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثار فطرت کے اجتماعی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور گرد و عمل کے تمام شعبوں کو ایک الیک وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پروازوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

ذہب کی دنیا میں یہ ایک اخلاقی تصور تھا، اور جاہلیت کے خیر سے بننے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و حکم کے افہار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شرہ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس اخلاق انجیز تصور کے اور اس سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے ذہب کا جو غلط تصور دراثت میں ختم ہوتا چلا آ رہا ہے، اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مفبوط جمی ہوئی ہے۔ حکلی تغیرت اور علمی تحقیق کی

ہترین تربیت سے بھی اس کے بعد نہیں مکھتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک جمروں میں رہنے والے اگر نہ تربیت کے معنی گوشہ حوصلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں تو دین داری کو عبادت کے دائرے میں محدود خیل کریں تو جائے تجھ نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال" جاہل عوام اگر مذہب کو باجے، تعزیزے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حرمت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگار فور علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو ان غنی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

### ہماری سیاست میں جاہلی تصور مذہب کے اثرات

فہم و اوراک کے اس تصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یا نہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود نظر روش پر میل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تدنی کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و محنت کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھے ہی میں نہیں آتے۔ اور یہ ضمی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر غیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ۔ ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام اور پھر

ا۔ واضح رہے کہ مضمون تقسیم سے قبل لکھا گیا تھا لیکن قومیت سے پیدا ہونے والا یہ ذہن آج بھی عالم اسلام میں ہر جگہ موجود ہے۔ مرتب

بخاری، بیکلی، دکنی اور مدیا سی اسلام الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی طلاق کے لحاظ سے ایک الگ طریقہ مگر اختیار کر سکتا ہے۔ زندگی کا ایک جدا اگاثہ نظر اور نسب الحین قول کر سکتا ہے۔ ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نکاحوں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں اور ہر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام ایک "مزہی ضمیرہ" ہے جو دنیاوی زندگی کے ہر ڈنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، یعنی اعتمادات اور عبارات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام رہا چاہئے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لئے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک الگ نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفرقہ بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مغلاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہونا چاہئے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردوں میں جان ڈالنے کے لئے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل حجۃ ایمان بالله اور اعتقاد یوم آخر اور اجماع کتاب و سنت نہیں ہے؛ بلکہ عالمگیر کی تحریر اور قوانین طبعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عالمگیر مسخرہ و قوانین مطبوعہ کو استعمال کرنا ہے، تاکہ نتیجہ میں علو اور نعمکن

فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اس لئے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں، وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عمل کی خلیل میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق مگر اور زادی نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقتدر اور تہذیب و تدبین کے ارتقا کا راستہ اور بحکم فی الارض کا مرعایت چین کرتا ہے، سو وہ ان کی شہادت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمی، یا اطلاعی یا فاروقی یا خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں، ان کے نزدیک یہ سب یکسان "اسلامی" ذہن ہیں۔ کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور بحکم فی الارض، ان کی شہادت میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے۔ وہی "صالح" ہے۔ اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمود عی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور پالا دست ہے، وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ سچ کے مقابلہ میں بت پرست روی فرمائزواعی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ وہ جو مسلمانوں کے قوی حقوق کی حفاظت کے لئے اٹھا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے مذہب اور "پرسن لے" کی حفاظت کا اطمینان دلایا جائے، ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سیست ایک سرکاری زبان حلیم کر دیا جائے، اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو۔ صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتظامی اداروں اور سرکاری طاز متوں میں مناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ غالباً اسلامی مسائل میں کوئی تغیریہ اس وقت تک نہ ہو گا جب تک خود مسلمان نمائدوں کی غالب اکثریت اس کو قول نہ کرے تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں، مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں، اسی جانشی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے

خلاف ہر زمانہ میں نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کے کتنے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام ظلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے، جو بلکہ طبیہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا مکمل ہو، لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے، اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ ہم اس کو کافر نہیں کہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی مرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے ساتھ پنجے میں داخل جائے۔ تمہارا طریقہ مکروہی ہو، جو قرآن کا طریقہ مکر ہے۔۔۔ زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو، جو قرآن کی نظر ہے۔ تم اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق محسن کرو، جو قرآن نے اختیار کیا ہے تمہارا انفرادی و اجتماعی نسب المعنی وہی ہو، جو قرآن نے پیش کیا ہے۔۔۔ تم اپنے زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی ہا پر انتخاب کرو، جو قرآن اور طریقہ محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔ اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفیات کو قرآنی نفیات کے ساتھ مدد کر لیتے ہو، تو پھر زندگی کے معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستے سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المؤمنین کہتا ہے۔

### قرآنی ذہن

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن۔۔۔ کہ حقیقت میں ایک یہی چیز ہیں۔۔۔ جس نظریہ زندگی کے تحت چند افتکاوات پر امکان لاتا ہے۔ چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "نہ بھی شعائر" کے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے۔ تجھک آسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہنچنے کے سامان میں، لباس کی وضعیں

میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، محاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہروں میں، مادی وسائل اور قوانین طبعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں، بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطہ نظر ایک ہے، طریق مگر ایک ہے، نصب العین ایک ہے۔ ترک و اختیار کا معیار ایک ہے۔ اس لئے زندگی بمرکز نے کے طریقے، سی و جد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصول کے انداز میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرماکی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے، جو ہری اختلاف ہرگز نہیں ہے۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری ایک سیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی تم کا اختلاف قبول نہیں کرتی، آپ خواہ پاکستانی ہوں یا ترکی یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی ایک سیم اپنی اپنی اپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور اس ایک سیم کو رد کر دیا پڑے گا جو اپنی اپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "ذہنی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سی و عمل کا ہے، اور دوسرا مرحلہ نتائج کا۔ آپ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برٹیں گے۔ دوسرے مرحلے میں دیے یہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اسلام کا محدث آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرتا ہے، کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برٹیں ہاکر دوسرے مرحلے میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ لہس یہاں پوری دنیوی زندگی "ذہنی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور

سیاست و میثاث کے اصول و فروع تک ہرچز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط نہ ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ انسکیم کے بجائے کسی اور انسکیم کے مطابق مسلم کرنا چاہئے ہیں تو یہ جزوی ارتداو ہے، جو آخر کار ارتداو پر منتظر ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجویز کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں، مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجویز ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو، اس کا رادہ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ افتومنون ببعض الکتب و تکفرون ببعض اُن کامدات ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجویز کر کے دائرہ اسلام میں رہنے کا اعزام کیا ہمی تو آپ اس دائرہ میں زیادہ دست تک نہ رہ سکیں گے کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی بحذیب کرتا ہے۔

مختلف اس کے اگر آپ اس انسکیم کے مطابق اپنی سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو مسلم کرنا چاہئے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ پارٹیوں میں منضم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ایک ہی پارٹی۔۔۔ حزب اللہ۔۔۔ ان سب کاموں کے لیے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشکار،

اس کیا بات ہے کہ تم کتاب خدا کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کئے دیتے ہو۔ (البقرہ ۸۵)

رائی اور رعایت کے مفاد میں ناکام نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں، کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں، وہ اگر مجبوراً ناکام طبقات (Class War) کی آگ میں کوئی نہیں ہے، تو آپ کیوں ان کے بیچے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں علو اور ٹھکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نہروی علو اور ابراہیمی و موسوی طو میں امتیاز کریں۔ ایک ٹھکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ ٹھکن دونوں ہیں، اور دونوں تغیر عالم، استعمال اسہاب اور قوانین طبعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے والی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطہ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تفاصیل کو دیکھتے ہیں مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بعد۔۔۔ بعد المشرقین۔۔۔ ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا ٹھکن اس تغیر عالم، اور استعمال اسہاب کا نتیجہ ہے جس کی تھی میں زندگی کا حوالی نصب الحین کام کر رہا ہے۔ مخالف اس کے قرآن جس علو اور ٹھکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ بھی اگرچہ تغیر عالم اور استعمال اسہاب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تھی میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب الحین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ ایمان بالله اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح معلم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو معبوط کرنے کے لئے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے۔۔۔ وہی ”اوکان اسلام“ جن کو آپ ”مولوی کے غلط مذہب“ کی انجام قرار دیتے ہیں۔

(۲)

## اسلامی ریاست کیوں؟

ہم یہ بات واضح کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے، اگر وہ بھیثت مسلمان زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ کا نہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت میں دیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی تمام معاملات کا فیصلہ خدا کے قانون اور اس کی شریعت کے مطابق کریں۔ اسلام اس بات کو گوارا کرنے کے لئے قطب" تیار نہیں کہ آپ ایمان کا اعلان تو کریں اللہ رب العالمین پر اور زندگی کے معاملات ملے کریں غیر الہی قانون کے مطابق۔ یہ وہ سب سے بڑا عاقض ہے جس کا تصور کیا جاسکتا ہے اور اسلام اس کو گوارا کرنے کے لئے نہیں، اس عاقض کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اور اسلامی ریاست اور اسلامی دستور کے مطابقہ کی پشت پر دراصل یہی احساس کا فرمایا ہے کہ اگر مسلمان خدا کے قانون کی پیروی نہیں کرتا تو اس کا دعویٰ اسلام ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر پورا قرآن دلیل ہے۔

۱۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ ملک اسی کی ہے لہذا فطرہ امر کا حق (Right of Rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی ملک پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چنان بیادی طور پر ظلٹا ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس

کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت میں اس کے قانون شرعی کے مطابق عمرانی ہو اور فیصلے کیے جائیں۔

قُلْ اللَّهُمَّ ملِكُ الْمُلْكِ تُوْنِي الْمُلْكُ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِنْ تَشَاءُ  
(آل عمران: ۲۶)

کو اے اللہ، مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے  
جمیں لے۔

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر: ۱۳)

وہ ہے اللہ، تمہارا رب، ملک اسی کا ہے۔

لَمْ يَكُنْ لِهِ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (نی اسرائیل: ۱۱)  
پادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں (Partner) نہیں۔

فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَظِيمِ الْكَبِيرِ (المومن: ۱۲)

ہذا حکم اللہ بزرگ و برتر کے لیے خاص ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ لَهُدَا (الکھف: ۲۶)

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں ہتا۔

الْأَلْهَ الْخَلْقَ وَالْأَمْرُ (اعراف: ۵۳)

خود ار! علیق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

يَقُولُونَ هَلْ لِنَا مِنْ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ لَنِ الْأَمْرُ كَلِهِ لِلَّهِ (آل عمران: ۱۵۳)  
لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہ دو کہ امر سارا اللہ  
کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا  
ہے۔ کیونکہ انسان حقوق اور رعایت ہے، بندہ اور حکوم ہے، اور اس کا کام صرف  
اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہو۔ البتہ قانون الہی کی حدود  
کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقیہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے۔ جس

کی اجازت ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں رونج شریعت اور مزاج اسلام کو محوڑ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے۔ کیونکہ اپنے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بھائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق خوابد و احکام مقرر کرنے کا قانونی حق اہل ایمان کو دے دیا گیا ہے۔ لیکن جو بیادی پات سامنے رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے یا کسی دوسرے کے ہاتھے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ طاغوت و باғی اور خارج از اطاعت حق ہے، اور اس سے فیصلہ ہٹانے والا اور اس کے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے۔

**وَلَا تقولوا مَا تُصْنِفُ السُّنَّةُ كَذَبٌ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ (النحل: ١٦٢)**  
 اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو، ان کے متعلق جھوٹ مکروہ کریں نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال (Lawfull) ہے اور یہ حرام (Unlawfull) ہے۔

**اتَّبِعُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ رِبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أُولَيَاءَ (اعراف: ٣)**  
 جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی بیداری کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے تحریرائے ہوئے کارسازوں) کی بیداری نہ کرو۔

**وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا نَزَّلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدہ: ٣٣)**  
 اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو اپنے تمام لوگ کافر ہیں۔

**إِنَّمَا تُرِكَ الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ أَمْنَوْا بِمَا نَزَّلَ اللَّهُ وَمَا نَزَّلَ مِنْ قَبْلِكَ  
 يَرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكِمُوا إِلَيْكُمْ وَقَدْ أَمْرَوْا إِلَى تَكْفِرِ رَبِّهِ (النساء: ٦٠)**  
 اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس

ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انہیاء پر اتماری گئی ہے۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)

۳۔ خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے، جو اس قانون کی بنیاد پر قائم ہو، جو اس نے بخوبیوں کے ذریعہ سے بھیجا ہے، اسی کا نام خلافت ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِذَنْبِ اللَّهِ (النساء: ۶۲)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الہی کی بنیاد پر اس کی اطاعت کی جائے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا رَأَيْتَ اللَّهُ

(النساء: ۱۰۵)

اے نبی اہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وَإِنَّ حُكْمَ بَيْنِهِمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَبَعَ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذِرُوهُمْ إِنْ يَفْتَنُوكُمْ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ (المائدہ: ۳۹)

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتماری ہے اور ان کی خواہشات کی حیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کر وہ تمہیر (قدہ میں) جلا کر کے اس ہدایت کے کسی جز سے نہ پھر زیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔

أَفْحَكُمُ الْجَاهِلِيَّةَ يَبْغُونَ (المائدہ: ۵۰)

کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ إِذْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا فَلَا تَنْهَا  
عَنْهُ وَلَا تَنْهَا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (ص: ۲۶)

اسے داؤد! ہم نے تم کو ظیفہ مقرر کیا ہے۔ لذا تم حق کے ساتھ لوگوں  
کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش فس کی ہجدوی نہ کرو کہ اللہ کے  
راس سے وہ تم کو بھٹالے جائے گی۔

۳۔ اس کے بعد ہر دوہ حکومت اور ہر دوہ عدالت پا غیانہ ہے جو خداوند  
عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری  
بیانوں پر قائم ہو۔ بلاحال اس کے کر تسلیمات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی  
نو میتھی ہاہم کتنی ہی خلتف ہوں۔ ان کے تمام افعال بے اصل، بے وزن اور باطل  
ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ کے لیے مرے سے کوئی جائز بیانوں نہیں ہے۔ حقیقی  
مالک الملک نے جب انہیں سلطان (Charter) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں  
اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں خدا کے قانون کی رو  
سے سب کا سب کا عدم ہے۔ اہل ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) ان کے وجود کو  
بلور ایک خارجی واقعہ (Defacto) کے تسلیم کر سکتے ہیں مگر بلور ایک جائز وسیلہ  
انتظام و فصل قضاۓ (DeJure) کے تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی  
فرمازروں (اللہ) کے پا غیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا  
نہیں ہے اور جو ایسا کریں، ادعائے اسلام و ایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ

۱۔ چارڑی سلطان سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپ کو اس کا ظیفہ  
(نہ کہ خود عمار) تسلیم کرے، پیغمبر کو اس کا معتبر اور کتاب کو اس کی کتاب مانے اور  
شریعت الہی کے تحت رہ کر کام کرنا قبول کرے صرف ایسی ہی حکومت اور عدالت کو خداوند  
عالم کا چارڑ حاصل ہے یہ چارڑ خود قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ احکم یعنیہم بما انزل اللہ  
(لوگوں کے درمیان حکومت کرو اس قانون کے مطابق جو اس نے نازل کیا ہے)

سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح حکم کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت ایک گروہ کو  
ہائی بھی قرار دے اور پھر اپنی رعایا پر ان باغیوں کے اقتدار کو جائز بھی تسلیم کرے  
اور اپنی رعایا کو ان کا حکم ماننے کی اجازت دے دے۔

قُلْ هَلْ نَشْبُكُمْ بِالْأَخْرِينَ أَعْمَالًا٠ الَّذِينَ ضَلَّلُ سَعْيُهِمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يَصْنَعُونَ صُنْعًا٠ لَوْلَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ  
وَلَقَاءَهُ فَجُبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نَقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزَنًا

(الکھف: ۱۰۳ - ۱۰۵)

اے نبی! ان سے کوئی میں حصیں ہاؤ کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب  
سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ یہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری  
سی بھک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود، رضاۓ اللہ سے  
بہث کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی) اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں  
کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے  
احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی ملاقات (یعنی اس کے سامنے حاضر ہو  
کر حساب دینے) کا عقیدہ قول نہ کیا۔ اس لیے ان کے سب اعمال محبوط  
(کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

تَلَكَ عَدْ جَهْدُوا بِإِيمَانِ رَبِّهِمْ وَعَصْمَوا رَسُولَهُ وَاتَّبَعُوا الْأَمْرَ كُلَّ جَبَارٍ عَنْهُ  
(مور: ۵۹)

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کے  
رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار و شمن حق کے امر کا اتباع کیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى مَبْيَنًا وَسُلْطَانًا مُبِينًا٠ إِنَّ فَرْعَوْنَ وَمَلَائِكَةَ فَاتَّبَعُوا  
أَمْرَ فَرْعَوْنَ وَمَا أَمْرَ فَرْعَوْنَ بِرْ شَيْد (مور: ۹۶)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح روشن سلطان کے ساتھ فرعون  
اور اس کے اعیان ریاست کے پاس بھجا مگر ان لوگوں نے (ہمارے

فرستادہ شخص کے بجائے) فرعون کے امر کی ہیروی کی حالت کہ فرعون کا امر درست نہ تھا۔ (یعنی مالک الملک کے سلطان پر ٹھنی نہ تھا)

وَلَا تَطْعُمْ مِنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتْتَّبِعْ هُوَنَّهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فِرَطًا ۝

(الکہف: ۲۸)

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شور و ادراک سے کہ ہم اس کے رب ہیں) غافل کر دیا ہے، جس نے اپنی خواہش نفس کی ہیروی کی اور جس کا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَمَ رَبِّ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْأَثْمُ وَالْبَغْيُ بَغْيٌ  
الْحَقُّ وَإِنْ تَشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا (اعراف: ۳۳)

اسے یعنی کہہ دو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے جس کاموں کو خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو، اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکیت اور الوہیت میں) ان کو شریک کرو جن کے لئے اللہ نے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِهِ إِلَّا إِسْمَاءً سَمْتَمُوهَا إِنْتُمْ وَابْنُوكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا  
مِنْ سُلْطَانٍ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمْرٌ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيمَانٌ (یوسف: ۳۰)

تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو، وہ تو محض نام ہیں۔ جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

وَمَنْ يَشَاقِقُ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ  
نُولَهُ مَا تَوْلَىٰ وَنَصْلَهُ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ (النساء: ۱۱۵)

اور جو کوئی رسول سے جھکڑا کرے در آں ہائیکہ راہ راست اس کو دکھا

دی گئی اور ایمان داروں کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راہ چلتے گئے، اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جو صرده خود مزگیا اور اسے جسم میں جھوٹکیں گے اور وہ بست عی بر المکانا ہے۔

فَلَا وَرَبَّكَ لَا يَوْمَنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُونَ فِيمَا شَجَرُ بَيْنَهُمْ (التسامع: ۶۵)

لہن تیرے رب کی حکومت وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی! تجوہ کو اپنے ہاہی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا اللہ تسلیم کریں۔

وَإِذَا قَلِيلٌ لَهُمْ تَعَالَوْا إِنَّمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَالَّذِي الرَّسُولُ رَأَيَتُ الْمُتَفَقِّينَ  
يَصْدُونَ عَنْكَ صَدْوَنَا ○ (التسامع: ۶۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ تجوہ سے چڑک رہے ہیں۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكُفَّارِنَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ○ (التسامع: ۱۳۱)

”اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے پاغیوں) کے لئے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رسمی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی قصاصہ نہیں ہے اور کسی وہ مفرکی حقیدہ ہے جس پر اسلام کے نظام گفر، نظام اخلاق اور نظام قانون کی بہیاد رکھی گئی ہے اور مسلمان اپنے ایمان کے قاضیے پورے نہیں کر سکتے جب تک وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم نہ کر لیں۔ خدا کے قانون کی بالادستی قائم کیے بغیر بیشیت مسلمان زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس لئے ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے کہ خلافت الہی کا نظام قائم ہو اور زندگی کے تمام معاملات خدا کے قانون کے مطابق ہٹے ہوں۔ انہیاء کرام علیم السلام اس مقصد کے لئے مبouth کیے گئے کہ خدا کی حاکیت کا نظام قائم کریں۔ اس لئے دیکھیجیے کہ بھرت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ دعا منگوائی جاتی ہے۔<sup>۱</sup>

وَقُلْ رَبِّ الْخَلْقِ مَدْخُلٌ صَدْقٌ وَّلِغْرِجَنٌ مُخْرُجٌ صَدْقٌ وَّلِجْعَلٌ لِّسِّعْنَ

لِدَنْكٌ سُلْطَانًا نَصِيرًا ○ (بَنِي اَسْرَائِيلُ: ٨٠)

اور دعا کر کے پروردگار بھی کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مردگار بناوے۔

یعنی یا تو مجھے خود افزار مٹا کر یا کسی حکومت کو میرا مردگار بناوے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بazaar کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سلاپ کو روک سکوں، اور جسمے قانون مدن کو جاری کر سکوں۔ یہی تحریر ہے اس آئیت کی جو حسن بھری اور قیادۃ نے کی ہے، اور اس کو این جریئہ اور این کثیر تجھے جلیل القدر مشریق نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ ان اللہ لیز ع بالسلطان مالا يزع بالقرآن۔ یعنی اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے، وہ صرف وعظ و تذکیرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے بھی کو خود سکھائی ہے، تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اکامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لئے حکومت چاہتا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے، اور وہ لوگ ظلمی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی نا دنیا ظلمی سے تحریر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لئے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لئے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی کا میں تقاضا ہے۔

(۳)

## اسلام اور اقتدار

اوپر کی بحث سے اسلامی رہاست کی ضرورت واضح ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ خلف و جوہ سے دین و سیاست کی تفرقی کے شیطانی غلفہ نے خود مسلمانوں کے ذہن و مکار کو بھی مٹاڑ کیا ہے اور وہ مطرح کی تاویلیں کر کے اس تفرقی کے لئے منجاہش پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لئے اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام کس قسم کا انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اور اس پارے میں جو قحط تاویلات کی جاری ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔

”تَعْصِيمُ الْقُرْآن“<sup>۱</sup> میں آئت وَقَاتِلُوهُمْ حَشْ لَا تَكُونُ فِتْنَةً وَيَكُونُ الدِّينُ لِلَّهِ  
فَلَمْ يَنْتَهُوا فَلَا عِدْوَنَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ<sup>۲</sup> کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ ”باز آ جائے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں بلکہ فتنہ سے ہا扎 آ جانا ہے۔ کافر، شرک، دہریہ، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا ہو عقیدہ رکھتا ہے اور جس کی چاہے حبادث کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے

<sup>۱</sup> یہ مضمون ترجمان القرآن میں سجنان تا شوال ۱۴۳۷ھ مطابق سبتمبر تا نومبر ۱۹۱۶ء شائع ہوا تھا۔ مرتب۔

<sup>۲</sup> آئت کا الفعلی ترجمہ یہ ہے۔ ”اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ قند ہاتی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو دست درازی جائز نہیں ہے مگر خالموں“<sup>۳</sup> البقرہ ۱۹۳۔

لے ہم اسے فہمائش اور تصحیح تو کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ ہنا چاہئے۔ یہ فتنہ بزور شیخ زادیا جائے گا اور مومن کی تکویر اس وقت تک نام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی روشن سے باز نہ آ جائیں۔“ اس تفسیر کے خط کشیدہ فقرے پر ناصر بن ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب علم بزرگ نے حسب ذیل اعتراض کیا:

(الف) اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام جو امن اور سلامتی کا حامل اور مودہ ہے، دوسروں کے مذہب میں مداخلت اور اس بنا پر لا ای روا رکھتا ہے، حالانکہ یہ امر لا اکراه فی الدین<sup>۱</sup> کے مخالف ہے۔

(ب) بحالیں کو اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنے کی آزادی لكم دینکم ولی دین سے بھی ظاہر ہے۔ جو کوئی اپنے عقائد میں آزاد ہو گا اسے ان کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی آزادی ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ اپنی عقائد کو برحق سمجھتا ہے۔ قرآنی مفہوم سے اسی آزادی کا پتہ چلا ہے اور باہمی مناقبات کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً لا تجادلوا اہل الکتب الا بالقى هن احسن<sup>۲</sup>۔ غیر خداہب کے عبادت خالی اور طریق عبادت اسلامی مداخلت سے محفوظ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں اہل کتاب کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی ملازمت اقتیار کی جس کا عقیدہ اور عمل مشرکانہ تھا۔ ہاں اپنے طور پر امن کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے جیسا کہ یا صاحبی السجن ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار<sup>۳</sup> سے ظاہر ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے خیالات کی اشاعت کا حق پہنچا ہے۔

(ج) زیر خط جبارت کو نظر رکھتے ہوئے مسلمان کمیں بھی چلوٹ آبادی میں امن سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ فیر مسلم تمدنی اور معاشرتی امور میں بھی کیوں ان کے ساتھ تعاون باہمی اور رواداری سے کام لیں۔ جب کہ ان کا سیاسی اور اسلامی عقیدہ ہی سدراہ ہو؟ ایسے مسلمان اگر ترکی اور اپر ان میں بھی آباد ہوں تو بقول آپ کے وہاں بھی انھیں علم جہاد بلند کرنا ہو گا کیونکہ ان ممالک میں حدود اور قوانین اسلامی نافذ نہیں۔ اس زمانہ میں عالمگیر سیاست اس نجح پر مدون ہے کہ کوئی جماعت غیر معروف طریقوں سے فیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل باہمی سے کام نہیں لے سکتی، کیونکہ آپ کا فرمودہ استدلال کسی اشتراک عمل کے لئے مانع ہو گا۔ اگر اسلامی جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتی ہے تو اسے غیر مسلموں کو بھی، خصوصاً جب کہ وہ حکمران ہوں، وہی حق دینا ہو گا۔ ہرچہ برخود نہ پسندی برداشتگار ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اہل کتاب کے ساتھ جو تعامل باہمی کے معابرے کیے تھے کیا وہ معابرے الی ہی شرائط پر مبنی تھے؟ کمی زندگی کے ابتدائی مرافق آپ کے استدلال کے موید نہیں۔ بالفاظ دیگر الی ہی جماعت کا وجود ہی کسی غیر مسلم حکومت کے لئے کھلا جیلیخ ہے کہ جو نہی اسے قوت ملی وہ اس کے قوانین اور اس کے نظام حکومت کو مٹانے کے لئے تکوار ہاتھ میں لے لے گی۔ کون اس کو برداشت کرے گا؟

اس اعتراض کا مختصر جواب تو چند جملوں میں بھی دیا جاسکتا ہے، لیکن درحقیقت یہ اعتراض اپنی پشت پر غلط فہمیوں کا ایک بڑا انبار رکھتا ہے، اور وہ غلط فہمیاں امت میں بڑی کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں، حتیٰ کہ ان کی وجہ سے مسلمان بالعموم اپنے دین کے بنیادی قاضوں تک کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں، اس لئے یہاں ذرا اس پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔

## اسلام کا مشن -

یہ بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی کہ اسلام امن اور سلامتی کا مودود کس معنی میں ہے اور لا اکرام فی الدین<sup>۱</sup> اور لکم دینکم ولی دین<sup>۲</sup> کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبوت کرنے آئے تھے یا عاش روزگار میں لٹکے تھے۔ ان سب پاؤں سے پہلے اس سوال کا تفصیل ہونا چاہیے کہ فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا؟ کیا وہ جباروں کی سواری کے لئے انسانوں کو سرحدانے آیا ہے تاکہ جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اشے تو اسلام کے پیروؤں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا بھر کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لئے پر امن رعیت فراہم کرنے کا اجرہ لیا ہے کہ ہر حکومت کو، خواہ اس کا نظام کسی نوعیت کا ہو، اپنی مشینری چلانے کے لئے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ذہلے ذہلائے پر زے حاصل ہو جایا کریں؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اصول اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی پچ اور اتنی نزی پیدا کر دے کہ وہ ہر نظام تہذن میں، خواہ وہ کسی قسم کا تہذن ہو، با آسانی کھپ سکیں؟ اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام "بودھ مذہب اور سینت پال کی ہنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور اس کے بعد یہ سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے کہ اپنے مذہب کی کتاب میں قاتلوں میں جیسا خوف ناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں؟ اسے تو اپنے پیروؤں کو جنگ اور جہاد کا حکم دینے کے بجائے اپنے مخالفین سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ:

"ہم فریجوں کو آخر کیوں مارتے ہو؟ ہم نہ نظام حکومت میں کوئی انقلاب کرنا چاہیں نہ نظام تہذن میں کسی ترمیم و تنفس کی دعوت دیں۔ اقتدار کسی

کا بھی ہو، اس کے ماتحت پر امن پا شدروں کی حیثیت سے زہنا ہمارا مسلک اور حکومت وقت کی وفاداری ہمارا دین و امانت، پھر ہم سے تمیس پر خاش کی کیا وجہ؟ رہا ہمارا نہ ہی عقیدہ اور ہمارا پوجا پاٹ کا نظام تو اس سے تمہارا کیا گزٹا ہے؟ تمہارا کون سا تمدنی ادارہ اور کون سامنہ مفاد ایسا ہے جس پر ہمارے عقیدے یا ہماری چوجا کی ضرب پڑتی ہو؟“

یہ جواب اگر اجھے محتول ہی رایہ میں دیا جاتا اور علما نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو وفادارانہ خدمات بھی انجام دیتے رہتے تو مشرکین مکہ ہمارے انگریز آقاوں<sup>۱</sup> کے مقابلہ میں کچھ اپیسے زیادہ نامحتول نہ تھے کہ مسجدوں میں اذان و نماز کی آزاوی اور تبلیغی اجتماعوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن اگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظام زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرز عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں، اور اگر اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے، اور اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا اپنا نظام ہی برحق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے، تو ان پاؤں کے ساتھ یہ قطعی ناگزیر ہے کہ اسلام زمین میں اپنے نظام کو غالب اور دوسرے نظامات کو مغلوب کرنے کا بھی تھاضا کرے۔ ایک نظام زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عالم اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسرا ایک مصلحتی بات ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مصلحتی بات یہ ہے کہ دوسرے نظامات کو باطل بھی کہا جائے اور پھر ان کے غلبے کو برداشت بھی کیا جائے۔ مزید برآں یہ بات بدلہتہ“ محال ہے کہ ایک نظام زندگی کی پیروی کسی دوسرے نظام زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جاسکے۔ اس لیے وہ صرف ایک فاطر المعقّل ہی ہو۔

سلکا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی بیرونی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظمات کے اندر پر امن و فادارانہ زندگی بس کرنے کی تعلیم بھی دے۔

پس اسلام کا اپنے مخصوص نظام زندگی کی طرف دعوت رینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظمات کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے اور اس مقصد کے لئے اپنے بیرونی کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے اور مدعاں اتباع کے ایمان و عدم ایمان کا نشان اقتیاز اسی سوال کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظمات کے ماتحت جینے پر راضی ہوتے ہیں؟ قرآن اور حدیث دونوں کو انھا کر دیکھ لجئے۔ آپ کو صاف نظر ہ جائے گا۔۔۔ بشرطیکہ دل میں کوئی چور نہ ہو۔۔۔ کہ اسلام کا اصل موقف یہی ہے نہ کہ وہ جو آپ بیان فرمائے ہیں۔

پھر جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لئے کھلا جنینج ہونا ہی چاہئے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے، غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل ہو سکے یا نہ ہو سکے، بہر حال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانون شرعی نافذ نہیں ہے، وہاں ہم اس کے نفاذ کے لئے جدوجہد کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ ہماری اس جدوجہد کو برداشت بھی کریں۔ اور غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل بھی ہمارے لئے کوئی الیکی چیز نہیں ہے کہ جس نظام زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لئے چھوڑ دیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل اس صورت میں نہ ہو سکے گا۔ اسلام بے شک امن اور سلامتی کا حامی اور موید ہے، مگر اس کی نگاہ میں حقیقی امن اور سلامتی وہی ہے جو حدود اللہ

کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظمات کے زیرِ سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکیر تک نہ پہونچئے، اس نے اسلام کا نقطہ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور الہی سلامتی کا ہرگز حامی اور موید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں وہ انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا لا اکراه فی الدین تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منوتاً کیونکہ یہ بزور منوانے کی وجہ نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی، جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے، زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ ایمان صحیح کے بغیر یہ عبادت محض بے معنی ہے۔ ان دونوں امور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لئے تیار ہے لیکن وہ اس پلت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ قوانین تحریک، جن پر ایشیت کا نظام قائم ہوتا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں، اور خدا کی زمین پر اس کے باقی اس کو نافذ کریں اور مسلمان ان کے تابع ہو کر رہیں۔ اس معاملہ میں بہر حال ایک فرقہ کو دونسرے فرقہ کے "ذہب" میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی۔ اگر مسلمان "ذہب کفر" میں مداخلت نہ کریں گے تو کافر "ذہب" اسلام میں مداخلت کر کے رہیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کی زندگی کے بہت بڑے حصے پر ذہب کفر جاری ہو گا۔ لہذا بجائے اس کے کہ یہ مداخلت کفار کی طرف سے ہو، اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان آگے بڑھ کر نظام زندگی پر قبضہ کریں اور پھر جہاں تک ذہبی عقائد اور عبادات کا تعلق ہے، غیر مسلموں کے ساتھ لا اکراه فی الدین کے اصول پر عمل کریں۔

رواداری کا غلط تصور اور اس کا جائزہ

اب ہم ان دلائل پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جن کا سارا جناب معرض نے

لیا ہے اور جن پر اس طرز خیال کے لوگ بالعموم احتلو کیا کرتے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جب تم "فتنہ" سے مراد کفر کا غلبہ اور کفار کی بالادستی لیتے ہو، اور جہاد و قیال کی علیت یہ قرار دیتے ہو کہ تمہاری اس تغیر کے مطابق جس چیز کا نام "فتنہ" ہے وہ مست جائے اور اس کی جگہ "اللہ کا دین" "قائم" ہو، تو اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام دو بالکل متفاہ میں اختیار کر رہا ہے۔ ایک طرف کتنا ہے لا اکراه فی الدین دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسری طرف غیر مسلموں کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے کہ وہ اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق حکومت کا نظام چلا سیں، اور ان کے قوانین کا اجزا موقوف کر کے زبردستی ان پر "اللہ کے دین" کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف لكم دینکم ولی دین کہہ کر غیر مذاہب کے بیرونیں کو اپنے مذہب و عقائد پر قائم رہنے کی آزادی دیتا ہے۔ دوسری طرف ان سے ٹھیک اسی بات پر لا ایک چھیڑتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے اصولوں کے مطابق معاملات دنیا کا انتظام کیوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام ہرگز اس تضاد کا حامل نہیں ہو سکا۔ لہذا تمہاری تغیر صحیح نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر غیر اسلامی حکومت کا نفس وجود اسلام کی نگاہ میں قند ہوتا اور اس کو مٹانے پر مسلمان مامور ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی غیر اسلامی حکومت میں وزارت کا عمدہ طلب کرتے اور اپنی وزارت کے دور میں مصر کے شلنگی قوانین کے پابند رہ کر کام کرتے جیسا کہ آئت ماکان لیا لخدا خاہ فی دین العلک<sup>۱</sup> سے ظاہر ہے۔

تیسرا دلیل یہ ہے کہ اگر تمہاری اس تغیر کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بھی مانا ڈے گا کہ اسلام دنیا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جگہ چھیڑتا ہے اور اپنے

بیرون پر جارحانہ بھگ کا ایک ایسا فرض عائد کرتا ہے جس کی وجہ سے مسلمان دنیا میں کسی امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس تفسیر کی رو سے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تمام فیر مسلم حکومتوں کے خلاف بلکہ ان مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی علم جہاد بلند کریں جن میں اسلامی حدود و قوانین نافذ نہیں ہیں۔ اور جب یہ ہمارا نظریہ اور یہ ہمارا وینی فرض ہو تو کسی طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم ہم کو اپنا پر امن ہمسایہ سمجھ کر باطمیباں ہمارے ساتھ معاملت کر سکیں اور غیر مسلم حکومتوں اپنے حدود عمل میں ہمارے وجود کو برداشت کر سکیں۔

(۱) ان دلائل میں سے پہلی دلیل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کسی شخص کا بجائے خود ایک عقیدے کو مانتا اور اپنی زندگی میں ایک خاص طریقہ کی بیداری کرنا اور چیز ہے، اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کے لئے ایک نظام بنانا اور اس نظام کو بیزور ایک ملک کے پاشندوں پر جاری کر دینا۔ بالکل ایک دوسری چیز۔ معتبر نہیں ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھتے ہیں اور ان کے فرق کو نظر انداز کر کے لا اکراه فی الدین اور لكم دینکم ولی دین وغیرہ آیات کو ان کے مجموعہ پر چھپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان آیات کا تعلق صرف امر اول سے ہے۔ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلامی عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کرنے لے لیں ہم اس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق، تعلیم، تربن، معاشرت، میہشت، قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی امور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بھر ہم پر مسلط کر دے۔ دوسروں کو ان کے ملک پر چلنے والے بھگ رواداری ہے۔

ایسا واضح رہے کہ حکومت دراصل جزو اکراہ (Coercion) ہی کا دوسرا نام ہے۔ جو نظریات، اصول اور قوانین کسی حکومت کی اساس قرار پائیں گے وہ ظاہر ہے کہ ان سب لوگوں پر بزوری نافذ کیے جائیں گے جو اس حکومت کے دائرے میں رہتے ہوں۔

مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے ملک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے ملک کا تسلط برداشت کر لیں۔ ملک کی حکومت جس قلفہ زندگی پر مبنی ہو گی، لا حالہ تمام قوانین اور پوری انتظامی پالیسی اور سارا کار و پار میں اسی قلفے کے نظریات پر چلے گا اور ایسی حکومت کے تحت رہے ہوئے یہ کسی طرح ممکن ہی نہ ہو گا کہ ہم اپنی زندگی کا نظام اپنے مذہب و ملک کے اصولوں پر چلا سکیں۔ ہم خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں، بہر حال مذہب مخالف کے چیزوں اپنے سیاسی غلبے کی بدولت اپنے نظریات کو زبردستی ہماری پوری زندگی میں نافذ کر کے چھوڑ دیں گے۔ اس معاملہ میں رواداری برتنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکومت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے خود ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہمارے گوارا کریں۔ اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقیٰ تک سود کے غبار سے نہ فجع سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک کھلا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس کی قیمت میں سے سود کا ایک حصہ بالواسطہ نیکسون کی شکل میں ہماری جیب سے نہ لکھل جائے۔ اگر وہ دہریت و الحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا نظام اُنہی نظریات اور اسی ذہنیت اور اسی ملحدانہ اخلاق پر تعیر ہو جائے اور پاشندگان ملک کے لئے ترقی و خوش حالی کے تمام دروازے اس ایک جسم کے دروازے کے سوابن ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے۔ اگر وہ خدا کے قوانین کو منسوخ کر کے خود قوانین بنائیں اور ملک کا نظام تمدن اپنے خود ساختہ قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہی۔ کوئی ہمیں بتائے کہ آخر

یہ رواداری کی کون سی قسم ہے؟ لا اکراہ فی الدین کا یہ مطلب آخر کس عمل کی رو سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو، اسے ہم برداشت کر لیں؟

### ریاست کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے قائم کرنے کے لئے بہر حال ایک قوت قاہرہ (Coercive Power) کی ضرورت ہے جسے "امیٹ" یا ریاست کہتے ہیں۔۔۔ اس ضرورت کا انکار اس کی پر اعتماد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ یا پھر اشتراکی تصور میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیات اجتماعی ریاست کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی۔۔۔ لیکن یہ صرف عالم خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی ہتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوت قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے۔۔۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت، جو اپنے قبودلیہ

ا۔ صرف کا اشارہ اشتراکیت کے اس آخری مرحلہ (Stage) کی طرف ہے جس کے بارع میں اشتراکی مفکرین خصوصیت سے اسنجیلا اور لینن نے یہ کام تھا کہ اس میں ریاست کا نظام جرم و عموم ہو جائے گا اور ایک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہو جائے گا جو اجتماعی تعاون پر مبنی ہو گا اور اس میں ریاست کا کوئی وجود نہ ہو گا۔ لینن لکھتا ہے:

"صرف اشتراکیت ہی ریاست کو قطعاً" غیر ضروری بنا رہی ہے، اس لئے کہ اس میں کوئی ایسا طبقہ باقی نہیں رہتا جسے دبایا جائے اور اس کا استعمال کیا جائے۔"

(Lenin The State and Revolution N.Y. 1935 P.75)

اس عمل کو اشتراکیت کی اصلاحیں میں ریاست کا مر جما کر جھوڑ جانا کہتے ہیں۔

سے نظامِ تمدن کو قائم رکھتی ہے، بجائے خود کسی نہ کسی نظریے اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک نبی قابل ہوتی ہے۔ اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لئے ایک لاکھ عمل بناتی ہے۔ اسی لاکھ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے۔ اور تمدنی ملک کے بننے اور بگڑنے میں اس قدر کی نوعیت اور اس لاکھ عمل کی اصولی و تفصیلی صورت کا پروادھل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں، انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً و کرھاً اس سانچے میں داخل کری رہتی ہے جسے ایٹھ اپنے قزوں تلاط سے بنا دتا ہے۔ جو لوگ کسی ریاست کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بینادی نظریے اور اس کے تفصیلی لاکھ عمل پر امہمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس پر راضی نہ ہوں، لیکن انہیں چاروں چار اپنے عقیدہ مسلک کے ۹۰ فیصدی حصہ سے دست بردار ہو کر ریاست کے عقیدہ و مسلک پر چلنا پڑتا ہے اور باقی ۱۰ فیصدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ملی ہی ہوتی جاتی ہے۔

ریاست کی اس نوعیت کو ملاحظہ رکھنے اور یہ سمجھے لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لئے ریاست بہر حال ہے ناگزیر، ایک صاحب نظر و نظر آدمی کے لئے اس حقیقت کا اور اس کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گردہ آج کل کے محدود معنوں میں محس ایک "نہہب" کا معتقد ہے، بلکہ ایک ہر کیر نظام زندگی، یعنی "دین" پر اعتقاد رکھتا ہو، وہ اگر اپنے اعتقاد میں چاہے اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوت قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کی صورت گری کرتی ہے اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گردہ مجبور ہو گا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فیصدی امور میں اپنے "دین" کے بجائے ان کے "دین" پر چلے۔ متدن زندگی میں یہ "اکراہ" لامحالہ ہم میں سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں

گے۔ لہذا بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اگراہ کریں اور ہمیں جنم کی طرف محیث کر لے جائیں، یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم ان پر اگراہ کریں اور انہیں اس تمام کے قریب لاکھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو با آسانی جنت کا راستہ مل سکا ہے۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے۔ اس کی زمین پر رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اس کو پہنچتا ہے جو اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانون فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ خالم ہے۔ غاصب ہے، باغی ہے۔ اس کی یہ نافرمانی صرف خلاف حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہل زمین کے لیے فتنے کی موجب بھی ہے۔ لہذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کے قانون فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں، ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حرم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے، بلکہ ان کو ان کے کفر، شرک، دہریت اور الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگان خدا کے لیے قند و فساد کی موجب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانون شرعی کو منسوخ کر کے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا لفظ و نسب چلاں گیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانون شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دین حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو، لیکن غلبہ کفر و کفار کے فتنے کو پوری طاقت سے مٹانے کی کوشش کرو یہاں تک کہ زمین کا انتظام عملاً میرے ”دین“ پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ ”اکابر“ نہیں بلکہ

”اصغر“ بن کر رہیں۔ حُنْ يَعْطُوا الْجِزِيَّةَ عَنْ يَدِهِمْ صَاغِرُونَ۔

## حضرت یوسف علیہ السلام اور اقتدار حکومت

۲۔ ان حقائق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دوسری دلیل کا زور آپ سے

ا۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ سورۃ توبہ۔ آیت ۲۹۔ مصنف محترم اس آیت کی تشریح میں تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

”یعنی لوائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیروں بن جائیں، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود بخاری و بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کرنے رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات صحیح دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت، تابع اور مطیع بن کر رہیں۔“

جزیہ بدل ہے اس ایمان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی، نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بخے پر راضی ہیں۔ ”ہاتھ سے جزیہ دینے“ کا مفہوم سیدھی طرح میعادنہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں، بلکہ وہ اہل ایمان ہوں جو خلافت الہی کا فرض انجام دے رہے ہوں ..... جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط را ہوں پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی آزادی کے ستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انہیں اس کا قطعاً ”کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلاجیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہو گی، فساد رو نہ ہو گا اور اہل ایمان کا فرض ہو گا کہ انہیں اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔“ تفسیر القرآن۔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۸۔

آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فی الواقع خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے تو یقیناً ان کی زندگی کا مشن اس ایک مشن کے سوا کچھ اور نہ ہو سکتا تھا جو ہر رسول برحق کا مشن رہا ہے، یعنی خدا کے دین کو ہر دوسرے دین پر غالب کر دین۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے تمام پیغمبروں کی سیرتوں کے مختلف واقعات کی تعبیر و تفسیر میں ہم کو ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر بخوبی رکھنا ہو گا۔ ورنہ اگر ہم یہ مان لیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی حکومت میں ملک مصر پر خدا کے دین کی جگہ بادشاہ کا دین نافذ کرتے تھے تب تو پھر یوسف صدیق اور سر سکندر و فضل الحق میں کوئی اصولی فرق باتی نہیں رہتا۔ افسوس ہے کہ اس معاملے میں لوگ حقیقت سے بہت دور چلے گئے۔ انہوں نے دراصل قصہ یوسف علیہ السلام کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے بادشاہ سے جو کہا تھا کہ اجعلنى على خزانة الأرض<sup>۱</sup> تو یہ ان کی طرف سے محض ملازمتی کی ایک درخواست تھی جو دربار شاہی میں قول ہو گئی اور ان کو وہ منصب مل گیا جو اکبر کے ہاں نڈو مرل کا منصب تھا۔ حالانکہ وہاں صورت حال کچھ اور ہی تھی۔

سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے ابتداء دین حق کی اقامت کے لئے وہی راستہ اختیار فرمایا تھا جو انہیاء علیمِ السلام اختیار فرماتے رہے ہیں، یعنی پہلے دعوت عام، پھر جو لوگ اس دعوت کو قول کریں ان کی تربیت و تنظیم، پھر انہیں ساتھ لے کر اقامت دین کے لئے مجاہدہ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس دعوت کا سلسلہ جیل یی میں شروع کر دیا تھا جس کے مواضع میں سے ایک بے نظیر و عظیم سورہ یوسف کے

اب مضمون لکھتے وقت یہ حضرات بنجاح اور بنگال کے وزیرِ اعظم تھے۔ اب ان کی جگہ کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان وزیر کو فرض کیا جا سکتا ہے۔

<sup>۱</sup> "ملک کے خزانے (تمام ذرائع وسائل) میرے پرد کچھے۔" سورہ یوسف۔ آیت ۵۵۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم صفحہ ۳۱۳۔ ۳۱۱۔ مرتب

پانچیں رکوع میں لعل کیا گیا ہے۔ لیکن آگے ہل کر ان کے سامنے پاکیک ایک ایسا موقع آگیا جس سے وہ اپنے مقصود تک حضور راستے سے بچنے سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر کی بیوی اور اس کی سیلیوں کے معاشرے میں جس پاکیزہ اور مفہوم طیرت کا اظہار ان سے ہوا تھا، اور پھر تغیر خواب کے معاشرے میں جس بصیرت کا ثبوت انہوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے بادشاہ مصر ان کا اس حد تک معتقد ہو چکا تھا کہ اگر وہ اس وقت حکمرانی کے کامل اختیارات اس سے طلب کریں تو وہ بلا تامل پیش کر دے گا۔ اس لئے انہوں نے تحریک عمومی کی راہ سے اپنا مشن پورا کرنے کے بعد اقدار حکومت پر فوراً قبضہ کر کے دین حق قائم کر دینے کو زیادہ قریب کا راستہ پایا اور بادشاہ سے مطابہ کر دیا کہ اجعافن علی خزانۃ الارض "زمین مصر کے تمام وسائل و ذرائع میرے اختیار میں دے۔" یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبه نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اختیار کلی کا مطالبه تھا اور اس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولیٰ کو حاصل ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اٹلی کا بادشاہ مسولیٰ کا مستقر نہیں بلکہ محض اس کی پارٹی کے اثر سے مجبور ہے، اور مصر میں بادشاہ خود حضرت یوسف "کامرید ہو چکا تھا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے اقدار کی شادوت اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے کہ *كَذَّ الْكَّمَنَا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّا مِنْهَا حِيثُ يَشَاءُ*<sup>۱</sup> "اس طرح ہم نے یوسف کو اس سر زمین میں اقدار بخشا۔ وہ اس کے جس حصے کو چاہتا، اپنی جگہ بنا سکتا تھا۔" یعنی پورا ملک اس کے قابو میں تھا۔

۱۔ مفہوم لکھتے وقت مسولیٰ زندہ تھا اور اٹلی کا اخخار مطلق ہنا ہوا تھا۔

۲۔ بلکہ مشور مفرماں مجاہد توکتے ہیں کہ وہ آپ کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کر چکا تھا۔ (ابن جریر)

پھر اس کی مندرجہ شہادت ہمیں سورہ مائدہ میں ملتی ہے جہاں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں: يَا تَوْمَ اذْكُر وَ انْعِمْهُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ اذْجَعْلُ فِيهِكُمْ لَنْبِيَّاً وَ جَعْلُكُمْ مَلُوْكًا وَ اتَّكِمْ مَا لَمْ يُوتْ احْدًا مِنْ الْعُلَمَاءِ۔<sup>۱</sup> ”اے میری قوم کے لوگوں یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا کہ تم میں انہیاء پیدا کیے تھے، تم کو حکران قوم بنایا تھا اور تمیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا۔“ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا، اس کی وجہ سے وہاں آخر کار مکمل انقلاب رونما ہوا، فراعن کے بجائے بنی اسرائیل حکران ہوئے اور ان کو وہ عروج نصیب ہوا جو ان کی ہمسر قوموں میں کسی کو حاصل نہ تھا۔

پھر جو نہ ہی اثر حضرت یوسف<sup>ؐ</sup> نے مصر میں چھوڑا اس کی شہادت ہم کو سورہ مومن میں ملتی ہے۔ وہاں حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے ہم صズ فرعون کو خطاب کر کے قبليٰ قوم کا ایک صاحب ایمان شخص کہتا ہے: وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ بَالْبَيْتِ فَمَا زَلَّتِمْ فِي شَكٍ مَا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هُلِكَ قَلْتُمْ لَنِ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ رَسُولِهِ۔<sup>۲</sup> ”تمہارے پاس یوسف<sup>ؐ</sup> روشن نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر پہلے تو تم اس جیز کی طرف سے شک میں رہے جسے وہ لائے تھے اور جب وہ انتقال فرمائے تو تم نے کہا کہ اب اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا۔“ یعنی تم نے کہا کہ اس پائے کا شخص اب نہیں آسکا۔

حضرت یوسف<sup>ؐ</sup> کے محاٹے میں یہ حقیقت جاننے کے بعد کون اس سے یہ استدلال کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت کا پر زہ بننا برحق ہے کیونکہ ایک نبی برحق ایسا کر چکا ہے۔ رعنی آیت ماکلن لیل خذل خاہ فر دین الملک<sup>ؐ</sup>، جس سے

استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونی قوانین کی پابندی کرتے تھے، تو اگرچہ اس آئیت کے مفہوم و معنی میں بہت کچھ کلام کی مخالفش ہے، لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے، اگر اسی کو تسلیم کر لیا جائے، تب بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں جس موقع پر یہ معاملہ پیش آیا (اور قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور ہی کا واقعہ تھا کیونکہ آنحضرت کے عزیز مصر ہونے کے چند ہی سال بعد وہ مشورہ ہفت سالہ تخط شروع ہوا جس میں آپ کے بھائیوں کو غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آنا پڑا تھا) اس وقت تک مصر میں فوجداری قانون وہی رائج تھا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ملک کے نظام تبدیل کو آن واحد میں نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ کام بہر حال تدریج ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی عرب کے نظام تبدیل کو بدلتے دس سال لگ گئے تھے۔ دراٹت کا قانون ۳۰ھ یا ۲۳ھ میں بدلا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین ہجرت کے بعد پانچ چھ سال میں کامل طور پر نافذ کیے گئے۔ فوجداری قوانین کی تحریک میں پورے آٹھ سال لگ گئے۔ ملک کا معاشی نظام بتدربیج ۹ سال میں بدلا گیا۔ شراب کا قطعی انسداد ۸۷ھ میں ہوا اور سود کی کلی ممانعت ۹۶ھ میں کی گئی۔ اسی طرح اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ملک کے قوانین بدلتے میں تدریج سے کام لیا ہو اور ایک خاص وقت تک ان کے زمانہ حکومت میں سابق قوانین جاری رہے ہوں تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ایک غیر خدا کے سوا دوسروں کے جانی قوانین کو جائز سمجھ کر ان کی پابندی کرتا تھا۔

(۳) رعنی تیری دلیل تو اسے دراصل دلیل کے بجائے عذر کہنا چاہیے۔ اس عذر کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ لہذا یہاں صرف ایک حدیث سنانے پر اتفاق کرتے ہیں جسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالْجَهَادُ حَاضِرٌ مَذْبُعْتُنِي إِلَى اللَّهِ أَنْ يَقْاتِلَ أَخْرَى مُذْهَلَةً الْأَمَّةَ الدِّجَالُ لَا  
يُبَطِّلُهُ جُورٌ جَائِزٌ وَلَا عَدْلٌ عَادِلٌ۔

"اور جہاد میری بعثت کے وقت سے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب کہ ان امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کرے گا۔ نہ کسی ظالم کا ظلم اسے باطل کر سکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل"۔

یعنی جہاد کو نہ اس عذر کی بنا پر بند کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت بڑے جبارہ ہم پر مسلط ہیں۔ نہ اس بات کو جہاد نہ کرنے کے لیے بہانہ بنا�ا جا سکتا ہے کہ حکومت اگرچہ کفار کی ہے مگر ہم کو امن نصیب ہے اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ اور نہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر ان کے اپنے ملک میں عدل کا دور دورہ ہو تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں اور باہر کی دنیا میں جو ظلم و فساد بہپا ہو، اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

(۲)

## دین و سیاست کی تفرقی کا باطل نظریہ

اور

## قصہ یوسف علیہ السلام سے غلط استدلال

ناگریں ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:<sup>۱</sup>

»سورہ یوسف سے متعلق آپ کے فہم قرآن سے مستغیض ہونا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرۃ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ رسول تھے، اس لیے فریضہ رسالت کی سرانجام دی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربار فرعون کے مرد مومن نے اپنی تقریر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسفؐ کی نبوت پر قوم فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا۔ لیکن فرعون اور اس کی قوم اس پر ایمان

۱۔ یہ حصہ ترجمان القرآن بابت ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ مطابق اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

نہ لائی۔ اس کے باوجود حضرت یوسف<sup>ا</sup> ان کی حکومت میں شریک کار رہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک بزرگ زپدہ رسول ایک غیر خدائی قائم حکومت کا شریک کار کس طرح رہا، ور آئیں ہا یکہ وہ اس قوم کے سامنے اپنی نبوت بھی پیش کر پچھے تھے اور اس قوم نے اسے تعلیم نہیں کیا تھا۔ ایسے منکرین دعوت اسلامی کے خلاف یا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو جہاد کرنا چاہیے تھا یا بر سائل تزلیل وہاں سے بھرت لازم تھی۔ لیکن آپ نے نہ تو بھرت ہی فرمائی اور نہ ہی ان کے خلاف جہاد کیا، بلکہ ان کے خلاف تبریزی دہنزاری کا اعلان بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا آپ اس محتی کو سمجھائیں گے؟

می اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گزرا ہے، قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے۔<sup>۱</sup> اس لئے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے۔ تاہم قرآن مجید نے اپنے بجمل اشارات سے اس امر میں کوئی لٹک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی قائم حکومت کے شریک کار کی نہ تھی بلکہ عمار کل کی تھی، اور انہوں نے حکومت کی پاگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کل اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوں۔ اس آیت کو بغور پڑھئے:

قَالَ لِجَعْلَنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ وَكَذَالِكَ مَكَنَا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأْ مِنْهَا حِلْيَةً يَشَاءُ۔<sup>۲</sup>

<sup>۱</sup> بائیل اور تہود بھی اس پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتیں، اور نہ مصر کی قدیم تاریخ اور اثربات سے اس معاملے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

یوسف علیہ السلام نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر حاکم ہنا دے، یقیناً  
میں حنافت کرنے والا ہوں اور علم رکھتا ہوں اور اس طرح ہم نے  
یوسف کو اس سر زمین میں اقتدار عطا کیا۔ وہ وہاں جس جگہ بھی چاہتا، اپنی  
جگہ بنا سکتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبه کلی اختیارات کا تھا اور ملے  
بھی کلی اختیارات تھی۔ خزانہ الارض کا لفظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی  
ہے کہ یہ جگہ شاید فرانس مشریق ریونیو ممبر کی تھی، حالانکہ دراصل اس سے مراد  
ملک کے جملہ وسائل (Resources) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبه یہ  
تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے ہاتھ میں دیئے جائیں اور اس کے نتیجے میں  
جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سر زمین مصر ان کی تھی۔ یقیناً  
منہا حیث پشاور کو بھی لوگوں نے بہت ہی محدود معنوں میں ملے لیا ہے۔ ان کے  
نزدیک اس کا مفہوم بس اتنا ہے کہ حضرت یوسف "ہر جگہ مکان بنا لینے یا قیام کرنے  
کے مجاز تھے۔ حالانکہ درحقیقت اس نظرے سے یہ تصور ولانا مقصود ہے کہ اس  
سر زمین پر حضرت یوسف "کا اقتدار ویسا ہی تھا جیسا ایک زمین کے مالک کو اپنی زمین  
پر حاصل ہوتا ہے۔

اب رہایہ سوال کہ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اقتدار حاصل  
ہوا، اس کے ذریعے سے انہوں نے ملک کے نظام تہذیب و تہدن و اخلاق و سیاست  
کو اصول اسلام کے مطابق تبدیل کرنے کی کیا کوشش کی اور اس میں کس قدر  
کامیابی ہوئی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل ہمیں تاریخ سے نہیں ملتی۔ البتہ سورہ  
ماکہ کے ایک اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں حضرت یوسف علیہ  
السلام کا اقتدار محض ایک فرد واحد کا عارضی اقتدار نہ تھا بلکہ آپ کے بعد ایک  
مدت دراز تک آپ ہی کے جانشین، جو یقیناً مسلمان ہی تھے، مصر پر حکمران رہے۔  
انہیں وہ عظمت و شوکت حاصل ہوئی جو اس دور میں دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ

تھی۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمَهُ يَقُولُمَا ذَكْرًا نَعْمَةُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلْتُ فِيهِمْ أَنْبِيَاءً وَجَعَلْتُكُمْ مُلُوكًا وَأَنْتُمْ مَا لَمْ يَوْتِ أَحَدًا مِنَ الْعُلَمَاءِ<sup>۱</sup>

یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگوں اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء پردا کیے اور تم کو فرماز دیا ہے اور تمیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس اسلامی غلبہ و تسلط کا لازمی اثر ملک کی پوری زندگی پر مرتب ہوا ہو گا۔

سورہ مومن کی جس آیت سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قبليٰ قوم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، دراصل اس نے یہ نتیجہ نہیں نکلا۔ میں ایسا سمجھا ہوں کہ وہاں ہندوستان کی صورت پیش آئی تھی کہ ملک کی آبادی کے معتدلبہ حصے نے اسلام قبول کیا اور بڑی اکثریت اپنے شرک پر قائم رہی۔ پھر جس حصے نے اسلام قبول کیا وہی ایک مدت تک بر سرا قدر رہا، مگر رفتہ رفتہ اخلاقی و اعتقادی انحطاط نے اس کو غلامی اور گمراہی کی پستیوں میں گرا ریا تھی کہ غلو اور اشخاص پرستی کے فتنے میں پڑ کر عملًا اس میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی خاص فرق باقی نہ رہا۔ اسی چیز کی طرف مومن آل فرعون نے اشارہ کیا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفَ مِنْ قَبْلِ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زَلَّتِمْ فِي شَكٍ مَعَا جَاءَكُمْ

بِهِ حَشْ لَذَا هَلْكَ قُلْتَ لِنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا۔

اس سے پہلے یوسف تم لوگوں کے پاس صریح نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر تم اس چیز میں برادری کرتے رہے جسے وہ لائے تھے، پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کسی رسول کو ہرگز نہ بیجیے گا۔

خط کشیدہ دو فقروں میں سے پہلا فقرہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسف کی زندگی میں ملک کی بیشتر آبادی آپ کی نبوت کے متعلق بیک میں رہی، جیسا کہ اکثر انبیا کے ساتھ ہوا ہے۔ اور دوسرے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے بعد جو لوگ آپ کے معتقد ہوئے وہ آپ کی شخصیت کے گردیدہ ہو کر غلو میں جلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب کوئی رسول نہیں آئے گا اور اسی بنا پر انہوں نے بعد کے آنے والے کو مانتے سے انکار کر دیا، جیسا کہ آگے چل کر یہودیوں اور یہیسانوں نے کیا، درآں ہایکہ حضرت یوسف یا حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ میں سے کسی کے بعد بھی اللہ کی طرف سے ختم نبوت کا اعلان نہ ہوا تھا۔

بہر حال اس آیت کے یہ معنی نہیں نکالے جاسکتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ملک میں کوئی بھی امہمان نہیں لایا تھا بلکہ دوسرے اشارات کی مدد سے قیاس کی ہوتا ہے کہ ملک میں اہل امہمان کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک مدت تک اسلامی نظام حکومت کو قائم رکھا اور بعد میں بذریع ماکل انحطاط (Degenerate) ہوتا چلا گیا۔

۱۔ یہیں کا بیان ہے کہ مصر سے حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ لگلے تھے ان میں چلا کھو تو صرف مردان جنگی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی مجموعی تعداد ۲۰ لاکھ سے کم نہ ہو گی اور یہ مصر کی آبادی کا کم از کم ۱۰ لفڑی حصہ تھی۔ ۲۔ الومن۔ ۳۳

(۵)

## تفرقی دین و سیاست کا ذقان اور اس کا جائزہ

ہنوز شتر مضمون "سورہ یوسف" کے متعلق چند سوالات<sup>۱</sup> کی اشاعت کے  
کچھ مدت بعد ایک مشہور بزرگ نے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے اور جو  
خان بہادر کا خطاب رکھتے تھے، یو۔ پی میں گلگھر اور ہندوستان کی ایک  
ریاست میں دیوان رہ چکے تھے، اس پر ایک مفصل تقدید لکھی۔ چونکہ  
مولانا مودودی صاحب کے جواب کو سمجھنا بغیر اس کے محکن نہیں کہ  
صاحب موصوف کی تقدید ناظرین کے سامنے ہو، اس لیے ہم پلے اس کے  
متعلقہ حصے یہاں لقل کرتے ہیں، پھر مصنف کا جواب لقل کریں گے۔

ستقر نے جوبات و ریافت کی تھی اور جوبات دراصل بحث طلب ہے وہ صرف اس  
قدر ہے کہ آیا یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن اور شریک کار  
بنے ہیں یا نہیں؟ اور اگر بنے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایسا کرنا اسلامی نقطہ نظر سے جائز  
ہے یا نہیں؟ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت  
مصر میں غیر خدا کی نظام حکومت کے شریک کار کی نہ تھی"۔ اور تعجب ہے کہ اپنی اس  
رائے کی تائید میں کلام پاک کی وہی آئیت قائل جعلتی علی خزانۃ الارض بیش کرتے ہیں  
جو دراصل اس کے خد کو ثابت کرتی ہے۔

۱۔ یہ بحث ترجمان القرآن بابت عمر و صفر ۱۴۲۳ھ مطابق جنوری، فروری ۱۹۰۵ء سے

آئت ذکور کا الفعلی ترجمہ شیخ المند مولانا محمود الحسنؒ کے الفاظ میں یہ ہے  
کہ:

”یوسف“ نے کام بھجہ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر، میں نگہبان ہوں  
خوب جانئے والا اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں  
جگہ پکڑتا تھا اس میں جماں چاہتا۔

اب دیکھیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعون مصر سے خواہش کرتے ہیں  
کہ تو بھجہ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کرو۔ فرعون آپ کا مطالبہ منکور کرتا  
ہے اور آپ فرعون کے ملکہ مال کے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ  
آپ فرعون کے نظام حکومت کے ایک رکن یا شریک کاربن جاتے ہیں۔ مولانا  
مودودی صاحب اس بدیکی نتیجے سے بحث کی ناکام کوشش کرتے ہیں جب کہ وہ  
فرماتے ہیں کہ ”مطلوبہ کلی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلی اختیارات۔“

— اول تو کلی اختیارات کا لفظ کلام پاک میں ہے نہیں۔ یہ لفظ مولانا  
انہی طرف سے کلام پاک کی عبارت پر بڑھا چاہئے ہیں تاکہ کلام پاک مولانا کے  
ذاتی نظریوں کا تالع ہو جائے نہ یہ کہ مولانا اپنے ذاتی نظریوں کی اصلاح مفہوم  
قرآنی کے مطابق کر لیں۔ اسی جیسی ذہنیت کے متعلق غالباً اقبال مرحوم نے کہا  
تھا: ”خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔“ لیکن اس کلی کے لفظ کے ناجائز  
اضافے سے بھی مولانا کے اجتہاد یا نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم کرتے  
ہوئے بھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کلی اختیارات مال کا مطالبہ کیا تھا اور  
کلی اختیارات ہی ملے تھے، لیکن وہ اختیارات فرعون مصری سے تو مانگے گئے  
تھے اور فرعون مصری نے تو وہ اختیارات عطا کیے تھے۔ اس لئے باوجود ان کلی  
اختیارات کے حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت کے قائم حکومت  
نہیں ایک رکن یا ایک شریک کار بن سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح مولانا مودودی صاحب کا یہ فرماتا کہ ”حضرت یوسف علیہ السلام کا

مطالبه یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دے دیئے جائیں اور اس کے نتیجے میں جو اختیارات ان کو ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری زمین مصران کی تھی۔“ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ بان بھی لیا جاوے کہ یوسف علیہ السلام نے مال کے جملہ اختیارات کا مطالبه کیا تھا اور مال کے جملہ اختیارات آپ کو تفویض ہو گئے تھے، تاہم سلطنت میں مال کے علاوہ بہت سے دیگر مجھے ہوتے ہیں، مثلاً پولیس، فوج، عدالت۔ ان میں سے نہ کسی کا مطالبه یوسف علیہ السلام کی طرف سے کیا گیا نہ یہ مجھے آپ کے پردازی کے گئے۔ تو پھر مولا نا مودودی کا یہ کہنا کہ ”جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری زمین مصران کی تھی۔“ بالکل بے بنیاد ہے۔

اس لئے یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر کے خزان پر متصرف ہونے کے بعد بھی سلطنت کے ایک رکن یا شریک کار کی رہتی ہے جب تک کہ کسی ذریعے سے یہ ثابت نہ ہو کہ فرعون مصران کی سلطنت اور حکومت سے دست بردار ہو گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی جگہ مصر کے بادشاہ اور ملک بن گئے تھے۔ سو یہ تاریخ سے ثابت ہے، نہ کلام پاک سے، بلکہ کلام پاک سے بعراحت اس کی تردید ہوتی ہے۔ آئیت زیر بحث سے یعنی ما قبل یہ آیات ہیں:

وَقَالَ الْمَلِكُ اثْنَوْنَىٰ بِهِ اسْتَخْلَصَهُ لِلْفَسْسِ فَلَمَّا كَلِمَهُ قَالَ إِنَّكَ إِلَيْنَا

لَدِينَا مَكِينٌ أَمْيَنٌ<sup>۱</sup>

انہیں میرے پاس لے آؤ کہ میں انہیں اپنے لئے چن لوں۔ پھر جب اس سے (یوسف علیہ السلام سے) بات کی، کہا بے شک آپ ہمارے یہاں معزز معتد ہیں۔

ان ہر دو آیات سے بالکل واضح ہے کہ فرعون مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنی سلطنت کا معزز اور معتقد رکن اور اپنا مشیر خاص بنایا۔ ان آیات میں اس بات کا شائیبہ بھی نہیں کہ فرعون مصر اپنی سلطنت یا اپنے اختیارات سے دست بردار ہو گیا تھا۔ نیز ایک مأخذ کی آئت سے بہراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواص مصر پر متصرف ہونے کے عرصہ بعد تک فرعون مصر کی سلطنت حاکم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک پر جاری تھا۔ کیونکہ جب برادران یوسف دوسری مرتبہ غلے کی بھرتی کرنے آئے ہیں اور اپنے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامن کو بھی لائے اور حضرت یوسف نے اپنے بھائی بنیامن کو اپنے پاس رکھا اور بنیامن پر ظاہر بھی کر دیا کہ وہ ان کا حقیقی بھائی ہے مگر اپنے دوسرے بھائیوں پر اس امر کو ظاہر نہیں کیا اور چونکہ حضرت یوسف بنیامن کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لئے دوسرے بھائیوں پر اس امر کے ظاہر کیے بغیر کہ بنیامن ان کا بھائی ہے اس کی یہ تدبیر کی کہ جب برادران یوسف کے واسطے ان کا اسباب تیار کیا تو بنیامن کے اسباب میں ایک پانی پینے کا پیالہ رکھوا دیا اور جب قائلہ روانہ ہونے لگا تو موذن یا پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلے والو، تم البتہ چور ہو۔ برادران یوسف نے اس سے انکار کیا تو پکارنے والے نے کہا کہ کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹ لے لگے؟ برادران یوسف نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں ہاتھ آؤے وہی اس کے بد لے میں جاوے۔ ہم یعنی سزادیتے ہیں ظالمون کو۔ اس کے بعد ٹلاشی لی گئی اور پیالہ بنیامن کے اسباب میں سے برآمد ہوا۔ چنانچہ بنیامن پیالے کے بد لے میں روک لئے گئے۔ اس موقع پر ارشاد خداوندی ہے: **هَا كَانَ لِي لَخْذَا خَاهَفْنِ دِينَ الْمَلَكِ الْأَلَّانِ يَشَاءُ اللَّهُ**۔ اس جس کا الفہمی ترجیح ہے:

”وہ (یعنی یوسف) ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو ہا ہے اللہ۔“

خط کشیدہ عبارت صاف ہاتھی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک ملک مصر میں جاری تھا اور اس قانون کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو چوری کے الزام میں اپنے بھائیوں سے لے نہیں سکتے تھے، مگر خداوند عالم نے خود ان کے بھائیوں کے منہ سے کھلوادیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے چوری کا مال ہاتھ آؤے، وہی اس کے بدلتے میں جاوے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کی جو تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے کی ہے وہ یہ ہے کہ ”یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس سے مال نکلے اس کو غلام بنا لو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا۔ اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ اپنے اقرار میں بندھ جاویں تو ملکی قانون کے مطابق کوئی صورت بنیامین کو روک لینے کی نہ تھی۔“

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر ممکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے مگر ریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب مذکور نے اس وقت جب کہ آپ بھن یا جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے ساتھی قیدیوں سے فرماتے ہیں:

يَا صَاحِبِيْ السُّجُنِ ارْبَابُ مُتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اِمَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا  
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ الْاَسْمَاءِ سَمِيَّتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَابَاءُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا  
مِنْ سُلْطَنٍ اَنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلَّهِ اَمْرٌ اِلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ

ای مرح وزارت کے عمدے پر ممکن ہونے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی تبلیغ کا کام ضرور جاری رکھا ہو گا۔ البتہ جو بات ان آیات سے بلاشبہ ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی ٹافڑ رہا اور یوسف علیہ السلام کے اس عمل پر بجائے اس کے کہ خداوند عالم کی طرف سے کوئی سرزنش کی جاوے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کو ایک مرح سراہا جاتا ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کے اس ممکن فی الارض کو انعام خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

**”وَكَذَالِكَ مَكَنَا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَقْبُوَ مِنْهَا حِيثُ يَشَاءُ“**

جس سے یہ نتیجہ لکھا ہے کہ مسلمان تو مسلمان انبیاء تک کے لیے غیر اسلامی نظام حکومت کا رکن بننا جائز ہے اور جائز ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں بطور فرض کفایہ کے واجب ہے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خود خواہش کر کے مصر کے خزان پر متصف ہوئا اس بات کی ولیل ہے کہ ایسا کرنے کو یوسف علیہ السلام اپنے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر واجب خیال فرماتے تھے۔ ورنہ وہ فرعون سے ایسی خواہش کبھی نہ فرماتے اور نہ ایسی خواہش کرتے وقت وہ اپنے حفظ و طیم ہونے کا انکھار کرتے۔ کیونکہ اگر آپ کے نزدیک ملک مصر کا وزیر بننا آپ پر لازم اور واجب نہیں تھا تو آپ کا اپنے آپ کو حفظ اور طیم ہاتا بے جا نہ رہ سکی اور خود ستائی میں داخل ہوتا ہے۔ (اس کے بعد موصوف نے اپنے بیان کی تائید میں چند حوالے پیش کیے ہیں اور کچھ عقلی دلائل بھی فراہم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ نیز ہجرت جسہ سے بھی استدلال کیا ہے۔ چونکہ ان کے دلائل کا جوہر اور آگیا ہے اس لیے ہم بخوب طوالت باقی حصہ حذف کر رہے ہیں۔۔۔۔)

## جواب

ہم جناب خان بہادر صاحب کے بہت شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس مسئلے کو چھیڑ کر پھر ایک مرتبہ ہمیں اپنا نقطہ نظر صاف پیش کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ ہم اس بحث میں اپنا وقت ہر فر اس امید پر صرف کر رہے ہیں کہ بہت سے طالبین حق کو اس سلسلے میں اکثر گمراہ کن دلائل کا جواب مل جائے گا جو اطاعت غیر اللہ یا بالغایت دیگر اسلام بغیر اللہ کو جائز قرار دینے اور نظام کفر کی بندگی کو مباح بلکہ فرض کفایہ تحریک کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں۔

قصہ یوسف علیہ السلام کے ذریعہ نظر پلو پر ہم اس سے پہلے دو مرتبہ بحث کر چکے ہیں۔ پہلی بحث زیادہ مفصل دلائل تھی اور دوسری بجمل و مختصر۔ لیکن خان بہادر صاحب نے نہ معلوم کہوں پہلی کو چھوڑ کر دوسری کو مدار گھنٹو ہانا لیا۔ حالانکہ جو اعتراضات انہوں نے اپنے مضمون میں درج فرمائے ہیں، ان میں سے اکثر کا<sup>۱</sup> بلکہ شاید سب ہی کا جواب ہماری پہلی بحث میں انہیں مل جاتا۔<sup>۲</sup> بہر حال یہ عدم الفات خواہ کسی وجہ سے ہو، ہمارے نے اس میں خبر ہی کا پلوکل آیا کہ جن باتوں کو پار بار چھیڑ کر ہمارے لئے واضح کرنا مشکل تھا انہیں دوسروں کے چھیڑنے پر بیان کرنے کا ہمیں موقع مل گیا۔

## کیا اسلام میں تناقض ہے؟

دنیا میں ایک معقول آدمی سے جن چیزوں کی توقع کی جاتی ہے غالباً ان میں سب سے پہلی چیز لگی ہوتی ہے کہ اس کی باتوں میں تناقض نہ ہو۔ ایک معمولی عقل کا گنووار آدمی بھی جب کسی شخص کو ایسی باتیں کرتے دیکھتا ہے جو

<sup>۱</sup> اشارہ اس مضمون کی طرف ہے جو اوپر کے نکشن میں "اسلام اور اقتدار" کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہوں تو فوراً لوگ رنجا ہے۔ کہوں کہ اس کی نہایت مولیٰ عمل بھی تناقض ہاتوں کی غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جن ہاتوں کی توقع کسی مکملیا سے مکھیا مگر ذی حق انسان سے نہیں کی جاسکتی ان کی توقع اس خدا سے کی جاتی ہے جو خود عمل کا خالق اور تمام حکمت کا مالک ہے اور اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ ہے کہ خدا سے اس انتہائی ماقولیت کی توقع رکھنے والے، بلکہ اس کا مطالبہ کرنے والے کوئی جاہل، کوون لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ ذی علم لوگ ہیں جو دنیا بھر کو علم و عمل کے درس دیتے ہیں اور وہ قابل اصحاب ہیں جن کی عقلیں اپنی دنیا کے معاملات چلانے میں خوب لڑتی ہیں۔ یہ ہوشِ مدد حضرات اپنے خدا سے چاہتے ہیں، اور یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ اس کی ہاتوں میں تناقض ہو۔ یعنی وہ یہ بھی کہے کہ میں پادشاہ زمین و آسمان ہوں اور پھر اپنی زمین کے کسی گوشے پر کسی اور کی پادشاہی تسلیم بھی کرے۔ وہ یہ بھی کہے کہ لوگوں تم سب میرے احکام کی اطاعت کرو، پھر لوگوں کو یہ اجازت بھی دے، بلکہ اس کو فرض تک قرار دے دے کہ ان حاکموں کی اطاعت بجا لائیں جو اس کے حکم کی سند کے بغیر، اور اکثر حالات میں اس کے حکم کے خلاف احکام دیتے ہیں۔ وہ انسانوں کے لئے خود ایک قانون بھی بنائے اور یہ اعلان کرے کہ میرا بھی قانون ہے اور اس کے سوا ہو کچھ ہے، باطل ہے، اور پھر اس کے ساتھ دوسرے قوانین کے نفاذ کو بھی جائز رکھے اور اپنی انسانوں کو جن کے لئے اس نے قانون بنایا ہے یہ "حق" بھی دے کہ چاہیں خود اپنے لئے قانون بنائیں اور چاہیں دوسروں کے قوانین کی تحریکی کرتے رہیں۔ وہ اپنے غیربوں کو خاص اسی فرض کے لئے بجوت بھی کرے کہ زمین کے پاٹھدوں کو اس کا دین قبول کرنے کی دعوت دیں اور پھر انہی غیربوں کو یا ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت بھی دے (بلکہ خان بہادر صاحب کے بقول اس خدمت پر سرا ہے بھی) کہ اس دین کے سوا کسی اور دین کے نظام میں کارکن د

خدمت گزار بن جائیں اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں اپنی ہمیتس صرف کر دیں۔ وہ ساری دنیا کے ہاشمیوں میں سے چھانٹ کر ایک امت خاص اس مقصود کے لئے ہائے کہ اس معروف کا حکم دے جسے اس نے معروف قرار دیا ہے اور اس مسخر کو مٹائے جسے اس نے مسخر تھرا یا ہے، اور بھرا ہی امت کے لئے اس بات کو حلال بلکہ اس کے بعض "بر گزیدہ" افراد کے لئے فرض کھایہ شہزادے کہ ان مسخرات کو قائم کرنے اور رواج دینے میں حصہ لئیں جیسیں اس کے باقی معروف شہزادے ہیں اور ان معروفات کو مٹائے اور دبائے میں آہ کا رہیں جو اس کے نافرمانوں کی لگاہ میں مسخر قرار پاچکے ہیں۔

یہ ایسی صریح تناقض ہائی ہیں جن کے تناقض کو سمجھنے کے لئے کسی محترم غور و مگر کی ضرورت نہیں ہے لیکن عجیب بات ہے کہ جو لوگ تغیریں لکھنے اور فقہ و محتولات کا درس دینے کی قابلیت رکھتے ہیں، اور جو اتنی حقیقت رکھتے ہیں کہ کلکشی اور دیوانی ہیے بڑے بڑے مناصب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں، انھیں یا تو ان باتوں میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا، یا پھر خداوند عالم کے متعلق ان کی رائے اتنی بری ہے کہ وہ اس سے ان بے عقليوں اور نادائیوں کی توقع رکھتے ہیں جیسیں ایک جاہل گتوار بھی اپنی چوپال کے کسی رفتی میں پا کر مجب نہیں کر سکتا۔

خان بہادر صاحب اپنے ای مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

ایک بعد کی آیت سے بصرافت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؐ کے خزانی مصر پر مصروف ہونے کے بعد عک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین یعنی ملک میں جاری تھا۔ ماسکان لیا لخذ اخاء فی دین الْمُلْكِ الَا لَن يَشَاءُ اللَّهُ (ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس پادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ) یہ چارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا۔

## دین کا مفہوم۔

ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت صاحب موصوف جس بات کو ثابت کرنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے اس نے شاید انھیں اتنی سلسلت نہ دی کہ کچھ دیر غدر کر اس صریح عاقض پر غور کر لیتے جوان کی مزومہ تفسیر کے لحاظ سے یہاں قرآن کے بیان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اب وہ ہمارے ہی توجہ دلانے سے غور فرمائیں۔ یہاں خود ان کی اپنی نقل کردہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مصر کے محلی قانون کو جو فرعون مصر کی حاکیت کی بنیاد پر تھا "دین الملک" (پادشاہ کا دین) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین صرف اس پوچاپ کا نام نہیں ہے جو مندرجہ اور معدود میں کی جاتی ہے، بلکہ اس قانون کا نام بھی ہے جس کے مطابق پولیس مجرموں کو کپڑتی ہے، جس کے تحت عدالت معاملات دیوانی و فوجداری کا فیصلہ کرتی ہے، جس کی ہیروی میں ملک کا انتظام چلا یا جاتا ہے اور جس پر تہذیب کا سارا نظام قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے یہ سارے شعبے بحیثیت مجموعی جس طریقے پر چلتے ہیں، اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "دین" ہے اور چونکہ ملک مصر میں وہ طریقہ فرعون کی مشیت سے ماخوذ اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی تھا، اس لئے قرآن اس کو "دین الملک" کہہ رہا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ "دین اللہ" بھی صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے جو مسجدوں اور نماز روزے تک محدود ہو، بلکہ اس سے مراد بھی اس پوری شریعت کی پابندی ہے جو اللہ کی رضا سے ماخوذ اور اس کی حاکیت پر مبنی ہو اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لئے بعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لئے یا "دین الملک" کو فروع دینے کے لئے؟ اگر خان بہادر صاحب کی تاویل اور ان جھرات کی تفسیر، جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، مان لی جائے تو

اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی حقوق کو، اور خصوصاً اس حقوق کو جو صریح رہتی تھی، "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے، اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و محرانی میں "دین الملک" کے قیام و احکام کی خدمت انجام دینے لگا۔ اور لطف یہ ہے کہ اللہ جوان اس صریح تنقیض طرز عمل کا تنقیض تو کیا محسوس فرماتے، اٹا اس نبی کے اس فعل کو، خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگئے اور نظام کفر میں اپنے نبی کے بعدہ وزارت فائز ہو جائے کو "انعام خداوندی" سے تعبیر فرمائے لگئے۔ گویا کہ اللہ میاں کا حال بھی مجاز اللہ ہمارے زمانے کے ان دین دار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گناہ لئے ہوئے ملے پر سجدہ گردانی فرمائی رہے ہوتے ہیں مگر صاحب زادے جب ایم۔ اے پاس کر کے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انپکڑی پر فائز ہو جاتے ہیں تو وہی دین مجسم بزرگ اللہ کا شگر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا۔

آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر ممکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ حق کا کام نہیں کیا، یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جب کہ آپ جیل میں تھے، اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی..... البتہ جو بات آیات سے بلا شک و شبہ ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بننے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا۔"

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحب موصوف نے اپنے مدعا کی دھم میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر یہ کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوچا جو معبد میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعت قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے، ایک ہی خدا کے لئے ہو، یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہو جائے، تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسف نے نوکری کر کے خود اپنی اس تبلیغ حق کے خلاف عمل کیا۔ اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبد میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلا رہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دو عملی کی تبلیغ تھی۔

پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انہوں نے پادشاہ سیاست تمام لوگوں سے کہا تھا کہ میں مالک زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، جیسا کہ تمام انبیاء کرتے رہے ہیں کہ فاتقوا اللہ واطیعون۔ تو اس اعلان کے ساتھ ان کا غیر مسلم پادشاہ کی آقائی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی قائم کے بجائے غیر اسلامی قائم کی خدمت انجام دننا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اور اگر انہوں نے یہ کہا تھا کہ لوگوں میں ہوں تو پادشاہ ارض و سما کا نمائندہ، مگر میرا ملک یہ ہے کہ پادشاہ مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو، تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک مرتع تناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال بخوبی کے بجائے قبیلے سے ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوان وزارت کے بجائے

پاگل ٹانے میں مجھے بھی چاہیے تھی، بلکہ آج بھی اسی کتاب پر ہرگز ایمان لائے جائے کے قابل نہیں رہتی جو ایک طرف تو خود یہ قادروں کیلئے بیان کرتی ہے کہ خدا نے ہو رسول بھی سمجھا ہے اس لئے سمجھا ہے کہ اذن خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے ہے۔ (وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيَطَّعِ الَّذِينَ أَنْهَاكُوا مَلَائِكَةَ فِي الْأَرْضِ<sup>۱۰</sup>) اور دوسری طرف وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیر اللہ کا مطیع بن کر رہا اور دوسرے بندگان خدا کو بھی اذن خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی غیر خدا کا مطیع بنا تا رہا۔ قرآن اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا ہے کہ لوکلن من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً<sup>۱۱</sup> یعنی اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کسی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف بیان پاتے، لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرز خیال کے لوگوں کی تاویلات حلیم کر لیں تو قرآن کے بیانات میں یہاں ایسے کھلے ہوئے تاقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن آپ اپنے یہی پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کلام قرار پائے گا بلکہ وہ "اور" بھی جس کی تصنیف اسے سمجھا جائے گا بہر حال کوئی صحیح الدعائغ انسان تو نہ ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان بہادر صاحب جس طرز خیال کی نماہنگی فرمادے ہیں وہ اپنے بیچپے اخلاقی انحطاط کی ایک طویل اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔

### ترقی دین و سیاست کا تاریخی اور نفیا تی جائزہ

مسلمان جب اپنے اصل مقصد کو بھول کر اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں جلا ہو گئے اور دیداری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ

گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے، خواہ مقاصد زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظام اجتماعی کو زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجارت کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نسب الحسین کے احتیارات سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غلطت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کی تالیع فرمان ہوتی چلی گئیں۔ لیکن انہوں نے اور ان کے علماء نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی، جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، مغلانی کرنے کے بعدی اثاثاً یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظام کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے بر کی جائے۔ چنانچہ "اضطرار" کے بنا نے سے اس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر ببرکی جائے۔

اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاوں کا سلسہ شروع ہوا ہا کہ انہیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پہنچے ہیں یا اپنی خلافت میں بجدید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار ہے ابتداء "صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سخت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائی، روز افزون اور غیر تناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی۔ ہر نئے اضطرار نے مطالبه کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لئے تجویز کئے ہیں انہیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ۔ مگر یہ جتنے عذاب خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انہوں نے مستقل طور پر یہ قاعدہ ہی طے کر لیا کہ واقعی ہر اضطرار کا تقاضا گی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تلاط کفر کی حدود کو پہنچنے دیں۔

پھر اس "اضطرار" کے تصور نے بھی انہیں ستائی شروع کیا۔ کیونکہ اضطرار کے نیچے حرمت کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ کوئی صاحب عمل آدمی اس مرجع

پات کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب آپ محض بحضور ہونے کی وجہ سے سور کا گوشت کھائیں گے تو بہر حال سور آپ کی نگاہ میں حرام تو ضرورتی رہے گا اور جب اسے آپ فی الاصل حرام سمجھتے ہوئے مجبوراً "کھائیں گے تو ناممکن ہے کہ آپ کے دل میں نفرت و کراہیت نہ ہو۔ ناممکن ہے کہ آپ اس سے لذت لیں، شوق سے کھائیں، زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کریں اور اس کے کباب اور قورمه اور پلاو پکوانے کی غفر کریں۔ ایسے ہی اجتناب اور تغیر کا جذبہ ان تمام معاملات میں ہاگزیر طور پر پیدا ہوتا ہے جنہیں آپ حقیقت کے احتیار سے حرام سمجھتے ہوں اور صرف اضطرار کی وجہ سے اپنے لئے عارضی طور پر جائز کر لیں۔ مگر ایک پوری قوم کا اپنی زندگی کے سارے ترقی، معاشری، سیاسی معاملات میں دانما" اس طرح رہنا کہ اس پر اضطرار کی شرعی و نفیاً کیفیت طاری رہے، اور وہ حاضر ال وقت نظام زندگی سے نفرت و کراہیت کے ساتھ ہے گیر اجتناب کرتی رہے، اور صرف اس حد تک اس سے تعلق رکھے جس حد تک اپنا تعلق جینے کے لئے ہاگزیر ہو، عملاً" حال ہے۔ ایسی حالت کو ایک قابلِ مدت سے زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بہت جلدی طبائع اس سے ٹھک جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تھکاوٹ بھی مسلمانوں میں ٹھیک اپنے وقت پر پیدا ہوئی لیکن پہلے سے دینی انجھطاں جس تسلیل کے ساتھ بودھتا چا آ رہا تھا اس نے ان حکمنے والوں کے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ اپنے اس غلط نظریہ پر نظر ثانی کرتے جو "نظام کفر میں اسلامی زندگی" کے امکان کے متعلق انہوں نے ابتداء "قام کیا تھا اور اس حالت اضطرار کو ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے جس کی وجہ سے ہر طرف ہر شبہ زندگی میں حرمتوں سے محصور اور خبائش میں جلا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے بر عکس دینی انجھطاں کی سابق رفتار انہیں جس رخ پر بڑھا لے گئی وہ یہ تھا کہ مرے سے "اضطرار" کے بہانے ہی کو ختم کر دیں تاکہ جو حرمتیں نظام کفر میں ترقیات اور آسائشوں کے

درداں سے ان پر بہت کئے ہوئے ہیں وہ ثبوت ہائیکس اور اباحت و حلت میں تبدیل ہو کر رہیں۔

اس غرض کے لئے دین کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ دین کا تعلق صرف عقائد و عبادات اور چھٹے عاشرتی امور میں نکاح و طلاق وغیرہ سے ہے۔ اگر ان معاملات میں کوئی قائم حکومت مسلمانوں کو امن دینے کا ذمہ لے تو اسلامی زندگی کا اصل مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دل الرکفر دار الامن ہے۔ اس کی وقاواری و اطاعت لازم ہے، اس کے تحت سارے تمدنی معاملات (جو اس نے نظریے کے مطابق دنیا بمقابلہ دین کے زیر عنوان آ جاتے ہیں) اپنی قوانین کے مطابق چلنے چاہئیں جو کافرانہ اصولوں پر ہنئے گئے ہوں، اور اس کی قانونی و انتظامی مشین کو چلانے میں، ہمکہ اس کے تحفظ اور اس کی توسعہ کے لئے جان کی قربانیاں تک دینے میں بھی کوئی "مضاائقہ" نہیں ہے۔

لیکن یہ معاملہ صرف "عدم مضاائقہ" یا اباحت و حلت پر بھی نہ رکا۔ دل الرکفر میں مسلمانوں کی ضروریات نے جلد ہی انہیں مجبور کرنا شروع کیا کہ اپنی نئی نسلوں کو خدمت کفر کا شوق دلانے کی کوشش کریں تاکہ ان نعماتات کی طلبی ہو جو اول اول کچھ مدت کے "مضاائقہ" نے انہیں پہنچایا تھا۔ اس لئے ایک آخری دلیل یہ تصنیف کی گئی کہ مسلمانوں کی ترقی و نکاح اور بعض حالات میں ان کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ نظام کفر کے عروالی، تحریکی، انتظامی، فوجی، صنعتی، غرض تمام شعبوں میں زیادہ حصہ لیں، ورنہ امت کے وفات پا جانے یا کم از کم ترقی کی دوڑ میں غیر مسلموں سے بیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس دلیل نے ہبے یک جنہیں قلم اسی چیز کو جو کل تک صرف مباح کے مقام پر تھی فرض کے درجے پر پہنچا دیا اور واجب ہو گیا کہ اگر ساری قوم نہیں تو اس میں سے ایک طبقہ تو اس فرض کے انجام دینے کے لئے ضرور کھٹا ہی رہے، کویا حرم اللہ یوں قرار پایا کہ:

فَلَوْلَا نَفِرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الْكُفْرِ وَلِيَضْلُّوْا قَوْمَهُمْ  
إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لِعِلْمِهِمْ يَضْلُّونَ أُولَئِكَنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الشَّرِّ  
يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَا عَنِ الْمَعْرُوفِ ۚ

دین میں لگی وہ ٹیکم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے ترقی و  
وہدار حضرات نبیوں کو گردش دیتے ہوئے دکالت اور منصبی کے پیشوں میں  
داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کے معاقب وہ لوگوں کے  
معاملات کا فعلہ کریں اور کرائیں۔ اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی  
خلافت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحاء  
و انتیاء کے پیچے نبی درس گاہوں میں داخل ہوئے اور دہاں ہے بے دینی و مادہ  
پرستی اور بد اخلاقی کے سبق لے لے کر لکھے اور پھر اس نظام کفر کے صرف محلی  
حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر حالات میں اخلاقی اور اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت  
گزاریں گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداء "محل  
محض اپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پنچالی کے مردوں سے  
گزر کر جاہیت اور خالات اور بد اخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا۔ ذہی "فرض  
کفایہ" جسے او اکرنے کے لئے پہلے ہرداشتی تھے، عورتوں پر بھی فائدہ ہو گیا، اور ان  
بے چاریوں کو بھی آغراں "زینی خدمت" کی بجا آوری کے لئے لکھا پڑا۔ نہ  
لختی تو خطرہ تھا کہ کہیں فیر مسلم ان سے بازی نہ لے جائیں۔ ۱

۱۔ قیام پاکستان کے بعد اب معاملہ اور آگے بڑھ گیا ہے۔ اب امت کے جینے کی صرف یہ  
صورت رہ گئی ہے کہ شرقاء کی لوگوں کلے مہدوں میں فوجی ڈرل کریں اور مسلمان  
صافیزادیاں نرنسک کی زندگ محاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک میں جائیں اور غیر ممالک  
میں مسلمانوں کی نیابت کا فریضہ ان کے نمائندے ہی نہیں بلکہ نماحدیاں بھی انجام دیا  
کریں۔ (صف)

اور کسی یہ مگان نہ کر سکتے گا کہ دین میں یہ تمہم آج پکھنی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بناء آج سے صدیوں پہلے پڑھی تھی، جبکہ تamar کے کفار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ”نظام کفر میں اسلامی زندگی“ کا نقش پہلی مرتبہ اسی دور کے علماء نے مرتب کیا تھا، بلکہ اسی زمانے میں پہلے ہے علماء و مسلمانوں نے خود نظام کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی اور ان میں بکھرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارس عربیہ میں علمائے دین و مفتیان شرع میں تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ ظلطی اب ایک مقدس ظلطی میں بھی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانے کے فقیہ اور محدث اور مفسر سب اس میں جلا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلط بات نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ پہلے بڑے لوگ اس میں جلا ہو چکے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں، جو ابتدائی اضطرار کی بناء پر اسلام ”زیر مایہ کفر“ کے نظریہ سے شروع ہوا، پھر رفتہ رفتہ ”نظام کفر کی خدمت جائز ستحب فرض کفایہ“ کے نظریہ تک پہنچا اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطہ نظر کی پستیوں میں جاگرا کہ ”ذہنی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری میں متفاہی دین ہے۔“ مسلمانوں کی کوشش برائے یہی رہی کہ اپنے قتل کے ہمراطے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لئے دلیل بہرحال انہیں خدا کے دین ہی سے ملتی چاہئے۔ یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زخم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ ”خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضمن ہے اس لئے جو ضرورتیں اب پیش آ رہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے بھی اسی بین سے ہم کو رہنمائی ملتی چاہئے۔“ لیکن دراصل اس ظاہری فارمولے کے

باطن میں جو حقیقی فارمولہ چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ ”جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے اہمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلتے میں حکم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے پلنے کے بجائے ہمارے پیچے پلنے شروع کر دے۔ یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلے میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انہیں پورا کرنے کی ضرورت لیتا جائے، بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہوئی ہا ہے کہ ہم اس کی اقامت کا کام، حقیقی کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی بحودی میں جس جس دادی کی خاک چھانٹتے پھریں اس میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہے اور جن جن ادیان باطلہ کے ہم تعالیٰ فرمان بننے جائیں ان کے ماتحت ساری غلامانہ حیثیتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے اور اس کے خلاف جو جو طرز زندگی ہم قول کریں ان میں پیش آئے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو۔“ چنانچہ انسی غلط نقطہ نظر کو لئے ہوئے ان لوگوں نے قرآن و سنت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ تھمری تو وہ سورہ عنكبوت تھی، نہ بقرہ، نہ آل عمران، نہ افال، نہ توبہ، بلکہ سورہ یوسف تھی۔ اور اس کے بھی صرف وہ مقامات جن سے خان بہادر صاحب استدلال فرماتا رہے ہیں۔ اسی طرح پوری سیرت نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قاتل ایجاد ملی تو وہ نہ کے کی تپتی ہوئی رہت تھی، نہ ظائف کی سمجھ باری، نہ بدر و احمد کے میدان، بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت بھرت کر کے جسی مگئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت چھ سال رعایا بن کر رہی۔

لیکن جو شخص مطلب جو ذاتیت نہ رکھتا ہو بلکہ طالب حق ہو اس کے لئے یہ سوال غایبت درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ درحقیقت یوسف علیہ السلام کے ذریعہ بحث

واقعات سے بھی کیا وہی نتیجہ لتا ہے، جو یہ حضرات مکالمہ ہائجے ہیں؟ اور اگر یہ  
تعلیم کر لایا جائے کہ وہی نتیجہ لتا ہے، یعنی یہ کہ ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی  
ہدایت کے تحت ایک قوم کفر کی خدمت اور غیر الہی ہمدون (دینِ الملک) کے  
اجراء و نفاذ کی ذمہ داری اسی غرض کے لئے قبول کی تھی کہ ایسا کرنا فی خر  
تصور تھا، اور یہ مسلمانوں نے کہ سے جہش کی طرف اسی بنیاد پر ہجرت کی تھی  
کہ ایک مسلم جماعت کے لئے ایک فیر مسلم قوم تدن و سیاست پاکل ایک  
موزوں جائے قیام ہے بشرطیکہ وہ مسجد میں اپنے خشاونے کے مطابق پوجا کر لینے کی  
اور اپنے سینے میں کچھ عطاویں رکھ لینے اور زبان سے ان کے پھاٹ اڑا لینے کی  
اور ان کو اجازت دے دے، تو اس کے بعد کچھ مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں جو  
اوپر کے سوال سے پدرجہا زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات  
مان لینے کے بعد تو یہی امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ:

### چند بنیادی سوالات اور ان کا جواب

- ۱۔ اللہ تعالیٰ نے جو دین انہیاء علیم الملام کے ذریعے سے نوع انسانی کے لئے  
بھیجا آیا وہ صرف حبادت گاہ کے لئے تھا یا پوری انسانی زندگی کے لئے؟
- ۲۔ اور جو انہیاء اس دین کو لے کر آئے وہ سارے کے سارے ایک یہی مصدر  
کے لئے آئے تھے اور ایک یہی ان کا مشن تھا یا مختلف مقاصد اور مختلف مشنوں  
کے لئے، جن میں سے بعض مشن بعض کی خلاف ہوتے ہوں؟
- ۳۔ اور یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ فی الواقع کیا ہے؟  
انہی پوری زندگی میں اس کی بندگی کرے اور اسی کے قانون کی متابعت میں کام  
کرے یا صرف پوجا اس کی کرتا رہے اور باقی اپنے سارے معاملات جن طریقوں  
پر چلا ہے چلائے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس کا  
تعلق صرف اس محدود زندگی سے ہے جو آج کل کے تصور کے لحاظ سے

"ذہنی" کہلاتی ہے۔ مگر یہ ہن لپٹے کے بعد قرآن میں اور دوسری کتب آسمانی میں تمن، معاشرت، سیاست، قانون دینی اور فوجداری، خوااب طشتادت و حدالت اور مسائل ملح و جنگ وغیرہ کے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ سب بے معنی قرار پاتی ہیں۔ باہم ان کی حیثیت احکام کی نہیں بلکہ سفارشات کی رہ جاتی ہے جن پر عمل ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو اللہ میاں کو کوئی خاص شکایت نہ ہو گی۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب بھی یہ ہو سکتا ہے اور ہو سکتا کیا معنی، آج کل عالم در پر ثبوت کا تصور ہی ہے کہ مختلف انہیاء مختلف مشن لے کر آئے ہیں، حتیٰ کہ ایک نبی کا مقصود بھت اگر یہ رہا ہے کہ نظام کفر کو توزنے کے لئے ٹوٹے اور اس کی وجہ نام اسلامی کو زمین پر حکمران ہونے کی حیثیت سے قائم کرے تو دوسرے نبی کا مقصود بھت اس کے بر عکس یہ رہا ہے کہ نظام کفر کے اندر نہ صرف یہ کہ محدود حتم کی ذہنی و اخلاقی اصلاح پر اتفاقاً کرے، بلکہ اس نظام کفر کا مطبع و قیادار بن کر رہے اور موقع ملے تو اس کو چلانے اور فروغ دینے کے لئے خود اپنی خدمات پیش کر دے۔ مگر یہ بات نہ تو قرآن کے نیان کے مطابق ہے جو پورے زور کے ساتھ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ سارے انہیاء کا مقصود بھت ایک ہی تھا اور نہ حل یہ ہاؤ کرنے کے لئے تیار ہے کہ اللہ تعالیٰ سے الکی مخفاد اور باہم متصادم حرکات کا غبور ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی معقول آدمی بھی اس خدا کو ایک عجیم خدا ہمانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا جو انسانوں کی طرف اپنے غیر بھی کسی مقصود کے لئے بھیجے اور کبھی اس کے بالکل بر عکس کسی دوسرے مقصود کے لئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نبی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے آخری مرحلوں پر بخیج جائے، دوسرا نبی بخیج کے کسی مرحلے میں یا ابتدائی مرحلہ ہی میں آخر وقت تک کام کرتا رہے اور کوئی تیرانی دعوت و تبلیغ یا جنگ کے بجائے کسی درمیانی صورت کو اپنے مخصوص حالات میں

قابل عمل پا کر اسے اختیار کر لے۔ اور ان اشکال کے اختلاف کے باوجود متصدر سب کا ایک حق ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاتھے ہوئے نکام زندگی کو محمل طور پر دنیا میں قائم کرنے کی سعی کرنا، لیکن اس اختلاف اشکال کو یہ سعی پہنانا کہ انسیاء کے مقاصد بحث ہی سرے سے مختلف و متفاوت ہے، اللہ پر ایسا بہتان لگانا ہے جس سے بدتر بہتان شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح تیرے سوال کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے اور آج کل کے مسلمان بالعموم میں سمجھتے ہیں کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف ائمہ ہی ہے کہ وہ اس کی پوجا کر لیا کرے اور کچھ مسائل غسل و طهارت اور چند مخصوص حدود حلال و حرام کی پابندی کر لے۔ اس سے آگئے نہ اللہ کا کوئی مطالبہ ہے اور نہ اس سے کچھ بحث کہ آدمی زندگی کے وسیع تر معاملات میں اپنے نفس کے قوانین کی پیدائی کرتا ہے یا ان شیاطین جن و انس کے احکام کی جو اس کی وسیع نیشن پر مسلط ہو گئے۔ مگر یہ جواب موجودہ زمانے کے دنیا پرستوں کے لئے خواہ کتنا ہی اطمینان بخش ہو اور خواہ "الدین یسر" اور "ما جعل عليکم فی الدین من حرج" کا یہ فشار قرار دے کر وہ اپنے لئے اس سے کتنی ہی سوتیں پیدا کر لیں، بہر حال یہ تصور عبادیت و بندگی کے تصور کی قطعی نفی ہے۔ بندگی کا شاید اس سے زیادہ سمجھہ انگیز مفہوم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ بندہ چوبیں گھٹنوں میں سے دو گھٹنوں کے لئے بندہ ہو اور باقی اوقات میں آزاد، یا صرف آقا کو سلامی دے دینے پر اس کی بندگی ختم ہو جائے اور پھر سارے کام اسے اپنے یا دوسروں کے فشار کے مطابق کرتے رہنے کی آزادی حاصل ہو۔ پھر وہ خدا تو ہرگز خدا مانے جانے کے قابل نہیں ہے جو ایک طرف اپنے آپ کو انسان کا خالق اور رب بھی کہتا ہو اور دوسری طرف پورے انسان کو چھوڑ کر صرف اس کے ایک نہایت ہی قلیل اور غیر اہم جزوں تک اپنے آقاگی و فرمائی روائی کو اس کی بندگی و غلامی کو محدود رکھنے پر راضی ہو جائے۔ کوئی بات اپنے بیٹے پر اپنی پدر رانہ حیثیت

کو، کوئی شوہر اپنی بیوی پر شوہرانہ حیثیت کو، کوئی حاکم اپنی ملکت اور اپنی رعایا پر اپنی حاکمانہ حیثیت کو اس حد تک محدود کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہ چند مراسم اطاعت و وقار ازی ادا ہو جائے کے بعد پوریت اور شوہرت اور حاکیت کا مخففاً پورا ہو جائے اور پھر بیٹھ کو اختیار ہو کہ جس جس کو چاہے اپنا باپ بناتا پھرے اور عورت کو اختیار ہو کہ جس جس کے لئے مناسب سمجھے وجہ سکون بنتی پھرے، اور رعایا کو اختیار ہو کہ جس جس کے قانون کی چاہے ہیروی کرے، جس کو چاہے لیکس دے اور جس کے احکام کی چاہے اطاعت کرتی رہے۔ مگر یہ خدا آخر کیسا خدا ہے کہ جو انسان سارا کا سارا اس کی تخلق اور اسی کا پروردہ ہے اور اسی کے مل پر قائم و موجود ہے، اس پر وہ اپنی آقا کی کو محدود کر لینے اور اس سے بندگی کی چند رسی باتیں قبول کر کے اسے خود عماریا ہر ایک کی غلامی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دینے پر راضی ہے؟

دین اور نبوت اور تقاضائے عبادت کے یہ تصورات اگر صحیح نہیں ہیں، اگر فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا دین انسان کی ساری اجتماعی و انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اگر خدا کا مطالبہ اپنے بندوں سے لکھا ہے کہ وہ ہر حیثیت سے اس کے قانون کے ہیرو اور اس کی ہدایت کے متبوع ہو کر رہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اس بحق نظام زندگی کو قائم کرنے کی دعوت دیں اور اسی کی احتمت کے لئے سعی کریں جو خدائے واحد کی اطاعت پر منی ہو، تو کسی معقول آدمی کے لئے یہ حلیم کرنا سخت مشکل ہے کہ سارے نبیوں میں سے تنہ ایک حضرت یوسف علیہ السلام علی ایسے انوکھی حرم کے نبی تھے جن کے پردیں اللہ کو قائم کرنے کی سعی کے نجایے یہ خدمت کی گئی تھی کہ دین الملک کے تحت وزارت مال کی نوکری کریں اور اسی طرح کوئی معقول آدمی

ان دو مختلہ باتوں کو بھی ہام مظہن نہیں کر سکا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف و غرب کے غیر اسلامی قام میں دین حق کی احتمت کے لئے چد و چد بھی فرمائے ہے اور دوسری طرف آپ کے نزدیک جیش کا غیر اسلامی قام اس درجہ بحق بھی قسا کر ایک مسلم جماعت کے لئے وہ ایک مناسب جائے قیام ہو سکتا تھا۔ جو لوگ دین کو ایک معقول و مناسب قام لگر کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو مختصر اور ایک دوسرے سے بے تعلق اجزاء کا مجموعہ سمجھتے ہیں، ان کے لئے تو یہ بہت آسان ہے کہ انہیاء کے ملالات زندگی "قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و ادامر کو کوئے بخوبی کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جزو دوسرے جزو سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کر لے۔ لیکن اس دین کو ایک حکیم کے ہاتھے ہوئے مرتب و مربوط اور مناسب قام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لئے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو اور ہر جزو کی دعیٰ تفسیر و تاویل اختیار کریں ہو کلی قام کے مذاق سے مناسبت رکھتی ہو اور کسی ایسی تعبیر کو، خواہ وہ کیسے عیا ہوئے علاوه کی طرف سے پیش کی گئی ہو، قول نہ کریں جس سے اس دین کے اندر تناقض اور اس کی تعلیمات اور انہیاء علیم السلام کے کاموں کے درمیان تصادم لازم آتا ہو۔

اب ہم سورہ یوسف کے ذریعہ بحث مذہات اور بہرث جہش کے واقعات سے برآہ راست بحث کریں گے۔

### قصہ یوسف علیہ السلام سے نظر استدلال

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طریقے سے سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس کے کے نبوت سے سرفراز ہوتے۔ اپنے بھائیوں کی خداری اور ایک تجارتی قافلہ کی خیانت کی بدولت عزیز مصر کے ملوك ہو چکے تھے۔ اس ملوكیت کے زمانے میں، یا اس

کے بھروسہ کہ آپ قبہ کے جانے کے شے، آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا  
ضیب عطا کیا گیا۔ اظہب ملکی ہے کہ یہ سر فرازی قیدی عی کے  
ذمہ میں ہو گی، کیونکہ قید ہونے سے پہلے آپ کے کلام کا انداز پتھرانہ  
شان کا نہیں بلکہ صرف ایک مرد صالح کا سافر آتا ہے۔ اس  
حالت میں جب آپ نبوت نے سر فراز ہوئے تو آپ نے معا" اپنی پتھرانہ  
دھوت کی ابتداء کر دی اور ساتھ کے قیدیوں عی کو اس چیز کی طرف بلانا شروع  
کر دیا جس کے لئے آپ ہامور ہوئے تھے، اس دھوت کا خلاصہ سورہ یوسف  
رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلع کر کے آج بھی ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے  
کہ ان کا بلاوا "ارباب متفرقون" کی بندگی کی طرف نہیں تھا، بلکہ ایک رب کی  
بندگی کی طرف تھا اور وہ بار بار اہل مصر پر یہ واضح کرتے رہے تھے کہ جس  
پادشاہ کو تم نے رب ہمارا کہا ہے وہ میرا رب نہیں ہے، بلکہ میرا رب اللہ ہے  
اور جس ملت کی میں یہودی کرتا ہوں وہ اللہ عی کی بندگی سے عبارت ہے۔ یہ  
تلخی جو وہ قید خانہ میں کر رہے تھے، اس کے دوران میں یہاں ایک یہ صورت حال  
پیش آئی کہ دیانت و تقویٰ اور حکومت و بصیرت کے جو غیر معمولی نشانات ان کی  
ذات سے ظاہر ہوئے تھے، فرمیں روائے میران سے حاثر ہو گیا اور اس حد  
تک حاثر ہوا کہ اُنہیں یہ موقع ہو گئی کہ اگر وہ سلطنت کے پورے اختیارات  
اس سے مانگیں تو وہ انہیں دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کے  
مامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ کہ وہ اسلامی انقلاب کے لئے دھوت عام،  
جدوجہد، کلمش اور جگ کے طویل عمل عی کو اختیار کریں، جو عام حالت میں  
اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ کہ وہ اس موقع کو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت  
سے ان کے ہاتھ آگیا تھا، استعمال کریں اور عقیدت مند پادشاہ سے جو اختیارات  
مل رہے تھے، انہیں لے کر ملک کے نظام مگر و اخلاق اور نظام تحریک و سیاست  
کو بدلتے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت ان کو عطا کی تھی اس کی بناء

پرانوں نے پہلے راستے کی بہ ثبت دوسرے راستے کو اپنے مقصد کے لئے مفید تر اور اپنی حزل مقصود سے قریب تر سمجھا اور اسے اختیار کر لیا۔

یہ غیر اسلامی نظام کی توکری نہیں تھی جو پیٹ پالنے کے لئے، یا ذاتی جادو حزلت کے لئے، یا نظام فاسد کے جزوی مصالح کے لئے کی گئی ہو، بلکہ یہ ایک تدبیر تھی جو اسی ایک مقصد کے لئے اختیار کی گئی تھی جس کے لئے تمام انجامات علیم السلام کی طرح حضرت یوسف علیہ السلام بھی مبouth ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے اسے محض توکری سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظام اسلامی کے قیام کے لئے اس کو ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس غرض کے لئے حاصل کیا تھا کہ کافرانہ نظام بدستور قائم رہے اور وہ اس کے تحت بس فائناں مشرکی خدمت انجام دیتے رہیں، ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا مرتبہ موجودہ حکومتوں اور ریاستوں کے تختواہ دار ملازموں سے کچھ بھی بلند نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اتنا بلند بھی نہیں جتنا ہمارے اس ملک میں کانگریسی وزارتوں کا مقام ثابت ہوا ہے۔ جن کا طرز عمل تمام ملک دیکھ چکا ہے کہ جب تک انہیں اپنے مقصد (آزادی ملک) کے لئے وزارت کے مفید ہونے کا یقین نہ ہو گیا، انہوں نے اور ان کے کسی گرے پڑے شخص نے بھی وزارت قبول کرنے کا خیال تک نہ کیا اور پھر جب وزارتیں قبول کیں تو یہ دیکھ کر کہ فی الواقع جو ہر اقتدار (Substance of Power) ان کی طرف منتقل نہیں کیا گیا ہے، انہوں نے تمام وزارتوں کو لات مار دی۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اختیارات بادشاہ سے مانگنے مگنے تھے یا اس سے چھیننے مگنے تھے، اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بر سر اقتدار آتے ہی بادشاہ معزول کر دیا گیا یا تخت سلطنت پر قائم رہا۔ اصل اہمیت جو چیز رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو منصب طلب کیا تھا وہ آیا کافرانہ نظام کو چلانے کے لئے اور اس کی ملازمت

قول کرنے کی خاطر کیا تھا یا اپنے مقصد بحث یعنی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی خاطر دوسرا چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ آیا فی الواقع ان کو ایسے اختیارات ملے تھے یا نہیں جن سے وہ ملک کے نظام میں تبدیلی کرنے کے قابل ہو سکتے؟ ہمارے نزدیک دین اور نبوت کے پورے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کے مطالبہ "اجعلنی علی خزانِ الارض"<sup>۱</sup> کا مقصد نظام اسلامی کا قیام سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خزانِ الارض کے مطالبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ملک کے تمام ذرائع و وسائل خزان کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ (Resources) ان کے ہاتھ میں دیئے جائیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ خزان کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ مالیات کے معنوں میں نہیں آیا ہے۔ قرآنی تعلیمات کا تفہیج کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس لفظ کا مفہوم وہی ہے جو "ذرائع و وسائل" کا مفہوم ہے، اور ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں کسی ملک کے تمام ذرائع و وسائل کا ہونا اور اس کا ملک کے تمام پیدا و سیاہ پر معرف ہو جانا، دونوں بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی بات کی تصدیق بائیبل سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں بصرافت یہ بیان ہوا ہے کہ فرعون مصر صرف برائے نام باادشاہ رہا۔ ورنہ تمام ملک عملاء" حضرت یوسف علیہ السلام کے زیرِ نگرانی ہو گیا۔<sup>۲</sup>

"ثلا" آیت وللہ خزانِ السعوت والارض (منافقون : ۷) ولن من شی ع الا عندنا خزانہ (آل عمران : ۲۱) ام عندهم خزانہ ربک (طهور : ۳۷) وقلال الذین فی النار لخزنة جهنم (مومن : ۲۹)

<sup>۱</sup> بائیبل میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرعون کی جو مفہوم نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :-

”وَ فَرْعَوْنَ نَفَرَ أَبْشِرَ خَلْدُونَ سَعَى كَمَا كَهْ هُمْ كَوْ آدِي جِسَا يَهُ هُبْ جَدَا  
كَيْ رَدْجَهَ هُبْ تَكَاهَهُ؟ أَوْ فَرْعَوْنَ نَفَرَ يُوسُفَ سَعَى كَمَا جَوْكَهْ خَدَانَهَ تَجَهَهَ يَهُ سَبْ كَهْ  
دِيَاهَهُ، اَسَ لَهَهَ تَجَهَهَ مَهْدَ دَافَلَهَ دَرَهُ أَوْ حَلَهَ مَهْدَ كَوْيَيَهُ نَسِيَهُ۔ سَوْ تَمِيرَهَ مَهْرَ كَاهَارَهُ  
هَهَا أَوْ مَهْرَيَ سَارِي رَعَالَا تَجَهَهَ حَمَهُ پَطَلَهُي۔ صَرَفَ تَحْتَ كَامَلَكَهُ بَوْنَهَ كَهْ سَبْهَهَ  
مَهْ بَزَرَگَهُ تَهُونَهُهُ اَوْ اَسَ لَهَهَ سَارَهَ مَلَكَهَ مَصَرَهَ كَاهَمَهُ بَهَا دِيَاهَهُ اَوْ فَرْعَوْنَ نَفَرَ  
يُوسُفَهَ سَعَى كَما مَيَهُ فَرْعَوْنَهُونَهُ اَوْ تَجَهَهَ حَمَهُ كَهْ بَهْرَيَهُ كَوْيَيَهُ آدِي اَسَ سَارَهَ مَلَكَهَ مَصَرَهَ  
اَپَاهَا تَهَهَ پَادَهَهَ بَلَانَهَهَ نَهَهَ پَانَهَهَ کَهُ۔“

(بِدَائَشُ، بَابُ ۴۱، آیَتٌ ۳۸ تَا ۳۹)

خط کشیدہ فقرے صحیح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کا  
عقیدت مند ہو چکا تھا اور اگر اس نے آپ کی نبوت تسلیم نہیں کی تھی تو وہ پہلی ہی  
ملاقات میں انہمان لانے کے قریب صحیح چکا تھا۔ پھر اس کے سات آٹھ برس بعد جب  
حضرت یوسف کے بھائی مصر پہنچتے ہیں تو حضرت یوسف ان سے کہتے ہیں ”میں تم نے  
نہیں، بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے گویا فرعون کا باپ اور اس کے سارے  
مکر کا حاکم بنا دیا۔ سو تم جلد میرے باپ کے پاس جا کر اس سے کوئی تیرا بیٹا یوسف ہوں  
کتا ہے کہ خدا نے مجھے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا ہے۔“

(بِدَائَشُ، بَابُ ۲۵، آیَت٤٨ تَا ۴۹)

اب رہایہ دعویٰ کہ حضرت یوسف کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی  
ملک میں سکہ تو دین الْمَلَكُ ہی کا روای رہا جیسا کہ آیت ”مَا كَانَ لِيَا خَذَ الْخَادِهِ فِي  
دِيَنِ الْمَلَكِ“ سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ ڈھن دھن کر  
لئی جائیں کہ عام طور پر اس آیت کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔  
حرث عین اس کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الْمَلَكِ کے  
تحت اپنے بھائی کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ یوسف  
کا کام یہ نہ تھا، یا یوسف کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے بھائی کو دین الْمَلَكِ

کے تحت پڑتا۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس محاورے کا مفہوم عدم قدرت نہیں، بلکہ عدم موزونیت و عدم مناسبت ہی ہے۔ شہادت "ما كان الله ليطلعكم على الغيب" (آل عمران: ۱۷۹) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تم کو غیب پر مطلع نہیں کر سکا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے۔ اعلیٰ طرح ما كان الله ليضيع ايمانكم (آل بقرہ: ۱۳۳) فما كان الله ليظلمهم (التوبہ: ۷۰) اور ما كان الله ليذر المؤمنین على ما انتقم عليهم (آل عمران: ۱۷۹) میں اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ ذکر ہے کہ ظلم اور اخاعت ایمان اور مومنین و منافقین کو خلط ملٹط چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کا طریقہ نہیں ہے اور خود سورہ یوسف میں اس آیت سے پہلے ایک مقام پر جو ارشاد ہوا ہے، 'ما كان لمن نشرك بالله من شئن ع' (یوسف: ۳۸) تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں۔" پس آیت زیر بحث کو بھی یہ معنی پہنانا صحیح نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کے تحت اپنے بھائی کو مگر فارغ نہیں کر سکتے تھے، بلکہ قرآنی استعارات کو محوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو مگر فارغ کرنا یوسف علیہ السلام کے ثایان شان نہیں تھا۔ البتہ اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحب اقتدار ہونے کے باوجود غیر اسلامی قانون تعزیرات کم از کم سات آنٹھ برس بعد تک (جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی وہاں پہنچے تھے) ملک میں نافذ تھا۔ لیکن اس کے متعلق اس سے پہلے بھی ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے نظام تدن کو ایک رات کے اندر کلی طور پر تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور اسلامی انقلاب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اقتدار ہاتھ میں آتے ہی جاہلیت کے تمام قوانین و رسوم کو یک لخت بدل

ڈالا جائے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ملک کے قائم تمدن کو کلی طور پر تبدیل کرنے میں پورے دس برس لگے تھے۔ لہذا حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں چند سال تک غیر اسلامی قانون تعزیرات یا اس کے ساتھ کچھ دوسرے غیر اسلامی قوانین بھی جاری رہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالتا درست نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر خدائی قوانین کا اجراء سرے سے تھا یعنی نہیں اور وہ کافرانہ قوانین ہی ملک میں برقرار رکھنا چاہئے تھے۔

### ہجرت جہش سے غلط استدلال

اب بحث ختم کرنے سے پہلے ذرا ایک نظر ہجرت جہش کے مسئلے پر بھی ڈال لیجئے۔

اس معاملے کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جہش میں ایک غیر مسلم حکومت قائم تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہاں بھیج دیا تاکہ اس کی رحمت بن کر رہیں، پھر صحابہ کرام وہاں غیر مسلم بادشاہ کے وفادار بن کر رہے کیونکہ انہیں اس کے ماتحت عقیدے اور پوچا کی آزادی حاصل تھی، اور جب ایک ہمسایہ بادشاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو انہوں نے اس کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگیں۔ لیکن یہ واقعات کی بالکل غلط فتوحہ کشی ہے۔

۱۔ اول تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو جہش بھیجا تھا اسی وقت آپ کو اس امر کا اندازہ تھا کہ نجاشی صالحین نصاریٰ میں سے ہے، چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ نے مهاجرین سے اس کی محکمت کے متعلق فرمایا تھا وہیں ارض صدق۔

۲۔ دوسرے، مهاجرین کو وہاں بھیجنے کی غرض یہ نہ تھی کہ وہاں کی رعایا بن کر رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مهاجرین کی ہجرت کا مشورہ دیتے

وقت یہ فرمایا تھا کہ لو خرجمت الی ارض الجبشتہ حتی یجعل اللہ لكم فرجا و مخرجہ۔ ”کاش تم لوگ جس کی طرف چلے جاتے یہاں تک کہ اللہ تمہارے لئے کوئی صورت نکالے۔“ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ جو مسلمان سکھش کے اس مرطے میں اپنی قوت برداشت سے زیادہ مصائب کے شکار ہو رہے تھے ان کو آپ نے عارضی طور پر ایک الی چمچ دیا جماں اس قسم کے مصائب کی توقع نہ تھی اور مقصود یہ تھا کہ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ لوگ وہاں سے واپس آ جائیں۔ اس کو نظیر بنا کر یہ نتیجہ نکالنا آخر کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی غیر مسلم حکومت میں عقیدہ اور پوجا کی آزادی حاصل ہو تو یہ اس کے تحت ان کے وفادار رعیت بن کر رہ چلنے کے لئے کافی ہے اور اس کے آگے کچھ اور مطلوب نہیں ہے۔

۳۔ پھر جب مهاجرین وہاں پہنچے اور کفار کمہ نے نجاشی سے ان کو واپس مانگنے کے لئے اپنا وفد روانہ کیا اور حضرت جعفر اور نجاشی کے درمیان مکالہ ہوا تو محمد بن اور اہل سیرت کی متفقہ روایت کے مطابق نجاشی نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اس عقیدے کی تصدیق کی جو قرآن میں بیان ہوا ہے، بلکہ مزید برآں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار بھی کیا۔ اس کے بعد نجاشی کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ امام احمد نے عبد اللہ بن مسعود رضوی کے حوالہ سے (جو اس واقعہ کے بیٹھنی شاہد ہیں) نجاشی کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ اس نے کہا مرحبا بكم ولعن جثتم من عنده اشهد انه رسول الله وانه الذى نجد فى الانجيل وانه الرسول الذى بشربه عيسى ابن مريم۔<sup>۱</sup> کیا یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں۔ بیانی میں خود عمرو بن العاص سے (جو مهاجرین کو واپس لانے کے لئے کفار کمہ کی طرف سے جوش بھیجے گئے تھے) یہ الفاظ مروی ہیں کہ انہوں نے آکر اہل کمہ کو جو روپورث دی وہ یہ تھی کہ ان اصحابہ میزغم

ان صاحبکم نہیں۔ اسکے نجاشی بیان کرتا ہے کہ تمara ساتھی نہیں ہے۔ کیا کوئی شخص نہیں اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر کے بھی غیر مسلم قرار پاس کا ہے۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت نبوی میں حضرت عمرو بن العاص کے قول اسلام کا جو تصدیق کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول نجاشی عیسیٰ کی تبلیغ نے ان کے دل میں ایمان پیدا کیا تھا اور صلح حدیبیہ سے پہلے وہ نجاشی عیسیٰ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر چکے تھے۔ اس موقع پر جو الفاظ اس نے حضرت عمرو بن العاص سے کہے تھے وہ یہ تھے کہ اطعنى واتبعه فانه والله لعلى الحق ولبيظهرن على من خالقه كما ظهر موسى على فرعون وجندوه۔ ”میری بات مانو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قول کر لو، کیونکہ وہ حق ہے ہیں اور وہ اسی طرح اپنے عمالین پر غالب آ کر رہیں گے جس طرح موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے شکریوں پر غالب آئے تھے۔“ علامہ ابن عبد البر نے استیحاب میں وہ خطبہ نقل کیا ہے جو نجاشی نے حضرت ام حمیہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عائبانہ نکاح پڑھاتے ہوئے دیا تھا۔ اس میں صاف طور پر یہ الفاظ موجود ہیں۔ اشهد ان محمدار رسول الله وانه الذي بشر به عيسى بن مریم۔ ”میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ کے رسول ہیں جن کی آمد کی خبر عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی۔“ ان سب سے بڑھ کر مفتود و معتبر وہ روایت ہے جو بخاری و مسلم

”خوش آمدید ہو تمارے لئے اور ان بکے لئے جن کے پاس سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجلیل میں پاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ ابن مریم نے دی ہے۔“

میں آئی ہے کہ نجاشی کی وفات کی خبر پا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور فرمایا ملت الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمة «آج ایک مرد صالح نے وفات پائی ہے، انہو اور اپنے بھائی اسمحہ کی نماز جنازہ پڑھو۔» اس کے بعد تو سرے ہے اس استدلال کی بناء ہی مشتمل ہو جاتی ہے جو بھرت جبھ کے واقعہ سے کیا جاتا ہے۔

---

## باب دوم

### اسلام کا سیاسی نظریہ

- بنیادی مقدمات
- نظریہ سیاسی کے اولین اصول
- اسلامی ریاست کی نوعیت
- نظریہ خلافت اور اس کے سیاسی مضمرات

ہندوستان میں مسلمانوں کی جدید سیاسی بیداری اپنے جلو میں نت نئے مسائل لائی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ مستقبل میں مسلمانوں کا سیاسی نظام کیا ہو؟ ہر مسلمان کی یہ دلی خواہش تھی اور ہے کہ اس کا اجتماعی نظام اسلام کی بنیادوں پر قائم ہو۔ لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا ملیہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے محبت توکرتے ہیں مگر اس کا صحیح فہم نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کے لئے جان دینے کو تو تیار رہتے ہیں مگر اسلام کے مطابق جینا نہیں جانتے۔

مسلمانوں کے ذہن کی اس حالت کو محسوس کر کے مولانا مودودی نے اسلامی نظام حیات کے بنیادی خدوخال کو مناسب تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ انتر کالمیٹ مسلم برادر ہڈ لاہور کے اجتماع منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پڑھا تھا۔ یہ دور تھا جب مسلمان ابھی تک اپنا کوئی واضح قومی مقصد متعین نہیں کر سکے تھے۔ مولانا نے اپنے اس مقالہ میں ملت اسلامیہ کو بتایا کہ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں۔ یہ ریاست کن مقاصد کے لئے قائم ہوتی ہے اور اس کے اساسی اصول کون کون سے ہیں۔

آنکہ صفحات میں سبی مقالہ نظر ٹانی کے بعد دیا جا رہا ہے۔ سکرار سے بچنے کے لئے اصل مقالہ کا وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے جس میں عملی پہلو کی طرف اشارے کئے گئے تھے۔ کیونکہ آنکہ آنکہ ابواب میں مصنف محترم کی دوسری چیزیں پیش کی جا رہی ہیں جن میں وہ مباحث زیادہ تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں۔

## اسلام کا سیاسی نظریہ

اسلام کے متعلق اس قسم کے فقرے آپ اکثر سننے رہتے ہیں کہ یہ ایک "جمهوری نظام ہے۔" "اسلام آمربت کا حامی ہے۔" "اسلامی سو شلزم کا علمبردار ہے۔" وغیرہ۔ پھر ملی صدی کے آخری دور سے اس قسم کے فعروں کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے مگر جو لوگ ان کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام کا نظام حیات کیا ہے اور اس میں جمورویت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے، یا عدل اجتماعی اور سیاسی احکام کے لئے اس نے کیا اصول وضع کئے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر اس پر جمورویت یا آمربت یا سو شلزم کا نام چھپا کر دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً عالمی قیادت پر فائز طاقتوں اور اپنے ممالک کے بر سر اقتدار لوگوں میں) جو چیز مقبول عام ہو اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اس یقین پر کی طرح سمجھنے ہیں جو ہلاکت سے بس اس طرح فتح کیا ہے کہ کسی پا اڑ بھض کی مررتی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً "ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محسن مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی پلٹے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جملک دکھادیں۔" اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلطہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ

لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹر شپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر، اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں اور کہنے لگئے کہ یہاں سارا نظام جماعت، ڈکٹیٹر شپ ہی پر قائم ہے۔ غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستان، ایک چوں چوں کا مریہ بن کر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھادی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ ہے کیا۔ اس طرح نہ صرف ان پر اگنده خیالیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور نہ صرف ان لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جمالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا۔" بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بحثکنے والی دنیا کے سامنے ایک الیک روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ خفت حاجت مند ہے، اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

(۲)

## بیانی مقدمات

سب سے پہلے یہ بات ذہن نہیں کر لجئے کہ اسلام محض چند منثور خیالات اور منثور طرق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے اركان سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدهے اور ضابطے مقرر کئے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، اور جڑوں سے تما، اور تمنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ہمざر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پاسکتے۔

## انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق دو باتیں قریب ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن ہی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی

خدا کی طرف سے آئے ہیں، ان سب کا بھی مشن تھا۔ دوسری یہ کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء بھی دنیا میں آئے ہیں ان کی آمد کا مقصد وحید خدا نے واحد کی خدائی منوانا اور صرف اسی ایک کی عبادت کرائا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لئے بظاہر یہ دونوں باتیں بالکل پیش پا اقتدارِ حقیقتیں ہیں۔ ہر مسلمان ان کو سن کر کے گا کہ یہ معلوم و معروف باتیں ہیں جنہیں ایک دینیاتی مسلمان بھی جانتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پروہ اٹھا کر ذرا آپ گمراہی میں اتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ شخص کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصر کیا تھا؟ صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر ان میں ایسی کون سی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الله غيره<sup>۱</sup> کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جماڑ کا کانٹا بن کر اس کو چھٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنا آج کل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدا نے واحد کے سامنے سجدہ کر لو اور بھر باہر لکل کر حکومت وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی غیر مشروط و فاؤادری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پر اتحاد کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مد اخلت کرتا۔

آئے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیهم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتیں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بلکہ بہت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی۔ اللہ کی ہستی کے مکر رہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہی پانی برساتا

ہے۔ وہی ہو اؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُل لِمَنِ الْأَرْضٍ وَمَنْ فِيهَا أَنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ طَقْلَ أَفْلَاطِ  
تَذَكَّرُونَ ○ قُلْ مَنِ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ○ سَيَقُولُونَ  
لِلَّهِ طَقْلَ أَفْلَاطِ تَذَكَّرُونَ ○ قُلْ مَنْ يَبْدِئُ مُلْكَوْتَ كُلِّ شَعَوْهُ وَيَجْزِي  
عَلَيْهِ أَنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ طَقْلَ فَانِي تَسْحَرُونَ ○

(المومنون: ۸۳: ۸۹)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، تاًو اگر تم  
جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے کو پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے  
پوچھو، ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں  
گے اللہ۔ کو پھر تم اس سے ذرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس  
کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے  
 مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکا؟ تاًو اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے  
کہ اللہ۔ کو، پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیجے گے ہو؟

وَلَقُنْ سَالِتَرِمْ مِنْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَسَخْرَ الشَّعْسَ وَالْقَمَرِ يَقُولُونَ  
اللَّهُجَ غَانِي يُوفِكُونَ

(عجوبت: ۷۱)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟  
اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے  
کہ اللہ نے۔ پھر آخریہ کدر بر بٹائے جا رہے ہیں؟

وَلَقُنْ سَالِتَرِمْ مِنْ نَزْلِ مِنْ السَّمَاءِ مَاءَ فَلَحِيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتَا  
لِيَقُولُنَ اللَّهُ طَ

(عجوبت: ۶۳)

اور اگر تم ان سے یہ پوچھو کر کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے  
مری ہوئی زمین کو روشنی دی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔

ولئن سالترم من خلقهم ليقولن الله هفاني يوفكون○

(الزخرف - ۸۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کر تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے  
کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کہ ہر بٹکائے جا رہے ہیں؟

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے  
خالق ہونے اور مالک ارض و سماء ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو  
خود ہی مانتے تھے۔ لہذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لئے تو انہیاء کے آنے  
کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیاء کی آمد کس لئے تھی  
اور جگڑا کس چیز کا تھا؟

قرآن کرتا ہے کہ سارا جگڑا اس بات پر تھا کہ انہیاء کرنے تھے، جو تمہارا اور  
زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور اللہ بھی ہے، اس کے سوا کسی کو اللہ  
اور رب نہ مانو۔ مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

آئیے ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جگڑے کی تھی میں کیا ہے؟ اللہ سے کیا مراد  
ہے؟ رب کے کرنے ہیں؟ انہیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو اللہ اور رب  
مانو؟ اور دنیا کیوں اس بات پر ٹوٹنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

## اللہ اور رب کا مفہوم

اللہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبد کے ہیں۔ مگر معاف سمجھئے گا معبد  
کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبد کا مادہ عباد ہے۔ عباد بندے اور غلام کو کہتے  
ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام، جو زندگی، غلامی  
اور بندگی کی حالت میں بر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سر اسر عبادت ہے۔ خدمت  
کے لئے کمرا ہونا، احترام میں ہاتھ پاندھنا۔ اعتراف بندگی میں سرجھکانا، جذب

وفاداری سے مرشار ہونا، فرمان برواری میں دوڑ دھوپ اور نسی و جمد کرنا، جس کام کا اشارہ ہوا سے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اسے پیش کرونا، اس کی طاقت و جرودت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ ہمائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جماں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ حبادت کا اصل مفہوم ہے اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی حبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

اور "رب" کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرمان برواری کی جاتی ہے۔ لہذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہ لطف کے پھر جانے سے اپنی زندگی بہپا ہو جانے کا خوف کرے، جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرمان برواری اور اطاعت کرے۔ وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھئے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تمرا اللہ ہوں اور میں تمرا رب ہوں، میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آ کر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر امتحنا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں

<sup>۱</sup> ان دونوں اصطلاحوں کی مفصل تشریح کے لئے ملاحظہ ہو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" از سید ابوالاعلیٰ مودودی، مطبوعہ اسلامک ہیلی کیپٹر (پرائیویٹ) لائیٹل - لاہور

میں سکتی ہے۔ انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار یا خواہش اشتعاع اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بننے، ان سے اپنی بندگی کرائے، ان کے سراپنے آگے جھکوانے، ان پر اپنا حکم چلانے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے۔ جس کو کچھ طاقت یا دولت یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یعنی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے جانوروں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا یقوقف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکر جماوے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

### راست دعوے دار

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جھات ہوتی ہے یا جن کے پاس خدائی کے خواہش جمانے کے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً "ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے شکروں کے مل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا کہ انا ربکم الاعلى" (میں تمہارا سب سے اوپنچارب ہوں) اور "اعلمت لكم من الله غيری" (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی اللہ ہے)۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور اس سے کہا کہ تو خود بھی اللہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل مجھ دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہذا تم مجھ کو اللہ تسلیم کرو۔ لئن اتخذت الها غيری لا جعلنک من العسجونین" (اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبد بنایا تو میں تمہیں قید

کر دوں گا۔ اسی طرح ایک وہ پادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انسیں ذرا غور سے پڑھئے:

الْمُتَرَّالِيُّ الَّذِي حَاجَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ أَتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكًا إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ  
رَبِّيُّ الَّذِي يَحْيِي وَيَمْتَدِّ قَالَ أَنَا أَحْيُ وَأَمْتَدِّ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي  
بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَلَمْ يَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبِهِتَ الَّذِي كَفَرُ طَ

(بقرہ: ۲۵۸)

تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم علیہ السلام سے بحث کی اس بارے میں کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب کون ہے اور یہ بحث اس نے اس لئے کی کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے، تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لاء، یہ سن کر وہ کافر ہکا بکارہ گیا۔

غور کیجئے! وہ کافر ہکا بکار کیوں رہ گیا؟ اس لئے کہ وہ اللہ کے وجود کا منکرنہ تھا۔ اس بات کا بھی تاکل تھا کہ کائنات کا فرمازدا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے۔ بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً "سر زمین" عراق کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ سلطنت عراق کے باشندوں کا رب میں ہوں اور یہ دعویٰ اس ہباء پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و مترف تھا۔ اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے چاہئی پر لٹکا دے، اور جس کی چاہے جان بخشنی کر دے۔ یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ تم مجھے رب تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کماکہ میں تو اسی کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیونکر قابو میں لاوں۔<sup>۱</sup>

یہ خدا تعالیٰ جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ اُنہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرمان رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لئے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم عبودیت بجا لائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدا پیگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدعا تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمازوا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملتے تھے۔ چنانچہ سورج بُشی اور چند رُبُشی آج تک مشور ہیں۔ راجہ کو ان داتا یعنی رازق کما جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ حالانکہ پر مشور اور پر ماتنا ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پر جائی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمازدواؤں کے لئے اللہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اپرست وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خداوندی پکے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں اللہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقدار، اس فرمازدائی و حکمرانی، اس آقاکی خداوندی کو قائم کرتے ہیں جسے فرعون اور

<sup>۱</sup> اس مضمون کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔" مطبوعہ اسلامک جلکی کیٹری (پرائیویٹ) لائنز، لاہور۔

نمرود نے قائم کیا تھا، دراصل وہ الہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں اور وہ سب لوگ جوان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہر حال ان کے الہ و رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

## ۲۔ بالواسطہ دعویدار

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الیت اور ربویت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لے کر اٹھیں اور اسے منوالیں، البتہ چالاکی اور فریب کاری کے اختیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں، سوان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح، کسی ریوتا، کسی بٹ، کسی قبر، کسی سیارے یا کسی درخت کو الہ بنا دیتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں۔ یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارے ولی اور محافظ اور مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمہیں تقط اور بیکاریوں اور مصیبتوں میں جلا کر دیں گے۔ انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے، مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں۔ لہذا ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان، مال، آبر و سب کچھ دے دو۔ بہت سے یہ تو ف انسان اس جاں میں پھنس جاتے ہیں اور یوں جھوٹے خداوں کی آڑ میں ان پر وہ توں اور پچاریوں اذر مجاہروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

ای نو ع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعلیم گندوں اور منتروں کے دلیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے،

اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں۔ عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر نہ ہی رسم ہمارے ہاتھوں سے انعام پائے گی۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل ہیں جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کر دیتے ہیں۔ یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بن لیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس بربمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیاست کا سکر جما رکھا ہے۔

### فقہ کی جڑ

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں فقہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ پالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتداء ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے ذہریلے جیشے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے، مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربے سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح مکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو اللہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا اللہ اور رب نہ ہو۔ اگر اللہ کونہ مانے گا تب بھی اسے اللہ اور رب سے چھکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے اللہ اور ارباب اس کی گردن پر سلط ہو جائیں گے۔ آج بھی آپ جد ہر نگاہ ڈالیں گے یہی نظر آئے گا کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم کی اللہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا اللہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ کہیں قومی ریاست خدائی کے مقام پر بر اجمن ہے اور کہیں کوئی ڈیکٹیٹر ما

عِلْمٌ لَكُمْ مِنَ الْهُنْدِ غَيْرِيٌّ<sup>۱</sup> کی منادی کر رہا ہے انسان کسی ایک جگہ بھی اللہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم طرف آدمی کو پولیس کمشنر بنادیئے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنادیئے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوٹی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتقام، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ انسان کے دل و دماغ پر، اس کی پیدائشی قوتیں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر ہی رہیں، جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا۔ کس قدر بچ فرمایا اس صادق و مصدق علیہ وعلیٰ آلہ والصلوٰۃ والسلام نے:

قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنِّي خَلَقْتُ عِبَادَى حَنْفَاءَ فَجَاءُتِنِي الشَّيْطَانُ فَلَمَّا جَاءَتِنِي هُمْ  
مِنْ دِينِنِهِمْ وَحَرَمْتُ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ

(حدیث قدسی)

الله عز وجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، انہیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیتوں کی اصل جگہ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے۔ یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فلسفی قوتیوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی میشنا کو اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دل کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے یہ نہیں کہ انسان بسارے ارباب اور تمام البوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا اللہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لئے نہیں ہے کونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ البوں اور ارباب سے چھکارا نہیں پاسکتا۔

### انبیاء کا اصل اصلاحی کام

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ تھے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداوؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گردیئے گئے ہیں انہیں ابھار کر اس حد تک اٹھالائیں اور سب کو ایک اپیے عادلات نظام زندگی کا پابند ہنادیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہونہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے ہیں جائیں۔ ابتداء سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیام تھا اور وہ یہ تھا۔ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من اللہ غیرہ۔ ”لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا اللہ نہیں ہے۔“ یہی

حضرت نوح عليه السلام نے کہا۔ یہی حضرت ہود علیہ السلام نے کہا۔ یہی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا۔ یہی حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا۔ اور اسی کا اعلان محمد علی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے:

انما انما مذکور و ما من الا الله الـواحد القهار رب السموات والارض وما

بینهما۔

(ص: ۶۵-۶۶)

میں بس ایک متنبہ کرنے والا ہوں۔ کوئی اللہ نہیں ہے جو اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس جگہ کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

ان ربکم الله الذي خلق السموات والارض ..... والشمس والقمر  
والنجوم مسخرات بأمره الا الله الخلق والامر ط (اعراف: ۵۲)

"یقیناً" تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو ..... اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! مغلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی۔

ذالکم الله ربکم لا الا هو خالق كل شيء عفأعبدوه وهو على كل شيء عوكيل (انعام: ۱۰۲)

وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

وما امرنا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء۔ (البيت: ۵)

لوگوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ جو اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے، یہ سو ہو کر۔

تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به

شیئاً و لَا يَتَخُذ بعضاً بعضاً ارْبَاباً مِنْ دُونِ اللَّهِ۔ (آل عمران: ٤٣)

آؤ ایک الگی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں اور خدا کی میں نہ کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کر دیا جن میں وہ جائز ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَيَضْعُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (سورہ اغراف: ۱۵۷)

یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاثرا ہے جن میں وہ کے ہوئے تھے۔

(۲)

## نظریہ سیاسی کے اولین اصول

انجیاء علیم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز دھور، اس کی روح اور اس کا جو ہریکی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریہ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سمجھ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بناوے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً "فرداً" اور مجتمعاً "سلب کرنے جائیں، کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں، وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

النَّحْكُمُ إِلَّا اللَّهُ طَاطِرُ الْأَتْعِيَّنُوا إِلَّا إِيَّاهُ طَذَالِكُ الدِّينُ الْقِيمُ

(یوسف: ۳۰)

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

يَقُولُونَ هَلْ لِنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ عَطَقْلَ إِنَّ الْأَمْرَ كَلَهُ لِلَّهِ

(آل عمران: ۱۵۳)

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کوئی کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَلَا تَقُولُوا إِعْتَصِفُ الْكَنْبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ

(النحل: ۱۰۶)

اپنی زبانوں سے یونہی نسل سلطنت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (ماکدہ: ۲۲)

جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل کافر ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (Law Giver) صرف خدا ہے۔ اس کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔ ان اتیع الا مَا يُوحَى إِلَيْهِ (انعام: ۵۰) ”میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر دھی کیا جاتا ہے۔“ عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيَطَّاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (الشاعر: ۶۳)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (Sanction) کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوَّةَ (انعام: ۸۹)

یہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب دی۔ حکم (Authority) سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُوتَّيْهِ اللَّهُ الْكِتَابُ وَالْحُكْمُ وَالنَّبُوَّةُ ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عَبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكُنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ (آل عمران: ۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم رب ای بنو۔

پس اسلامی ایشیت کی ابتدائی خصوصیات جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے  
نکلتی ہیں یہ ہیں:

- ۱۔ کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ بلکہ ایشیت کی ساری آبادی مل کر بھی  
حاکیت کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اعلیٰ (Sovereign) صرف خدا ہے،  
اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔
- ۲۔ قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔  
سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لئے کوئی قانون بناسکتے ہیں اور نہ خدا کے  
بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔
- ۳۔ اسلامی ایشیت بہر حال اس قانون پر قائم ہو گا جو خدا کی طرف سے اس  
کے نہیں نے دیا ہے۔ اور اس ایشیت کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس  
حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہو گی کہ وہ خدا کے قانون کو  
نافذ کرنے والی ہو۔

(۳)

## اسلامی ریاست کی نوعیت

ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ مغربی طرز کی لادینی جمورویت (Secular Democracy) نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے جمورویت تو نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکیت اعلیٰ حاصل ہو۔ انہی کی رائے سے قوانین بینیں اور صرف انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں وہ کتاب آئین میں سے محور کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں ایک بالآخر بنیادی قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ سے ریتا ہے جس کی اطاعت ریاست اور قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ لہذا اس معنی میں اسے جمورویت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "اللہ حکومت" ہے جس کو انگریزی میں (Theocracy) کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکری سے واقف ہے اسلامی تھیاکری اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیاکری سے واقف ہے جس میں ایک خصوص مذہبی طبقہ (Priest-Class) خدا کے نام سے خود اپنے ہائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے۔<sup>۱</sup>

<sup>۱</sup> عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت مرے سے تھی عی نہیں۔ لہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین ہاتے تھے اور یہ کہ کرانہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین يكتبون الكتب باید یہم ثم یقولون هذامن عند الله (آل عمرہ: ۷۹)

اور عملاء" اپنے خدا کی عام باشندوں پر سلطنت کر دیتا ہے۔ الگی حکومت کو تو الفی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو "Theo-Democracy" لیعنی "الفی جموروی حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکیت عطا کی گئی ہے۔ اس میں انتظامیہ (Limited Popular Sovereignty) اور مقنہ (Legislature) اور مختار (Executive) مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے خلاف ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ سائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الفی قانون جہاں تغیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تغیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، جہاں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم موجود ہو، وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی مقنہ کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سر موڑ ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیا کسی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریع کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں، اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے

انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ خدا کی الیت انسان کو عقل و مگر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلماڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد لادینی جمیوریت، جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکیت (Popular Sovereignty) ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھیے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی ایٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی حاکیت چند مخصوص لوگوں کے پرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے اور چونکہ سوسائٹی اخلاق اور امانت و دیانت کی نعمتوں سے محروم ہے اور ان تصورات کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتی، اس لیے اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے یقینوں بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے دوست ہی سے ان کے اللہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے مخصوص اور طبقاتی فائدے کے لئے قوانین بناتے ہیں اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے، ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے، یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو جمیوریت کی جنت ہونے کا دعویٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجزیہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں

دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (Judgement) "عموماً" یک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لائگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے بلکہ بسا اوقات عقلی اور علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں روکر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition Law) کی مثال پیش کروں گا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے اور انسانی تہدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی خواہشات کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے دوست ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔<sup>۱</sup>

مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے دوست سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پیں۔ پہلے سے کئی گناہ زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے دوستوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔<sup>۲</sup>

یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بننے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاکیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی گئی۔ اپنی خواہش کو اپنا اللہ بنالیا تھا اور اس اللہ کی بندگی میں وہ اس قانون کو بدلنے پر مصروف تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی

<sup>۱</sup> یہ قانون ۱۹۱۸ء میں امریکی کانگرس نے پاس کیا تھا۔ مرتب

<sup>۲</sup> یہ تختیخ ۳ دسمبر ۱۹۳۳ء میں واقع ہوئی۔ مرتب

حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضح قانون (Legislator) بننے کی پوری الہیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلائی خواہشات کا بندہ بن جائے گا اور اپنے نفس کے شیطان کو الہ بنا لے گا۔ لہذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مقاد میں مناسب حدیں لگادی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں ”حدود اللہ“ (Divine Limits) کہا جاتا ہے یہ حدود زندگی کے ہر شعبہ میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبہ کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ ان کا نشانی یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں، ان کے اندر رہ کر تم اپنے بر تاؤ کے لئے مخفی اور فردی ضوابط (Regulations) ہا سکتے ہو، مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تھیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کر دے گے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مخصوصیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوئے اور سے کی ممانعت، وراثت کا قانون اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگادیئے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal Liberty) نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈیٹیشنری پر مشتمل ہوئی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (Family Life) میں اللہ تعالیٰ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر، بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلخ کے احکام، تعداد ازدواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزا میں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی تحریک تھیک تھیک محمد اشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لئے ہاتھ کائیں کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود، اور ایسے چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے بیشہ کے لئے بند کر دیئے ہیں۔

میرے لئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابل تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنایا کہ انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح آزادی کو سلب اور اس کی عمل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول ہمیلوں میں بھلک نہ جائے، اس کی قوتیں خلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاج و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے ویکھا ہو گا کہ پرچم پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسرا طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے

کہ مسافر غلطی سے کھٹکی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! اور اصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پنج، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے ہاتا جائے کہ تیرا راستہ ادھر نہیں ادھر ہے، تجھے اس رخ پر نہیں اس رخ پر مرتبا ہانے، مگر تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتے۔ بنی یہی مقصد ان حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پنج عقام، ہر موڑ اور ہر دورا ہے پر اسے ہاتا تی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تجھے ان سمتیوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہئے۔

خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو بعض مغربیت زدہ مسلمان ملکوں کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لئے اٹھ دستور ہے۔ اسلامی ریاست جب بنے گی اسی دستور پر بنے گی۔ جب تک قرآن اور سنت رسول ﷺ دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہتا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

### اسلامی ریاست کا مقصد

اس دستور کی حدود کے اندر جو ریاست بنے اس کے لئے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے اور اس کی شریع قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

لقد أرسلنا رسالنا بالبينات و أنزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس  
بالقسط و أنزلنا الحميد فيه باس شيد ومنافع للناس۔ (الحمد: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اماری ماکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا

اتما را جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آہت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت یا قوت قاہرہ (Coercive Power) ہے اور رسولوں کا کام یہ ہتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح پڑائیات اور اپنی کتاب میں جو میزان ان کو دی ہے، یعنی جس تحریک تحریک متوازن (Well Balanced) نظام زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (Social Justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا،

الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوة واتو الزکوة وامرروا بالمعروف

ونهوا عن المنكر۔ (انج: ۳۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں بھکن و حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا،

کفتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر

وتؤمنون بالله۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

## اسلامی ریاست کی خصوصیات

### (الف) ایجادی اور ہمہ گیر ریاست

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس ریاست کا تخلیق پیش کر رہا ہے، اس کا مقصد سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجادی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت

کرے اور ملکت کو یہروں حملوں سے بچائے، بلکہ اس بادشا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رانج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی ان تمام صورتوں کو مٹانا اور نیکی کی ان تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباو کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

اس نوعیت کی ریاست ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتی۔ یہ ہمہ گیر ریاست ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے معاقب ڈھالتا چاہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرانی یوں اور مخفی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ ریاست فاشتی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ ممائیت رکھتی ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس ہمہ گیریت کے باوجود اس میں موجودہ زمانے کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) ریاستوں کا ساریگی نہیں ہے۔ اس میں مخفی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک مرحدیں قائم کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدا نے حکیم و خیری وضع کر سکتا ہے۔

### (ب) جماعتی اور اصولی ریاست

دوسری بات جو اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاست

کو صرف وہ لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح تنقیح ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافی، لوکی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کر لے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس ریاست کو چلانے کے لئے ہائی گئی ہے۔ اور جو اسے قبول نہ کرے اسے ریاست کے کام میں دخیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ریاست کے حدود میں ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ لیکن بہر حال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک اصولی ریاست ہے جس کے ظلم و نسق کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔<sup>۱</sup>

یہاں بھی اسلامی ریاست اور کیونٹ ایٹھیٹ میں یک گونہ مہماںگت پائی جاتی ہے۔ لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو بر تاؤ اشتراکی جماعت کا ایٹھیٹ کرتا ہے اس کو اس بر تاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی ریاست کرتی ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں جو کیونٹ حکومت میں ہے کہ ظلمہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بعابر سلط کر دیا جائے، جائیدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ کر زمین کے جنم، سائبیریا کی طرف پیک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے

<sup>۱</sup> اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو باب سیزدهم

جو فیاضانہ بر تاؤ اپنی ریاست میں اختیار کیا ہے اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو ایک خط اختیاز کھینچا ہے انسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان کا طرق کار کیا ہوتا ہے۔

---

(۲)

## نظریہ خلافت اور اس کے سیاسی مضرات

اب میں آپ کے سامنے اسلامی ریاست کی ترکیب اور اس کے طرز عمل کی تھوڑی سی تشریح کروں گا۔ یہ بات میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے انھیں ان کی حیثیت کیا ہوئی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخوبی پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہئے۔ تھیک تھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کرتا ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَسْتَخْلِفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا  
اسْتَخْلَفُ الظَّالِمِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۵)

جو تم میں سے ایمان لا گئی اور نیک عمل کریں اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آئت اسلام کے نظریہ ریاست (Theory of State) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکیت کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکیت خدا کی ہے لہذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ

(Vicegerent) ہوئا چاہئے جو مخصوص تفویض کردہ اختیارات (Delegated Powers) استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنائے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے۔ وہ عمومی خلافت (Popular Vicegerency) ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فردا "فردا" ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ (کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیته<sup>۱</sup>) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتنہ نہیں ہے۔

### اسلامی جمہوریت کی حیثیت

یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی اصل بنیاد۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ ایک سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہو گی مخصوصی قابلیت اور سیرت کے اقتدار سے ہو گی۔ یہی بات ہے جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بصرخ بیان فرمایا ہے۔ صحیۃ الوداع کے موقع پر آپ نے فرمایا:

<sup>۱</sup> مشور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم سب خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہو۔ (حدیث)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبٍ عَلَى عَجَمٍ وَلَا عَجَمٍ  
عَلَى عَرَبٍ وَلَا لَأْسُودٍ عَلَى أَحْمَرٍ وَلَا أَحْمَرٍ عَلَى لَسْوَدٍ إِلَّا بِالْتَّقْوَىٰ إِنَّ  
أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْنَاكُمْ ۝

لوگو، من رکھو، تمہارا رب ایک ہے۔ عرب کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی  
فضیلت نہیں، نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت  
ہے۔ فضیلت اگر ہے تو تقویٰ کی ہو، پر ہے۔ درحقیقت تم میں سب سے  
زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔

لئے کہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی ریاست کے دائرے میں آمیزا تو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان والوں کو، جو عرب میں  
برہمنوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الحمد لله الذي أذ هب عنكم عيبة الجهالية و تكبرها يَا أَيُّهَا النَّاسُ  
النَّاسُ رِجْلَانِ يَرْتَقِي كَرِيمٌ عَلَى اللَّهِ وَ فَاجِرٌ شَفِقٌ هَمِينٌ عَلَى اللَّهِ النَّاسُ  
كَلِيمٌ بَنُو آدَمَ وَ خَلُقَ اللَّهُ آدَمَ مِنْ تَرَابٍ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا  
خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نُكْرَ وَ انْشَ... الایه ۲۷

شر ہے اس خدا کا جس نے جاہلیت کا عیب اور تکبر تم سے دور کر دیا۔  
لوگو، انسان و ملحوظ کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نیک اور پہنچگار ہو، وہ  
اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ دوسرا وہ جو بد اعمال اور شفیق ہو، وہ اللہ کے  
نزدیک فرمایا ہے۔ اصل کے اعتبار سے سب انسان اولاد آدم ہیں اور  
آدم کو اللہ نے میشی سے پیدا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”لوگو، ہم  
نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے.....“

۲۔ ایسی سو سائی میں کسی فرد یا کسی گروہ افراد کے لئے اس کی پیدائش یا

اس کے معاشرتی مرتبے (Social Status) یا اس کے پیشے کے اختبار سے اس حرم کی رکاوٹیں (Disabilities) نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی گامیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقاء میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائیتی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں موقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے راستہ مکلا ہوا ہونا چاہئے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک پڑھ سکتا ہے بودھا چلا جائے بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجہ اہم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلامزادے فوجوں کے پس سالار اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور پڑے پڑے اوپنچے گمراوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چهار جو تیار گانشیتے گانشیتے اٹھے اور امامت کی مند پر بینتے گئے۔ جو لاء ہے اور بزارِ مفتی اور قاضی اور قیسہ بنے اور آج ان کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبیش۔ ”سنوا اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک جیشی کیوں نہ بنا دیا جائے۔“ (بخاری کتاب الاحکام)

۳۔ ایسی سوسائیتی میں کسی شخص یا گروہ (Group) کی ڈیکٹیوریٹ پ کے لئے کوئی محجاش نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس کی ذات میں مرکوز (Concentrate) کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی آمر (Dictator) بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے عاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ آمریت دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

اسلامی ریاست ایک بہمہ گیر ریاست ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے، مگر اس ملکیت اور بھروسہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہے گیر ہے جسے اسلامی حکومت کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہے گیری کے ساتھ نافذ کی جائیں گی۔ مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکومت خود ضابطہ بندی (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتی۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں، فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں، اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ اپنے مرپر فلاں قسم کی ثوبی پہنیں، اپنی زبان کے لئے فلاں رسم الخط اختیار کریں، اپنی عورتوں کو فلاں قسم کا لباس پہنانیں۔ یہ خداوندانہ اختیارات جو روس اور جرمی اور اٹلی میں ڈیکٹیشوروں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور جن کو اتنا ذکر نہیں کئے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر فرد مخصوص طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ مخصوص جوابدی (Personal Accountability) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری آزادی ہونی چاہئے کہ اپنے لئے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جو حصہ اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا تو وہ خود اس ظلم کے لئے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلافی راشدین کی حکومت میں ضابطہ بندی (Regimentation) کا نام دشمن تک نہیں ملتا۔

۲۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے، اس لئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثبوت سے مشروط نہیں کیا ہے،

بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمیوریت قائم کی ہے۔ دوسری طرف ایسی انفرادیت (Individualism) کا سردار باب کر دیا ہے جو اجتماعیت کی ننی کرتی ہو۔ یہاں افراد و جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں گم ہو جائے، جس طرح کیونزم اور فاشیزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لئے نصان دہ ہو، جیسا کہ مغربی جمیوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصد حیات دہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے۔ یعنی قانون الہی کا نفاذ اور رضاۓ الہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح تسلیم کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لئے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشود نہما کا پورا موقع بھی ملتا ہے اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی ملتا ہے جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ مکمل کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سردار باب کرنا تھا جو اسلامی جمیوریت کی مذکورہ بالا تشریع سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

باب ۳

## قرآن کا فلسفہ سیاست

- علم سیاست کے بنیادی سوال
- چند بنیادی حقیقتیں
- اسلامی تصور حیات
- دین اور قانون حق
- حکومت کی ضرورت اور اہمیت
- تصور حاکیت و خلافت
- اصول اطاعت و وفاداری

قرآن کریم خدا کی وہ آخری کتاب ہے جس میں خالق ارض و سماء نے زندگی کے تمام بنیادی مسائل کے متعلق اپنی ہدایت مکمل ترین شکل میں انسان کو دی ہے اور بیشہ کے لئے یہ اصول بھی ارشاد فرمادیا ہے کہ جو اس ہدایت کو دانوں سے پکڑے گا اور اس پر عمل پیرا ہو گا وہی کامیاب و کامران ہے۔

فَمَنْ تَبَعَ هُدًى فَلَا خُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَنْبُوا  
بِإِيمَانِنَا أَوْ لَنْكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○ (البقرة: ٣٩-٣٨)

”تو جنہوں نے میری ہدایت کی ہجرتی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غناک ہوں گے اور جنہوں نے اس کو قول نہ کیا اور ہماری آنکوں کو جھٹکایا وہ دو ذخیر میں جانے والے ہیں اور وہ بیشہ اس میں رہیں گے۔“

یہ قرآن زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بنیادی ہدایت دیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع انسان کی ہدایت ہے اور صرف سے لہر تک ۔۔۔ بلکہ لہر کے بعد کی زندگی کے لئے بھی یہ واضح رہنمائی دیتا ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ بنیادی سیاسی مسائل کے متعلق خدا کی یہ کتاب خاموش رہتی۔ قرآن، دین اور دنیا کی تنقیم کو ایک قوتہ قرار دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافته (داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے) زیر نظر مقالہ میں قرآن کے سیاسی تصورات کو مرتب کیا گیا ہے۔

”تنقیم القرآن“ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی وہ عظیم الشان تفسیر ہے جس میں دور حاضر کے مسائل اور مسلمانوں کے جدید ذہن کو سامنے رکھ کر قرآن پاک کے حقیقی مطالب کی تعریج و توضیح بڑے دل نشین انداز میں کی گئی ہے۔ یہ تفسیر چھ

جلدوں پر مشتمل ہے۔ راقم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس تغیرے سے ان تمام مباحث کو فتح کر کے تمی مقالوں میں نسلک کر دے جو سیاسی نظام کے متعلق ہیں۔ کتاب کے پہلے حصہ میں ہم ”قرآن کا فلسفہ سیاست“ کے عنوان سے ان مباحث کو پیش کر رہے ہیں جو فلسفہ سیاست کے بنیادی امور سے متعلق ہیں۔ بعد کے حصوں میں ان سے متعلقہ حصے مقالہ کی شکل میں پیش کئے جائیں گے۔

مرتب

## علم سیاست کے بنیادی سوال

علم سیاست کا اصل موضوع فرد اور ریاست کے باہم تعلق کا مسئلہ ہے۔ اس علم کے چند بنیادی سوال یہ ہیں:

- ۱۔ ریاست کی ضرورت کیا ہے؟
- ۲۔ ریاست میں حاکیت اعلیٰ کس کو حاصل ہو؟
- ۳۔ اطاعت اور وفاداری کا اصول کیا ہو؟
- ۴۔ حکومت کا مقصد اور اس کے بنیادی و خلاف کیا ہوں؟

مندرجہ ذیل صفحات میں ان سوالات کے جواب قرآن پاک سے دیئے جا رہے ہیں اور چونکہ قرآن کے سیاسی تصورات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے پورے تصور زندگی کے متعلق قرآن نے جو نظر دیا ہے وہ سامنے رہے اس لئے پہلے اسلام کے تصور حیات کے متعلق چند بنیادی باتیں دی جا رہی ہیں اور اس کے بعد قرآن کے سیاسی تصورات کو پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

## چند بنیادی حقیقتیں

سب سے پہلے ناگر کو قرآن کی اصل ہے واقف ہونا چاہئے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لئے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قول کرنی ہو گی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے:

۱۔ خداوند عالم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمازدا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیزدی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲۔ اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح اس کے کان مکھوں کریے بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور سارے جہان کا مالک، معبد اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود عختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لئے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس آتا ہو گا اور میں تمہارے کام کی جائیج کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لئے صحیح ردیہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد

محبود اور حاکم قسم کرو، جو ہدایت میں سمجھوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شور کے ساتھ زندگی ببر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے بر عکس تمہارے لئے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لئے تم آزاد ہو) تو تمیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہو گا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمیں ابدی راحت و سرت کا وہ گھر دوں گا جس کا ہام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لئے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا پچھتا ہو گا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے، تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳۔ یہ فحائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد (آدم و حوا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انسین اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اولین انسان، جہالت اور تاریخی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز نپوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انسین ان کا قانون حیات بتا دیا گیا تھا۔ ان کا طریق زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیع خدا (مسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریق زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف تم کے غلط رویوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو منع بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک تھرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیئے ہوئے علم حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذہب پیدا کر لئے۔ انہوں نے خدا کے مقرر کئے ہوئے

عادلانہ اصول اخلاق و تہذیب (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاؤ کر اپنی خواہشات نفس اور اپنے تعصبات کے مطابق ایسے قوانین زندگی گھر لئے جن سے خدا کی زمین قلم سے بھر گئی۔

۲۔ خدا نے جو محدود خود اختیاری انسان کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان گھرنے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح روایہ کی طرف منڈلتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لئے جو مہلت اس نوع کے لئے اور اس کی مختلف قوموں کے لئے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رو نما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفریقی سے اس نے اپنے ذمہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے، اس کی مہلت عمل کے دوران میں، اس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیردی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمائندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علم حقیقت بخدا۔ انہیں صحیح قانون حیات عطا کیا اور انہیں اس کام پر مأمور کیا کہ ہمیں آدم کو اسی راہ راست کی طرف پہنچنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵۔ یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزارہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں وہ میوٹ ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح روایہ جو اول روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرد تھے، یعنی اخلاق و تہذیب کے وہ ازلی دا بدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لئے تجویز کر دیئے گئے تھے اور ان سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے اپنائے نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو

قبول کر لیں ان کو منظم کر کے ایک الی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانون الہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لئے جدوجہد کرے۔ ان غیربروں نے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہیشہ یہ ہوتا رہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنمیوں نے اسے قبول کر کے امت مسلم کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگزتے پڑے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض اتنیں ہدایت الہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے منع کر دیا۔

- ۶ - آخر کار خداوند عالم نے سر زمین عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لئے میوث کیا جس کے لئے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ ان کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگزے ہوئے ہیرو بھی۔ سب کو صحیح روایہ کی طرف دعوت رہنا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت ہدایت کو قبول کریں، انہیں ایک الی امت بناؤ۔ ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح گئے لئے جدوجہد کرے۔۔۔۔۔ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قران ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔<sup>۱</sup>

(۲)

## اسلامی تصور حیات

قرآن اس دنیا میں انسان کے صحیح مقام اور زندگی کے متعلق اس کے پورے نظریہ کو ایک آئیت میں بیان کرتا ہے:

انَّ اللَّهَ أَشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بَلَى لَهُمُ الْجَنَّةُ طَرِيقَاتٌ  
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًا فِي التُّورَاةِ وَالْإِنجِيلِ  
وَالْقُرْآنِ طَوْمَنْ لَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَلَمْ يَسْتَبِّشُوا بِبِيِّعِكُمُ الَّذِي بَأَيْعَتْمَبِهِ طَرِيقَاتٌ  
وَذَلِكَ هُوَ الْفَوزُ الْعَظِيمُ۔ (التوب بے: ۱۱۱)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے موننوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلتے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عمد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے سبودے پر جوتم نے خدا سے چکایا ہے۔ لیکن سب سے بڑی کامیابی ہے۔“

یہاں ایمان کے اس مخلوط کو جو خدا اور بندے کے درمیان میں ہوتا ہے یعنی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک ما بعد الیکھاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاملہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا اپنی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسرا زندگی میں وہ اسے جنت عطا

کرے گا۔ اس اہم مضمون کے مضامات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخدا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے۔ لہذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ نہ انسان کا انہا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے، نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان کے اندر الہی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیتہ اس کے حوالے کر دیا ہے اور وہ ہے اس کا اختیار، یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (Free will and Freedom of Choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتون کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس امر کی آزادی دے دی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جرکے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی انہا مالک ہن بیٹھے اور اپنے ذمہ میں یہ خیال کر لے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود و اختیار نہیں اپنے حسب فتنا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے اور جس میں امن رہنے پا گائے بن جانے کی آزادی اس نے انسان

کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مخالبہ کرتا ہے کہ تو برضاو  
رنگت (نہ کہ بمحرومی) میری چیز کو میری ہی چیزان لے اور زندگی بھر اس میں  
خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر  
لے اور خیانت کی جو آزادی تھی میں نے دی ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو  
جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تمی  
حاصل کروہ نہیں بلکہ میری عطا کروہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تھی  
بعد کی جاودائی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے  
ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کر لے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع کا دوسرا  
نام ہے اور جو شخص اس سے انکار کر دے یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار  
کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ کافر ہے اور اس بیع  
ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھو لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کجئے۔

۱۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا  
ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیئے جانے پر اتنی شرافت دکھاتا ہے یا  
نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری  
آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اپنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد  
نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملے گی، جس کے ادا کرنے کا  
خدا کی طرف سے وعدہ ہے، اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے  
مزے بیع دینے پر بخوبی راضی ہو جائے۔

۲۔ دنیا میں جس فقیہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو  
ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر  
مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی مرجع  
ثبوت اب سے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے لیکن خدا کے ہاں جو ایمان

معترض ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ پنج دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلپتے دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا، اپنے ول و دماغ اور بدن کی قوتیں کا، اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسب مشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لئے محفوظ رکھتا ہو تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ موبین سمجھا جاتا رہے، مگر خدا کے ہاں یقیناً "وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ پنج کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا یہ دونوں طرز عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعاً ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ پھینکا نہیں ہے یا پنج کا معاملہ کر لینے کے بعد بھی وہ نیچی ہو گی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

۳۔ ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویہ زندگی اور کافرانہ رویہ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک وہ سرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو، اپنی زندگی کے ہر شبے میں خدا کی مرضی کا تابع ہن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آئے پاتا۔ الایہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاملہ پنج کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ اہل ایمان سے مرکب ہو وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرز تہذیب و تہذیب، کوئی طریق میثاث و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے منصب ہو گا اسی وقت وہ آزادی کا رویہ

چھوڑ کر بندگی کے رویہ کی طرف پٹت آئے گا۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و مشکلات نفس کے پارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں بہر حال ایک کافرانہ رویہ زندگی ہے، خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

۴۔ اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع آدمی پر لازم آتا ہے وہ آدمی کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود ہتا ہے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی نہ کرایتا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا اتباع نہیں، بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاهدہ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاهدہ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گردہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویہ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تفہیمات ہیں اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خوب نہ ہو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمه پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیع دیا۔" بلکہ وہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس پیچ ہو کی چیز پر خود مختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے۔" لہذا یہ فروخت کامل ہی اس وقت ہو گی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاهدہ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحے تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ از روئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توجیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہئے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ ضمنون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اور یہ جو سلسلہ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا، مگر جب امتحان کا ناک موقع

آیا تو ان میں سے بعض نے تابل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے روایہ پر تقدیر کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے، بعض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہی ہے، بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو اور دوسرا طرف اپنے نفس کی قوتوں کو اور اپنے ذرائع کو خدا کے فشار کے خلاف استعمال کرتے ہو، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ چنانچہ ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ پنجھ پکھے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انہیں بے دریغ قربان کرتے ہیں اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقت کا کوئی اونٹی سا جزا اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اس امر پر بہت اعتراضات کئے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو انجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں، مثلاً:

”مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے۔“ (متی ۱۰:۵)

”جو کوئی اپنی جان پچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھو لے جائے ہے اسے پچائے گا۔“ (متی ۳۹:۱۰)

”جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا مان یا بچوں یا کھیتوں کو  
میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گناہ ملے گا اور ہیشہ کی زندگی کا  
وارث ہو گا۔“ (متی ۲۹:۱۹)

البته تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون  
نہیں پایا جاتا اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور نیوم الحساب اور اخروی  
جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ ہیشہ سے دین حق کا جزو  
لایفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ تورات میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ  
نکالتا درست نہیں ہے کہ واقعی توراے اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود  
اپنے زمانہ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوش حالی کے بھوکے ہو گئے  
تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوانح رہے تھے کہ وہ  
اسی دنیا میں حاصل ہو۔ انی لئے کتاب اللہ میں بندگی و اطاعت کے بدالے جن جن  
انعامات کے وعدے ان سے کے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتمار لائے اور  
جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سر زمین پر چھپا کر دیا جس کے وہ  
امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر تورات میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:  
”من آئے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے  
سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے  
خدا سے محبت کر۔“ (استثناء ۳:۶، ۵)

اور یہ کہ:

”کیا وہ تمہارا باپ نہیں جس نے تم کو خریدا ہے؟ اسی نے تم کو بنایا اور  
قیام بخشنا۔“ (استثناء ۳۲:۶)

لیکن اس تعلق باللہ کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس ملک کے ماں ک  
ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شد بہتا ہے، یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے  
کہ تورات جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے اول تو پوری نہیں ہے اور پھر وہ

غالب کلام اُنہی پر بھی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے اندر یہودیوں کی قومی روایات، ان کے نسلی تضبات، ان کے اوہام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں اور ان کے فقیhi اجتہادات کا ایک معتقدہ حصہ ایک ہی سلسلہ عبارت میں کلام اُنہی کے ساتھ کچھ اس طرح رکھ لی گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائدے ممیز کرنا قطعاً "غیر ممکن ہو جاتا ہے۔"

(۳)

## دین اور قانون حق

الزانية والزاني فلجلد واكل واحد منها مائة جلد ولا تأخذكم بهما رافقة في دين الله ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر۔ (النور: ۲)

”زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن بگیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔“

اولین چیز جو اس آیت میں تکمیل توجہ ہے وہ یہ کہ یہاں فوجداری قانون کو ”دین اللہ“ فرمایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں بلکہ مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظام شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا اوصورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو رد کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ رد کر دیا جائے۔

(۳)

## حکومت کی ضرورت اور اہمیت

وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْ مَدْخَلَ صَدْقَ وَأَخْرُجْ مَخْرَجَ صَدْقَ وَاجْعَلْ لِي مِنْ  
لَدْنَكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا۔ (نی اسرائیل: ۸۰)

”اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھے کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے  
جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک  
اقدار کو میرا مددگار بنا دے۔“

یعنی یا تو مجھے خود اقدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی  
طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس  
سیلاپ کو روک سکوں، اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تغیری ہے اس  
آہمیت کی جو حسن بصری مبلغہ اور فتاویٰ مبلغہ نے کی ہے اور اسی کو این جریے مبلغہ اور  
ابن کثیر مبلغہ نے جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اسی کی تائید یہ حدیث  
کرتی ہے کہ انَّ اللَّهَ لِيَزْعُمُ بِالْسُّلْطَانِ مَا لَا يَزْعُمُ بِالْقُرْآنِ۔ یعنی ”اللہ تعالیٰ حکومت کی  
طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف دعاظم و تذکیرے  
نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی طاقت بھی در کار ہے۔ پھر  
جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا  
کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لئے حکومت چاہنا اور  
اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ

غلطی پر ہیں جو اپے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لئے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے وین کے لئے حکومت کا طالب ہونا۔ تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضہ ہے۔<sup>۱</sup>

یہ کیا چیز ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں نظر آتی ہے۔ جس اخلاقی اور اصلاحی انقلاب کے وہ داعی تھے اس کے لئے اقتدار کی قوت ناگزیر تھی۔ جب حالات نے اس کا موقع فراہم کیا تو آپ<sup>ؐ</sup> نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسلامی حکومت قائم کی۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وقالَ الْمُلْكَ ائْتُونِي بِهِ اسْتَخْلَصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلِمَهُ قَالَ انْكَ الْيَوْمَ لِدِينِ  
مَكِينِ أَمِينٍ ○ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَانَ الْأَرْضِ أَنِّي حَفِظْتُ عَلَيْهِ

(یوسف: ۵۳ - ۵۵)

پادشاہ نے کہا ”انہیں میرے پاس لاو۔“ تاکہ میں ان کو اپنے لئے مخصوص کر لوں۔ جب یوسف نے اس سے گنگوہ کی تو اس نے کہا ”اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر بھروسہ ہے۔“ یوسف نے کہا ”ملک کے خزانے میرے پر دیکھئے“ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔“

اس سے پہلے اس سورۃ میں جو مضمین گزر چکے ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ کوئی نوکری کی درخواست نہیں تھی جو نعوذ بالله کسی ”طالب جاہ“ نے وقت کے پادشاہ کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے پیش کر دی ہو۔ درحقیقت یہ اس انقلاب کا دروازہ بھولنے کے لئے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی طاقت سے پچھلے دس بارہ سال کے اندر نشوونما پا کر ظہور کے لئے تیار ہو چکا تھا اور اب جس کائن باب صرف ایک ٹھوکنے کے ہی کامیاب

تحا۔ حضرت یوسف "آزمائشوں کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر آ رہے تھے اور یہ آزمائشوں کسی گناہ کے گوشے میں پیش نہیں آئی تھیں بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شریوں تک مصر کا پچہ پچہ ان سے واپس تھا۔ ان آزمائشوں میں انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت، راست بازی، حلم، ضبط نفس، عالی محفل، ذہانت و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانہ کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں۔ دل ان سے مسخر ہو چکے تھے۔ خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ ان کا "حفیظ" اور "علیم" ہوتا اب محض ایک دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ واقعہ تھا جس پر سب ایمان لا چکے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف اتنی کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود حکومت کے ان اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے پر رضامندی ظاہر کریں جن کے لئے بادشاہ اور اس کے اعیان سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ جیسی وہ کسر تھی جو انہوں نے اپنے اس فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبہ کے نکلنے ہی بادشاہ اور اس کی کو نسل نے جس طرح اسے برو چشم قبول کیا، وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لئے ایک اشارہ ہی کا لختہ تھا (تلود کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہ بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پوری شاہی کو نسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی تھی)

یہ اختیارات جو حضرت یوسف علیہ السلام نے مانگے اور ان کو سونپے گئے، ان کی نوعیت کیا تھی؟ ناواقف لوگ یہاں "خزانہ ارض" کے الفاظ اور آگے چل کر غلہ کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ شاید یہ افسر خزانہ یا افسر مال یا قحط کمشز یا وزیر مالیات یا وزیر غذا میانسی کا کوئی عمدہ ہو گا۔ لیکن قرآن، باسیل اور تلود کی متفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام سلطنت مصر کے مختار

کل (رومی اصطلاح میں ذکریش) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ و سفید سب کچھ ان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا قرآن کرتا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر پہنچے ہیں تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام تخت نشین تھے۔ (ورقع ابویہ علی العرش۔ یوسف : ۱۰۰) حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی زبان سے لکھا ہوا یہ فقرہ قرآن میں مقول ہے کہ ”اے میرے رب! تو نے مجھے بادشاہی عطا کی۔“ ”رب قد اتیتني من الملک۔ یوسف : ۱۰۱) پیالے کی چوری کے موقع پر سرکاری ملازم حضرت یوسف علیہ السلام کے پیالے کو بادشاہ کا پیالہ کہتے ہیں (قالوا ن فقد صواعِ الملک۔ یوسف : ۲۷) اور اللہ تعالیٰ مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت یہ بیان کرتا ہے کہ ساری سر زمین مصر ان کی تھی (یقبوا منها حیث یشاء۔ یوسف : ۵۶) رعنی بائیبل تو وہ شادت دیتی ہے کہ فرعون نے یوسف سے کہا:

”سو تو میرے گھر کا ہمارا ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی فقط تخت کا مالک ہونے کے سب سے میں بزرگ تر ہوں گا..... دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں ..... اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ ہلائے گا اور فرعون نے یوسف علیہ السلام کا نام ضغرنات فعینح (دنیا کا نجات دہنده) رکھا۔“

(پیدائش ۳۱: ۳۹-۳۵)

اور تکھود کہتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے والد سے حاکم مصر (یوسف علیہ السلام) کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا:

”اپنے ملک کے باشندوں پر اس کا اقتدار سب سے بالا ہے اس کے حکم پر وہ نکلتے اور اس کے حکم پر وہ داخل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سارے ملک پر فرمائی کرتی ہے کسی معاملہ میں فرعون کے اذن کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

دوسرے سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ اختیارات کس غرض کے لئے مانگے تھے؟ انہوں نے اپنی خدمات اس لئے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیش نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظام تہذیب و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ ذمہدی نے اپنی تفسیر "کشف" میں دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حضرت یوسف علیہ السلام نے اجعافی علی خزانہ الارض جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے اور وہ اس کام کو انجام دینے کی طاقت ماضل کریں جس کے لئے انبیاء بھیجے جاتے ہیں انہوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کے لامع میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرے شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔"

اور سچ یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو ان سے بھی زیادہ اہم اور بیماری سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہ تصور ملتا ہے کہ اسلام کا داعی خود نظام کفر کو کافرانہ اصولوں پر چلانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا، اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھرتا ہے، یعنی یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک راست باز آدمی بھی تھے یا نہیں؟ اگر راست باز تھے تو کیا ایک راست پا زانہ کا ممکن کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے کرے کہ "بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔" اور بار بار اہل صدر پر بھی واضح کر دے۔ کہ تمہارے ان بہت سے متفرق خود ساختہ خداوں میں

سے ایک یہ شاہ مصر بھی ہے اور ہماف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ ”فرماں روائی کا اقتدار خداۓ واحد کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔“ مگر جب عملی آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اس نظام حکومت کا خادم، بلکہ باعث اور محافظ اور پشت پناہ تک من جائے جو شاہ مصر کی ربوہیت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ ”فرماں روائی کے اختیارات خدا کے لئے نہیں بلکہ پادشاہ کے لئے ہیں“ تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تغیری میں دور انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اسی ذہنیت کا انعام کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں جلا ہوئے تو پھری تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں، ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتمار لائے تاکہ اپنے لئے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا۔ انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی، مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آئی، لہذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے خمیر کو راضی کرنے کے لئے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمت کفر کی گمراہی میں لے گئے جس کی زندگی دراصل انہیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مرد مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فرست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تھا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشر طیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

(۵)

## تصور حاکیت و خلافت

اسلام کا تصور حاکیت بہت صاف اور واضح ہے۔ خدا اس کائنات کا خالق ہے اور وہی اس کا حاکم اعلیٰ بھی۔ اقتدار اعلیٰ صرف اسی کا حصہ ہے۔ انسان کی حیثیت حاکم اعلیٰ کے خلیفہ اور نمائندہ کی ہے اور سیاسی نظام کو اسی حاکم اعلیٰ کے قانون کے تابع ہونا چاہئے۔ خلیفہ کا کام حاکم اعلیٰ کے قانون کو اس کے اصل فناء کے مطابق نافذ کرنا ہے اور نظام سیاسی کو اس کی پڑائیات کے مطابق چلانا ہے۔

يَصَاحِبُ السُّجْدَةِ أَرْبَابُ مُتَفَرِّقَتِنِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ مَا  
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِسْحَادٌ سَمِيتُمُوهَا إِنْتُمْ وَابْنَكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهِ مِنْ  
سُلْطَنٍ طَّا لِنَ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ طَّا امْرُ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَاهُ طَذَالِكُ الدِّينُ الْقَيْمُ  
وَلَكُنَّ الْأَكْثَرُ النَّاسُ لَا يَعْلَمُونَ ○ (یوسف: ۳۹ - ۴۰)

”اے زندگی کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء اجداؤ نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کے سواتم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی خوبیہ سیدھا طریق زندگی ہے، محراکش لوگ جانے نہیں ہیں۔“

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تقریر کا ایک حصہ ہے اور توحید اور حاکیت

اللہ پر بہترین تقریروں میں نے ہے۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے الہ حق کا راستہ الہ باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان سے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تمہری طرح یہ بات اتر گئی ہو گی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گمراہیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاوں کا، اور سارے جہاں کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرنے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو، اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنا�ا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ خواہ خود مگر مگر کر اپنے رب ہناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہرشائیے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اتفاق کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا خود مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب خالی خولی نام ہی ہیں، ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور ما کلیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو اور اس نے ان میں سے کسی کے لئے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرمائی کہ سارے حقوق اور اختیارات اپنے ہی لئے مخصوص رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(الف) وَقَالَ فِرْعَوْنٌ يَا يَا أَهْلَ الْمَلَائِكَةِ إِنَّمَا أَعْلَمُ بِكُمْ مِنْ أَنْتُمْ غَيْرُ بِي

(القصص: ٣٨)

اور فرعون نے کہا: "اے اہل دربار میں تو اپنے سواتھا کے کسی خدا کو نہیں جانتا۔"

اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات صرف ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی تھی۔ اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سواتھا کوئی معبد نہیں ہے کیونکہ اہل مصر کے ذہب میں بہت سے معبدوں کی پرستش ہوتی تھی اور خود فرعون کو جس بنا پر معبدیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شادوت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا۔

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن ان ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد پر خود عمار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکیت کی مدعا ہیں۔ وہ خواہ سرچشمہ قانون اور صاحب امر نہیں کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، ہر حال جب تک وہ یہ موقف اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا۔ اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شور لوگ فرعون پر لعنت بھیجنے رہیں اور ان ریاستوں کو سند جواز عطا کرتے رہیں۔ حقیق کی سمجھ بوجو رکھنے والا آدمی تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لئے "اللہ" کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ اسی معنی میں "حاکیت" کی اصطلاح

استعمال کرتی ہیں۔<sup>۱</sup>

(ج) الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَخْذُلْ لَذَاوِلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمَكَوْلِقِ كُلِّ شَيْءٍ فَقَدْ رَهْ تَقْدِيرًا ○ (الفرقان: ۲)

”وہ جو زمین اور آسماؤں کی بادشاہی کا مالک ہے۔ جس نے کسی کو پہنچ نہیں بنا�ا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔“

یہاں لفظ ملک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدار اعلیٰ اور حاکیت (Sovereignty) کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختار مطلق ہے اور فرمازروائی کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اس بات کی مستلزم ہے کہ پھر معبد بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان جس کو بھی معبد بناتا ہے یہ سمجھ کر بناتا ہے کہ اس نے کوئی طاقت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی حرم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہماری قسمتوں پر اچھایا بر اثر ڈال سکتا ہے۔ بے زور اور بے اثر ہستیوں کو بجاوادی بنانے کے لئے کوئی احمدق سے احمد انسان بھی بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ جل شانہ کے سوا اس کائنات میں کسی کے پاس بھی کوئی زور نہیں ہے تو پھر نہ کوئی گردن اس کے سوا کسی کے آگے اظہار بجز و نیاز کے لئے بھکے گی، نہ کوئی ہاتھ اس کے سوا کسی کے آگے نذر پیش کرنے کے لئے بڑھے گا، نہ کوئی زبان اس کے سوا کسی کی حمد کے ترانے گائے گی یا دعا و التجا کے لئے کھلے گی اور نہ دنیا کے کسی نادان سے نادان آدمی سے بھی بھی یہ حماقت سرزد ہو سکے گی کہ وہ اپنے حقیقی خدا کے سوا کسی اور کسی اطاعت و بندگی بجا لائے، یا کسی کو بذات خود حکم چلانے کا حق دار مائے۔ اس مضمون کو مزید تقویت

اپر کے اس فقرے سے پہنچتی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اسی کے لئے ہے۔

(و) لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ طَوَّافٌ تَبْدِيلٌ وَمَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تَخْفُوهُ يَحْسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ طَفِيفٌ فَإِنَّ اللَّهَ لِمَن يَشَاءُ وَيَعْلَمُ مِن يَشَاءُ طَوَّافٌ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ عَقِيدَرٌ۔ (البقرة: ۲۸۳)

”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باقی خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ۔ اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔ پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے وہ ہر جنگ پر قدرت رکھتا ہے۔“

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی اولین بنیاد خدا کی حاکیت کا عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان ہونا اور ان تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں، اللہ ہی کی ملک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لئے کوئی دوسرا طرز عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سراط افت جھکا دے۔ پھر اس آیت میں جواب دی کے تصور اور انفرادی ذمہ داری کے اصول کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان فردا "فردا" اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہے، دوسرے یہ کہ جس بادشاہ زمین و آسمان کے سامنے انسان جواب دہ ہے، وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے حتیٰ کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں اور آخر میں اللہ کے اختیار مطلق کا بیان ہے۔ اس کو کسی قانون نے پاندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو بلکہ وہ مالک مختار ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے

کے کل اختیارات اس کو حاصل ہیں۔<sup>۱۷</sup>

(ه) و مَسْدِقَةُ الْمَايِّنِ يَدِيٌ مِنَ التُّورَاتِهِ وَالاَحْلَلُ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُرِمَ عَلَيْكُمْ وَجَنَّتُكُمْ بَايَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاطِّبِعُونَ ○ اَنَّ اللَّهَ رَبُّكُمْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ طَهَّا صِرَاطَ مُسْتَقِيمٍ ○ (آل عمران: ۵۰-۵۱)

”اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہذا اللہ سے ذردا اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ لہذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بیوادی نکات یہی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ، جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لئے حق تعلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس مقدار اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرا یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو اور دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیجے جائیں۔

پس در حقیقت حضرت حبیبی علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یک سرمو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیئے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اختبار سے فرق کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعایت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آئنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود عماری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدار اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک نہ رہائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت مگزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افوس ہے کہ موجودہ انجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح اور قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی ثناوات ہیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اور پر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیح علیہ السلام صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے ان کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

”تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبالت کر۔“ (متی ۲۲:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوئی کی اطاعت ہو رہی ہے:

”تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔“ (متی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نہی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی

طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن تاصرف سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہل شر ان کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ”نی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔“ اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کمیں اور چلے جائیں تو انہوں نے جواب دیا ”ممکن نہیں کہ نی یہ وحشیم سے باہر ہلاک ہو۔“ (لوقا ۱۳: ۲۲) آخری مرتبہ جب وہ یہ وحشیم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز ہے کہنا شروع کیا ”مبارک ہے وہ پادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔“ اس پر یہودی علماء ناراض ہوئے اور انہوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ ”اگر یہ چپ رہیں گے تو پھر کاراٹھیں گے۔“ (لوقا ۱۹: ۳۰۔ ۳۸) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

”اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں سب میرے پاس آؤ“ میں تم کو آرام دوں گا۔ میرا جو اپنے اوپر اٹھا لو..... میرا جو اسلام ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔“ (متی ۱۱: ۲۸۔ ۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساختہ کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر ترجیح ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھائیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تم ریا کاروں کی حالت وہی ہے جس پر یہیہ نہیں کی زبان سے یہ طغہ دیا گیا ہے کہ ”یہ امت زبان سے تو میری تعلیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دور ہیں، کونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔“ تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھرے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا

لے توراہ میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کئے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کے میری جو خدمات تمہارے کام آسکتی تھیں انہیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لئے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔" (متی ۱۵: ۳۹-۴۰۔ مرقس ۷: ۱۲-۱۳)

(و) ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی  
علی العرش قف پغش النیل النهار ایطلبه حثیثا لا والشمس والقمر  
والنجوم مسخرات بامرہ ط الا له الخلق والامر ط تبرک اللہ رب  
العلمین ○ (الاعراف: ۵۳)

"در حقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ  
دلوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تحت سلطنت پر مستکن ہوا۔ جورات کو ذن پر  
ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے  
سورج اور چاند اور تارے پیدا کئے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔  
خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا با برکت ہے اللہ،  
سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار۔"

خدا کے استوای علی العرش (تحت سلطنت پر مستکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت  
کو سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق  
کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لا محدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں  
مرتکز فرمادیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا  
فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جا رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش  
سے مراد اقتدار فرمائی ہو اور اس پر مستکن ہو جانے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے

کائنات کو پیدا کر کے اس کی نام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال استوا علی المرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کمیں بیٹھے نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہاں کے جزو کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطنتی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمیں دانما "اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں جلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی مذالت میں۔ خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھے لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسم کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے سر جھکادے یا پھر اپنی قسم کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا اور خلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لئے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلات، استعارے اور انداز بیان انتخاب کئے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس حمد کی "تفصیف" ہے۔ اس زمانہ میں انسان کے ذہن پر شاہی قائم کا تسلط تھا اس لئے مصنف نے (جس سے مراد ان غالبوں کے نزدیک محض صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دلائلی وابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے بر عکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسماؤں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور حاکیت (Sovereignty) جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لئے بخاص

ہے اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لفظاً اس نظام میں جو شخص یا اگر وہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکیت کا مدعا ہے وہ محض فریب میں جلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہے ہوئے انسان کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا روایہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو ذہنی معنوں میں واحد معبود بھی مانتے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

له الخلق والامر کے الفاظ سے اسی مضمون کی مزید تشریع کی گئی ہے جو "استواعلی العرش" کے الفاظ میں بھلا" بیان کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلا گئیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خیوب مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے۔ بلکہ عملًا تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیل و نمار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے باہم نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کئے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

(ز) ان الله يحكم ما يريد (المائدہ: ۱۰)

"بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

یعنی اللہ حاکم مطلق ہے اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دئے بندوں کو اس کے احکام میں چون و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں۔ لیکن بندہ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے

نہیں کرتا کہ وہ اب سے مناسب پاتا ہے یا متنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حاکم ہے جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لئے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے۔ وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہذا قرآن پورے ذور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حرمت و حلت کے لئے مالک کی اجازت و عدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً<sup>۱</sup> کوئی ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لئے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔<sup>۲</sup>

(ك) ولا تقولوا لله ما تصرف السنتكم الكتب هنا حل و هنا حرام لتفتروا  
عَلَى اللَّهِ الْكِتَبُ طَانِ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكِتَبِ لَا يَفْلُحُونَ ۝  
(النحل: ۱۶)

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ پاندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا پا رہتے ہیں وہ ہرگز فلاں نہیں پایا کرتے۔"

یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظ دیگر قانون ساز صرف اللہ ہے۔ دوسرًا جو شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جرات کرے گا وہ اپنی حد سے تجاوز کرے گا، الایہ کہ وہ قانون الی کو سند مان کر اس کے فرائیں سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں فعل جائز ہے اور فلاں ناجائز۔

اس خود مختارانہ تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور افتراء س لئے فرمایا گیا کہ جو شخص اس طرح کے احکام لگاتا ہے، اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ دو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتاب اللہ کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز و مجاز کہ رہا ہے اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھہرا لیا ہے یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے وہ لا محال جھوٹ اور اللہ پر افتراء ہے۔<sup>۱</sup>

(ل) قل ارْبَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَ حَلَالًا طَقْلَ اللَّهُ أَذْنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفَقَّرُونَ۔ (یونس: ۵۹)

”اے نبی! ان سے کو تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لئے اتنا را تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلal ٹھہرا لیا، ان سے پوچھو اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ پا تم اللہ پر افتراء کر رہے ہو؟“

اردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دستخوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم و رواج کی بنیاد پر لوگوں نے کر دیا ہے۔ اس خلط فہمی میں جملاء یا عوام ہی نہیں، علماء تک جلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوب اک تک محدود نہیں ہے بلکہ عطا اور بخشش اور نصیب کے معنوں میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ امام الرجال کی کتابوں میں بکھر راویوں کے ہم رزق اور رزق اللہ ملتے ہیں جس کے معنی تقریباً ”وہی ہیں جو

اڑدوں میں اللہ دینے کے معنی ہیں۔ مشور دعا ہے۔۔۔ اللہم ارنا الحق و ارزقنا  
اتباعہ: یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے۔ حکاہرے میں  
بولا جاتا ہے رزق علماء، فلاں شخص کو علم دیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر  
حالمہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کارزن اور اس کی  
مدت عمر اور اس کا کام لکھ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ  
خوارک ہی نہیں ہے جو اس پیچے کو آئندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اسے  
دنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے وَمِعَارِزْ قُنْهَمْ يَنْفَقُونَ (البقرہ: ۳) جو کچھ  
ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرج کرتے ہیں، لہیں رزق کو محض دستِ خوان کی  
سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان پابندیوں اور  
آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں لوگوں نے بطور  
خود اختیار کر لی ہیں، سخت غلطی ہے اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ اس کی  
بدولت خدا کے دین کی ایک بہت بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے او جملہ ہو  
گئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت اور  
جواز و عدم جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے لیکن تہذیب کے وسیع تر  
معاملات میں اگر یہ اصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لئے حدود مقرر کرنے  
کا حق رکھتا ہے اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی  
کی جانے لگے تو عامی تو در کنار علمائے دین و مفتیان شرع متین اور مفسرین قرآن و  
شیوخ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چنگی بھی دین سے اسی طرح نکراتی  
ہے جس طرح مأکولات و مشروبات میں شریعت الہی سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز  
کے حدود بطور خود مقرر کر لیتا۔

پھر فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنا سخت پا گیا نہ جرم ہے  
جو تم کر رہے ہو۔ رزق اللہ کا ہے اور تم خود اللہ کے ہو، پھر یہ حق آخر تمہیں  
کہاں سے حاصل ہو گیا کہ اللہ کی املاک میں اپنے تصرف، استعمال اور انتفاع کے

لئے خود حد بندیاں مقرر کرو؟ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے اور اس معاملہ میں آقا کے کچھ بولنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں، تو اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تمہارا انہا ملازم اگر تمہارے گھر میں اور تمہارے گھر کی سب چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لئے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے؟۔۔۔۔۔ اس نوکر کا معاملہ تو دوسرا ہی ہے جو سرے سے نہیں مانتا کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور کوئی اس کا آقا بھی ہے اور یہ کسی اور کمال ہے جو اس کے تصرف میں ہے۔ اس بد معاش غاصب کی پوزیشن یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ یہاں سوال اس نوکر کی پوزیشن کا ہے جو خود مان رہا ہے کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ مل اسی کا ہے جس کا وہ نوکر نہ ہے اور پھر کہتا ہے کہ اس مال میں اپنے تصرف کے حقوق مقرر کر لینے کا حق مجھے آپ ہی حاصل ہے اور آقا سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ تمہاری یہ پوزیشن صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی کہ آقا نے خود تم کو مجاز کر دیا ہو تاکہ میرے مال میں تم جس طرح چاہو تعرف کرو، اپنے عمل اور استعمال کے حدود، قوانین، ضوابط سب کچھ بنا لینے کے جملہ حقوق میں نے تمہیں سونپے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس واقعی اس کی کوئی سند ہے کہ آقا نے تم کو یہ اختیارات دے دیے ہیں یا تم بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ وہ تمام حقوق تمہیں سونپ چکا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم وہ سند دکھاؤ ورنہ بصورت دیگر یہ سکھلی بات ہے کہ تم بغاوت پر جھوٹ اور افتراء پردازی کا مزید جرم کر رہے ہو۔

(ج) وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكُفَّارُونَ۔۔۔۔۔

(ج) الظالِمُونَ..... الفاسقون..... (المائدة: ٣٢-٣٥-٣٧)

”اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں..... ظالم ہیں..... فاسق ہیں.....“

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں، تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یاد دوسرے انسانوں کے بھائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تمدنی بوجے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً ”اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ٹانیا“ اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ صحیح صحیح عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرا یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے محرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکلا اور یہی فتنہ ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فتنہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً ”انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزوں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکم اللہ کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً ”حکم اللہ کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے اگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فتنہ سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم اللہ سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور

فاسق ہے اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان و اسلام اور کفر و ظلم و فتن کی آمیزش تھیک تھیک اسی تناصب کے ساتھ ہے جس تناصب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملار کھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لئے کوئی مبنی موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو می اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا : نعم الاخوة لكم بـنـو اسـرـائـیـلـ انـ کـانـتـ لـهـمـ كـلـ مـرـةـ وـلـكـمـ كـلـ حـلـوـةـ كـلـ وـالـلـهـ لـتـسـلـكـنـ طـرـيـقـهـمـ قـدـرـ الشـرـاـكـ (کہنے ابھی بھائی ہیں) تمہارے لئے یہ می اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لئے ہے اور یہاں می شماں می شماں تھاں تھاں لئے ! ہرگز نہیں، خدا کی حتم تم اُنی کے طریقہ پر قدم بے قدم چلو گے۔<sup>۱۹۴</sup>

حاکیت الٰہی کا بھی اصل الاصول ہے جس پر قرآن میں جگہ جگہ محتکوں کی علی ہے۔ خدا کے سواب جس کو بھی عمار مطلق مانا جائے گا اس کی حیثیت قرآن کی اصطلاح میں طاغوت کی ہے اور یہ بندگی الٰہی کی ضد ہے۔

(ت) فَمَن يَكْفُرُ بِالظَّاغُوتِ وَيَوْمَنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعَرْوَةِ الْوُثْقَى

لَا انْفَصَامَ لِهَا طَوْلَةً وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلَيْهِمْ (آل بقرہ: ۲۵۶)

”اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مغبوط سوار اتحام لیا جو کبھی ثوٹھے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سخنے اور جاننے والا ہے۔“

”طاغوت“ لغت کے اقتدار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقا کی وحدادنی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً ”اس کی فرمان برداری ہی کو حق مانے اور مگر عملاً“ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فتن ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرمان برداری سے اصولاً ”مخرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے، یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے با غی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ بخیج جائے اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔<sup>۱</sup>

ایک دوسری آیت پر غور کیجئے۔

للهم تر الى الذين يزعمون انهم امنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك  
يؤيدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امرنا وان يكفروا به ط

(الثاء: ۶۰)

”اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔“

یہاں صریح طور پر ”طاغوت“ سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون اللہ کے سوا کسی

دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظامِ عدالت ہے جونہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لذایہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت "طاغوت" کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لئے لے جانا ایمان کے معانی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی الیٰ عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم و ملزم ہیں اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا یعنی منافق ہے۔<sup>۱</sup>

مندرجہ بالا بحث سے قرآن کا تصورِ حاکیت واضح ہو جاتا ہے۔ اس تصور کے لحاظ سے حاکیت میں انسان کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیتا ہے اور اس نائب کا اصل مشن یہ ہتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے مالک کے حکم کے مطابق کام کرے۔ اسی چیز کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمُلْكَ كَتَهَا نَجَّالٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ ط

(البقرہ: ۳۰)

جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا "میں زمین میں ایک خلیفہ بنائے والا ہوں۔"

خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے تنویض کروہ انتیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ وہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے انتیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خشاکے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے خدا

کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کر دے احتیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے خشائی پر وی اور اس کے احکام کی تعیین کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔<sup>۲</sup>

---

(۶)

## اصول اطاعت و وفاداری

مندرجہ بالا تصور حاکیت و خلافت کا فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت اور وفاداری کا مرجع بھی خالق اور اس کی ہدایات ہوں اور ریاست میں باقی تمام وفاداریاں اسی بنیادی وفاداری کی تابع ہوں۔ اس اصول کی وضاحت قرآن نے اس طرح کی ہے:

يٰأيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطْبِعُوا اللَّهَ وَاطْبِعُوا الرَّسُولَ وَأوْلَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ جَفَان  
تَنَازَعُتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُوَوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ طَذْلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنٌ تَأْوِيلًا۔ (التساءع: ۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاٹے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیرو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کارہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔“

یہ آئت اسلام کے پورے نہ ہی، تہذی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے۔ اس میں حسب ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور

مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکزو محور خدا کی فرمان برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مقابلی نہ ہوں، بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ درستہ ہر وہ ملکہ اطاعت توڑ کر پھیٹک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لِمَخلوقٍ فِي مُصْبِحَةِ الْخَالقِ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعت خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لئے مطلع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرمانیں پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعت خدا رسول کی سند کے بغیر محترم نہیں ہے اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے: من اطاعنى فقد اطاع الله ومن عصانى فقد عصى الله "جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔" اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگئے آ رہی ہے۔

۳۔ مذکورہ پالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان "اوی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اوی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و نظری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے نجج یا تہذی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں

اور مخلوق کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے اور ان سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا در رسول کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں ان اطاعت کے لئے لازمی شرطیں ہیں اور یہ نہ صرف آئت نہ کورہ صدر میں صاف طور پر درج ہیں بلکہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ مثلاً "حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

السمع والطاعة على المزعوم المسلم في أهواه حب وكره مالم يومن  
بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة . (بخاري و مسلم)

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سننے اور ماننے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاؤ فتنگ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے ارجب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سنا چاہئے نہ ماننا چاہئے۔

لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف . (بخاري و مسلم)

خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔

يكون عليكم أمراء تعرفون و تنكرون، فمن انكر فقد بري ومن كره فقد سلم ولكن من رضى و تابع؟ فقالوا أفلان نقاتلهم؟ قال لا ماصلوا.

(مسلم)

حضر اکرم ﷺ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے مکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمة ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی نج گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور یہودی کرنے والا ماخوذ ہو گا۔ صحابہ نے پوچھا، پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے بھگ

نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔"

یعنی ترک نماز وہ علامت ہو گی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا اور رسول سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہو گا۔

شَرَارُ أَنْعَنِكُمُ الَّذِينَ تَبْغِضُونَهُمْ وَيَبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ  
قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِفْلَا نَذَبِنُهُمْ عِنْدَ ذَالِكَ؟ قَالَ لَا مَا أَقَامُوا فِيهِمُ الْمُصْلُوْةُ  
لَا مَا أَقَامُوا فِيهِمُ الْمُصْلُوْةُ (مسلم)

حضرت اکرم ﷺ نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے مبغوض ہوں اور تم ان کے لئے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں۔" فرمایا "نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں، نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔"

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور واضح کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم احکامت صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ ان کی حکومت اپنی اصلی نوعیت کے اقتدار سے ایک اسلامی حکومت ہے ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے الٹ پھینکنے کی سی مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم

سے من جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا صد بھی لیا کہ ان لا نتازع الامر اہلہ الا  
ان تروا کفرا بوا عندکم من اللہ فیہ برہان۔ یعنی یہ "کہ ہم اپنے مرداروں اور  
حکام سے نزاع نہ کریں گے، الایہ کہ ہم ان کے کاموں میں مکھا کفر دیکھیں جس کی  
موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے دلیل  
موجود ہو۔" (بخاری و مسلم)

- ۲ - چوتھی بات جو آئت ذی بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور  
پر طے کردی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی  
قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں  
کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہو گی  
اس میں فیصلہ کے لئے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں  
سے مा�صل ہو گا اس کے سامنے سب سر تسلیم ختم کر دیں گے۔ اس طرح تمام  
مسئلے زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو سند اور مرجع اور حرف  
آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے  
میز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام  
ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلے  
کے لئے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف کیسے رجوع کیا جاسکتا ہے جب  
کہ میونسلی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار  
معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ  
اصول دین کو نہ بخشنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے میز کرتی ہے وہ  
یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعا ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد  
صرف اس دائرے میں آزادی سے محروم ہوتا ہے جو اسکے رب نے اسے دی ہے۔  
کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین و ضوابط

کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدا کی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے بعد مگر مسلمان اپنے ہر حالہ میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم نہ لے تو وہ اس کی ہیروی کرتا ہے اور اگر کوئی حکم نہ لے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادی عمل برخاتا ہے اور اس کی یہ آزادی عمل اس جست پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادی عمل عطا کئے جانے کی دلیل ہے۔

۵۔ پھر اس آہت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں اور نزاع کی صورت میں فیصلہ جس حیث پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہو گی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا۔ خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ آیا ہو ناچاہئے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علماء ہو یا پریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تین کی کسی خاص بھل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہر حال آیا کوئی ادارہ ملکت میں ہو ناچاہئے اور اس کی یہ حیثیت خاص ہوئی چاہئے کہ انتظامیہ اور مقتضہ اور عدالت کے احکام اور فیصلوں کے خلاف..... اس کے پاس مرافقہ کیا جاسکے اور اس کا بنیادی اصول یہ ہو ناچاہئے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔

مزید برا آن مجید چونکہ محض کتاب آئینہ ہی نہیں ہے بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفہ و عظ و ارشاد بھی ہے، اس لئے پہلے فقرے میں جو قانونی اصول بیان کئے گئے تھے، اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ مذکورہ بالا چاروں اصولوں کی ہیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اصولوں سے

انحراف یہ دونوں چیزوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظام زندگی کو تغیر کرنے میں مسلمانوں کی بھری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر ہاتھ رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی درست ہو سکتی ہے۔ یہ نصیحتِ صحیح اس تقریب کے خاتمه پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقہ سے مسلمانوں کو تنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری پیش رو امت دین کے ان بنیادی اصولوں سے مخالف ہو کر جس پستی میں گر جگی ہے اس سے محبت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پس پشت ڈال رہا ہے، اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچے لگ جاتا ہے جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان نہ ہوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حامکوں سے کتاب و سنت کی سند پوچھئے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے تو وہ ان خرافیوں میں جلا ہونے سے کسی طرح نہ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل جلا ہوئے۔ ۱

باب ۲

معنى خلافت

اسلام کے سیاسی نظریہ ہی میں اس کے پورے نظام حیات میں انسان کے خلیفہ اللہ ہونے کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ پچھلے ابواب میں اسلام کے سیاسی قلمبندی کی بھی ہے اس میں بھی اس تصور کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ لغت اور قرآن کے استعمالات کی روشنی میں اس لفظ کے معنی کی پوری پوری تحقیق کی جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ایک گروہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ لوگوں کو باور کرائے کہ خلافت کے معنی نیابت نہیں بلکہ جائشی ہے اور قرآن میں اس لفظ سے مراد انسان کو اختیارات کی تفویض اور دنیا کے انعام کے لئے حق نیابت نہیں بلکہ زمین پر انسان کی آمد سے پہلے جو حقوق یہاں بستی تھی اس کی جائشی ہے۔ یہ استدلال مکرین حدیث کی طرف سے خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس گروہ کے ایک سرخیل نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو جو خلافت اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھی وہ اس معنی میں نہ تھی کہ اللہ نے ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا، بلکہ اس معنی میں تھی کہ ان کو اپنے سے پہلے ساکنان زمین کا جائشیں بنایا گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ خلافت کے معنی صرف جائشی کے ہیں، اس لئے خلافت ایسے کا تصور ہے معنی ہے۔ اس نادر استدلال کو مجذوبین، مکرین حدیث اور لادینیت کے علمبردار بار بار پیش کرتے رہے ہیں اور چونکہ اب بھی کبھی کبھی یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں اس لئے اس مسئلہ کا صاف ہو جانا بہت ضروری ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے ترجمان القرآن میں اس طرز استدلال پر گرفت کی تھی۔ ایک دوسرے امل قلم نے مولانا کے جواب پر تعاقب کیا جس کے جواب میں مولانا مودودی نے یہ مضمون لکھا جو ترجمان القرآن کے ذی القعدہ ۱۳۵۲ مطابق فروری ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

کے بعد۔ ”

خلافت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ منصب عمرہ مر جائے یا موجود نہ ہو۔ امام رافیہ کی تھیں خلاف فلان فلان قائم بالامر عنہ اما معہ واما بعد ”فیلان شخص قیاس میں کا ذمہ ہوا لیعنی اس کی مرزا سے کارپرواز ہوا خواہ اس کے ساتھ یا اس

خلافت کی بمعنی سبب سے پہلے ہم کو خلاف عرب کی طرف رجوع کر کے یہ تحقیق کرنا چاہئے کہ کیا ان الواقع میں اس لفظ کے معنی مرزا ”جاٹھنی“ ہی ، کے ہیں یا اس کے معنی یا بات کے بھی آئے ہیں۔

لغوی بحث  
اہم راغب اصناف انہی مژدوات میں لگتے ہیں:  
• والخلافت فیابہ عن الخبر اما لغبۃ المذوب عنه واما لعجزه  
واما لتشريف المستخلف  
خلافت کی درست کی یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے بھروسے کے سبب سے وجہ سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے بھروسے کے لئے جسے غیفر یا یا گیا ہے۔  
یا اس شخص کو بزرگ عطا کرنے کے لئے جسے غیفر یا یا گیا ہے۔  
لیعنی (Lane) بنے ائمہ مشهور لفظ دامتہ مرس (Successor) Arabic English Lexicon) کے بھی لگتے ہیں۔

## معنی خلافت

اس مادے سے جو ابواب مشتق ہوئے ہیں ان کی خاصیتوں سے اس کے معنی میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔

خلف خلافہ کے معنی خلیفہ ہونے یا بعد میں آئے یا پیچے رہنے کے ہیں۔ خلفہ خلافہ کان خلیفته وبقیٰ بعدہ وجاء بعدہ (تاج العروس) قرآن مجید میں ہے۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرَثُوا الْكِتَابَ (اعراف: ۱۶۹) یعنی ”ان کے بعد ایسے نافق آئے یا ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے۔“ وقال موسیٰ لَا خَيْرٌ لِّهَارُونَ إِخْلَافُنِي فِي قَوْمٍ (اعراف: ۱۳۲) ”اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تو میری قوم کے اندر میرے بعد میرا جانشین یا نائب ہو۔“ قالَ بَنْسَمًا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي (اعراف: ۱۵۰) ”موسیٰ نے کہا کہ میرے بعد تم نے میری بہت بری نیابت کی۔“ وَلَوْ نَشِاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ (الزخرف: ۶۰) ”اگر ہم چاہیں تو زمین میں تم میں سے ملائکہ پیدا کریں جو تمہاری جگہ آباد ہوں۔“

خلاف کے معنی پیچے رہ جانے کے ہیں۔ ما كان لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمِنْ حَوْلِهِمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (التوبہ: ۱۲۰)

اخلف کے معنی کھوئی ہوئی جیزا اپس دینے یا دلانے یا اس کا بدل عطا کرنے کے ہیں اَخْلَفَ اللَّهَ لَكُمْ وَعَلَيْكُمْ خَيْرًا إِذَا أَبْدَلْتُمْ بِمَا نَهَبْتُ عَنْكُمْ وَعَوْضَكُمْ عَنْهُ (نہایہ ابن اشیر) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يَخْلُفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سaba: ۳۹) ”جو تم خرچ کو گے اللہ اس کا ثامن البدل تم کو دے گا اور وہ بہترین رازق ہے۔“ حدیث میں ہے قَكْفُلَ اللَّهُ لِلْمَغَازِيِّ أَنْ يَخْلُفَ نَفْقَتَهُ ”اللہ نے غازی کے لئے ذمہ لیا ہے کہ جو کچھ وہ خرچ کرے گا اللہ اس کا بدل عطا کرے گا۔“

خلف اور استخلف کے معنی اپنا خلیفہ بنانے کے ہیں، یقال خلف فلانا اذ جعله خلیفته کا استخلف (تاج العروس)

استخلف کہہ کر اگر منوب عنہ کی تصریح نہ کی گئی ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ اپنا

خليفة ہایا' استخلف فلانا الی جعله خليفة له اور اگر منوب عنہ کی تصریح ہو تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص کا جانشین ہایا جس کا ذکر کیا گیا ہے' استخلف فلانا من فلان ای جعله مکانہ (اقرب الموارد) ہیں جہاں قرآن مجید نے شخص استخلاف کا ذکر کیا ہے اور مستخلف له کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا مثلاً 'لیستختلفنم فی الارض كما استخلف الذين من قبلهم' (النور: ۵۵) ایسے مقامات پر استخلاف کے معنی بھی ہوں گے کہ اللہ نے اپنا خلیفہ ہایا۔ اور جہاں مستخلف له کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے کی جگہ یا دوسرے کے بعد خلیفہ ہایا۔ لیکن واضح رہے کہ جب کبھی پچھلے نائب کو ہنا کراس کی جگہ دوسرانائب مقرر کرنے کا ذکر کیا جائے گا تو اس میں دونوں مفہوم شامل ہوں گے یعنی اس کا مفہوم یہ بھی ہو گا کہ حاکم اعلیٰ نے فلاں شخص کو فلاں شخص کی جگہ مقرر کیا اور یہ بھی کہ اس نے فلاں شخص کے بعد فلاں شخص کو اپنا نائب مقرر کیا۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ استخلف الملک اللورد اردن بعد اللورڈ رینک فی ولایۃ الہند تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ پاوشہ نے لارڈ ارون کو لارڈ رینک کے بعد اس کی جگہ ہندوستان کا وائسرائے ہایا اور یہ بھی ہوں گے کہ اس نے ارون کو وینڈنگ کے بعد ہندوستان کی ولایت میں اپنا وائسرے مقرر کیا۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ بیک وقت صادق نہ آ سکیں ہیں ان یہاں یہ بکم و یستختلف من بعد کم یا یشاء کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو دے دے گا اور یہ بھی کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو اپنا خلیفہ ہاتا لے گا۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے کوئی امر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مفہوم لینے میں مانع نہیں ہے۔

جعله خليفة کے معنی صرف خلیفہ ہانے کے ہیں۔ خلیفہ کے معنی خواہ نائب کے ہوں یا جانشین کے، دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس کا انتام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ کوئی مستخلف له اور منوب عنہ بھی ہو، عام اس سے مقدر ہو یا نہ کور۔ ہیں جس جگہ جعل خلیفہ کے ساتھ قرآن مجید نے

مسئلہ کی تصریح کر دی ہے وہاں تو مفہوم واضح ہے۔ مثلاً "وَذَكْرُوا إِذْ جَعَلْتُمْ خَلْفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمٍ عَدَ" (اعراف: ۶۹) اور "وَذَكْرُوا إِذْ جَعَلْتُمْ خَلْفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنظُرٍ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" (یونس: ۱۳) لیکن جہاں مختلف لہ کی طرف قطعاً "کوئی اشارہ نہیں ہے وہاں ایک مسئلہ کی تصریح کر دیا گیا" مثلاً "يَا نَاؤْ دَانَا جَعَلْنَا خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ" (ص: ۲۶) اور "وَيَجْعَلُكُمْ خَلْفَاءَ الْأَرْضِ" (النمل: ۲۲) اور "وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ الْأَرْضِ" (انعام: ۱۶۵) اور انہی جاعل فی الارض خلیفۃ (بقرہ: ۳۰) اس طرح کی تمام آیات کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں انسان یا انسانوں کو کس کا خلیفہ بنانے کا ذکر ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ پچھلی مخلوقات یا گذشتہ اقوام، یا شاہان پیشین کا خلیفہ تو قطع نظر اس سے کہ یہ ایک تکلف ہے، بعض آئتوں میں یہ معنے کھپتے ہی نہیں۔ مثال کے طور پر "وَيَجْعَلُكُمْ خَلْفَاءَ الْأَرْضِ" میں خلفاء کو زمین کی طرف مفہاف کیا گیا ہے جس کا الفاظی ترجمہ زمین کے خلفاء ہے۔ اس سے یہ معنے نکالنے کی کہاں ممکن ہے کہ زمین پر پہلے جو لوگ مستمکن تھے ان کے خلفاء؟ پھر انہی جاعل فی الارض خلیفۃ کے معنی اگر یہ لئے جائیں کہ "میں پچھلے ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنائے والا ہوں۔" تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں ان ساکنین ارض کا ذکر کیا ہے جن کی خلافت انسان کے پروردگری گئی ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ پیش کیجئے۔ اگر نہیں کیا تو فرمائیے کہ اسی صورت میں محض زبان اور ادب کے نقطہ نظر سے اس فقرے کا یہ مفہوم زیادہ اقرب الی الفہم ہے کہ "میں پچھلے مجبول الحال ساکنین ارض کا ایک خلیفہ بنائے والا ہوں۔" یا یہ کہ "زمین میں اپنا ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں؟" اگر سامع صرف عربی جانتا ہو اور ان عقلی مقدمات سے نا آشنا ہے محض ہو جنہیں مولانا ..... نے ترتیب دے کر ایک نتیجہ اقتد کیا ہے تو اس فقرے کو من کروہ ان دونوں معنوں میں سے کون سے معنی مراد ہے؟

## خلافت میں فرمان روائی کا مفہوم

اس لغوی تحقیق کے بعد میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ خلافت کے اس مفہوم پر غور کیجئے جس کو خود آپ نے اور مولانا ..... نے مراد لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

”خلافت فی الارض سے مراد زمین کی سلطنت و حکومت کی جانشی ہے۔“

مولانا ..... انس جاعل فی الارض خلیفۃ کا ترجمہ ”میں زمین میں ایک  
باو شاہ بنانے والا ہوں۔۔۔“ کرتے ہیں اور اس پر نوٹ لکھتے ہیں:

”حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے پادشاہ ہوئے گئے تھے۔“  
غور فرمائیے کہ خلافت کے معنی تو محض جاشنی یا قائم مقامی یا بعد میں آنے کے  
ہیں۔ پھر اس میں پادشاہی اور فرمازدواجی کا مفہوم کہاں سے آگیا؟ اگر نفس خلافت  
اس مفہوم سے خالی ہے اور یقیناً خالی ہے تو اس میں یہ مفہوم اس اختیاری سے آ  
سکتا ہے کہ خلیفہ کو خلافت کسی فرمازدا اور کسی سلطان سے ملی ہو۔ پھر جب انسان کو  
وہ خلافت ملی جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق سلطنت و فرمازدواجی کی  
جھلک ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ انسان جس کا خلیفہ ہوا وہ کوئی فرمازدواجی۔ اب  
فرمائیے کہ کیا قرآن سے علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین  
پر کوئی ایسی مخلوق تھی جس میں فرمازدواجی کی شان تھی؟ فرمازدواجی کے لئے علم،  
حکمت، اختیار، ارادہ، قدرت وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ ان کے بغیر  
زمین اور اس کی موجودات پر فرمازدواجی نہیں ہو سکتی۔ علمی تحقیقات سے ثابت ہو  
چکا ہے کہ اس کرہ خاکی پر انسان سے پہلے کوئی مخلوق ایسی موجودہ تھی جو ان صفات  
سے متصف ہوتی۔ اسی کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے۔ وہ ہم کو بتاتا ہے کہ انسان  
سے پہلے خدا کی جو مخلوق سب سے افضل تھی یعنی ملا کہ جن کو عبد مکرمون  
(الأنبياء: ۲۶) کہا گیا ہے۔ اس کا بھی یہ حال تھا کہ وہ علم اشیاء سے بے خبر تھی ثم  
عرضهم علی الملائكة فقال إنّي بِاسْمِكَ هُوَ الْأَوَّلُ إِنَّكُمْ مَصْدِقُنِي ○ قَالُوا سَبِّحْنَاكَ

لا عِلْمَ لِنَا إِلَّا مَا أَعْلَمْتُنَا۔ (بقرہ: ۳۱-۳۲) اور ارادہ و اختیار کی آزادی سے بالکل محروم تھی لا یعصونَ اللہَ مَا امْرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا یَوْمَرُونَ۔ (التحیرم: ۶) دوسری حقوق جن تھے، سو ان کے متعلق کوئی بات قرآن مجید نے ایسی بیان نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہوا کہ ان کو زمین کی فرمائروائی حاصل تھی۔ رہے حیوانات و بیات و جمادات، تو ان کا حال آپ جانتے ہیں۔ پھر آخر وہ کون سی حقوق تھی جس کی خلافت، زمین کی فرمائروائی کے اعتراض کے ساتھ انسان کو حاصل ہوئی؟

تاہم اگر مان لیا جائے کہ یہ پرانے ساکنین ارض ہی کی خلافت ہے اور وہ ساکنین ارض انسان سے پہلے زمین کے فرمائروائی تھے، تو کیا وہ بالا صالت فرمائروائی تھے، یا ان کی فرمائروائی بھی ناسماں تھی؟ پہلی شق تو آپ اختیار نہیں کر سکتے، کیونکہ اسلامی عقیدہ کی رو سے بالا صالت اور بالذات فرمائروائی صرف حق تعالیٰ ہے اور اس کے سواب کی فرمائروائی محض عطا تھی ہے۔ اب رہی دوسری شق تو اس کو اختیار کرنے کی صورت میں یا تو آپ کو خلافت در خلافت کا ایک لامتناہی سلسلہ ماننا پڑے گا، یا پھر یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ فرمائروائی کی شان خواہ یکے بعد دیگرے کتنے ہی خلفاء کو ملی ہو، بہرحال اس کا سرچشمہ وہی ذات حق تعالیٰ ہے اور خلافت میں بادشاہی کی جھلک اسی وقت آ سکتی ہے جب کہ وہ خلافت الہی ہو۔

## قرآنی اشارات

اب میں آپ کو ان قرآنی اشارات کی طرف توجہ دلاؤں گا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے وہ دراصل خلافت الہی ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (آلہین: ۲) اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، قال یا بلیس ما منمک ان تسجد لاما خلقت بیتی (ص: ۷۵) اس میں اپنی طرف سے روح پھوکی، ثم سوہ و نفح فیہ من روحہ (السجده: ۹) اس کو علم کی نعمت سے سرفراز کیا، وعلم ادم الاسماء كلها (البقرہ: ۳۱) زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو اس کے

لَمْ يُنْهَىٰ سَخْرَىٰ كُمَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (الْجَاهِيَّةُ : ۱۳)

ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پا یہ سمجھیں کہ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ یہ حکم سورہ حس کے آخر میں جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ خاص طور پر قائل غور ہے۔

إذ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ أَنِّي خَلَقَ بَشَرًا مِنْ طِينٍ ○ هَلَا سَوْيَتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ  
مِنْ رُوحٍ فَقَعُوا لَهُ ساجِدِينَ ○ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ○ إِلَّا  
أَهْلِئِسْ طَاسْ تَكْبِيرٍ وَكَانَ مِنَ الْكُفَّارِينَ ○ قَالَ يَا أَبْلِيسَ مَا مَنْعَكَ لَنْ تَسْجُدَ  
لِمَا خَلَقْتَ بِيْدِيْ طَاسْ تَكْبِيرٍ أَمْ كَنْتَ مِنَ الْعَالَمِينَ ○ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ طَاسْ  
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ○ قَالَ فَأَخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ  
(ص: ۱۷-۲۷)

جیکہ تیرے رب نے ملاٹکہ سے کماکہ میں مٹی سے ایک بشریدا کرنے والا ہوں، پس جب میں اس کو پورا ہنا لوں اور اس کے اندر راپتی روح سے کچھ پھوک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ چنانچہ تمام ملاٹکہ نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ گھنڈ میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس کس چیز نے تجھے اس ہستی کو سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بھایا ہے؟ تو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا ہے یا واقعی تو کچھ بڑے لوگوں میں سے ہے۔ اس نے کماکہ میں اس سے بھڑھوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تو یہاں سے تو نکل جا کیونکہ تو مردود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یعنی وہ قادر ت

اور صحتِ الہی کا مظرا تم تھا اور اس کے اندر خود اپنی طرف سے ایک خاص روح پھوکی تھی اور ایک محدود بیانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو درجہ فوق تمام خود باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر انسان کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرشتوں نے اس معاملہ میں کچھ اپنے خلوك ہیش کئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے انسان کی سب سے افضل صفت یعنی علم کا مظاہرہ کرایا۔ اس طرح جب خلافت کے لئے انسان کی الیت ثابت کر دی گئی تو فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی خلافت تسلیم کرو اور علامت تسلیم کے طور پر اسے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے اسے تسلیم کیا اور سر بسجود ہو گئے، مگر شیطان نے اس کی عوانت ماننے سے اکار کیا۔ اس لئے اس کو راندہ درگاہ کر دیا گیا۔

یہ تمام اشارات کیا نمایا نہ کر رہے ہیں؟ تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کا انعام کیا جاتا ہے۔ عام مقابلہ میں اس کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے۔ ہمایا جاتا ہے کہ وہ ہماری صفات کا مظرا تم ہے ہم نے اس میں اپنی طرف سے ایک خاص روح پھوکی ہے۔ حکم ہوتا ہے اور وہ بھی کس کو؟ فرشتوں کو کہ اس کو سجدہ کرو۔ ان سب پاؤں کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اس کو خلیفہ بنانے والے ہیں۔ ان تیاریوں کے ساتھ جس خلیفہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا، کیا وہ محض پرانے سا کہیں ارض عی کا خلیفہ تھا؟ اگر صرف بات اتنی عی تھی کہ پرانے بنتے والوں کی جگہ کسی دوسرے کو بسایا جا رہا تھا تو اس کے لئے فرشتوں کے سامنے اس کی خلافت کا اعلان کرنے اور یوں اس کی فضیلت کا مظاہرہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ملاتکہ کو یہ حکم کیوں دیا گیا کہ اس کو خاکی کے نو آباد کار کو، جو فقط دوسرے لوگوں کی جگہ لینے کے لئے جا رہا تھا، سجدہ کریں؟

### خلافتِ الہی سے مراد کیا ہے؟

دوسری بات جو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوئی ہے، خلافتِ الہی

کے مفہوم پر صاف روشنی ڈالتی ہے۔ فرمایا:

اَنَا عَرَضْنَا الْاِمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالارضِ وَالجَبَالِ فَابْيَنُ اَنْ يَحْمِلُنَّهَا  
وَاسْفَقُنَّ مِنْهَا وَحْمَلُنَّهَا الْاِنْسَانُ طَاْنَهُ كَانَ ظَلْوَمًا جَهْوَلًا۔

(احزاب: ٢٤)

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا مگر  
انسوں نے اس کا پار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان  
نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر تکلا۔

اس آیت میں بار امانت سے مراد اختیار (Freedom of Choice) اور  
ذمہ داری و جواب دی (Responsibility) ہے اور ارشاد الہی کا مطلب یہ  
ہے کہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں میں اس بار کو اٹھانے کی تاب نہ تھی،  
انسان سے پہلے کوئی مخلوق الہی نہ تھی جو یہ پوزیشن قبول کر سکتی۔ آخر کار انسان آیا  
اور اس نے یہ بار اٹھا لیا۔ اس بیان سے متعدد نکات نکلتے ہیں:

- ۱۔ انسان سے پہلے زمین و آسمان میں کوئی مخلوق بار امانت کی حامل نہیں  
تھی۔ انسان پہلی مخلوق ہے جس نے یہ بار اٹھایا ہے۔ لہذا منصب امانت میں  
وہ کسی مخلوق کا جانشین (Successor) نہیں ہے۔

- ۲۔ جس چیز کو سورہ بقرہ میں خلافت کہا گیا ہے وہی چیز یہاں امانت کے لفظ  
سے تعبیر کی گئی ہے۔ کیونکہ دہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت  
کے اہل نہیں ہو، اس کا اہل انسان ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و  
آسمان کی کوئی مخلوق ہماری امانت کا پار اٹھانے کی اہل نہ تھی، صرف انسان  
اس کا مستقبل ہوا۔

- ۳۔ خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ  
نظام عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین  
کا فرمازدا ہے۔ مگر اس کی فرمازداگی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ

(Delegated) ہے۔ لہذا اللہ نے اس کے اختیارات منوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعمیر کیا ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات منوضہ کو استعمال کرتا ہے اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشرع کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشنے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔"

(Person Excercising Delegated Powers)

---

باب ۵

## اسلامی تصور قومیت

□ اسلامی قومیت کا حقیقی مضمون

تقریب ملک سے پہلے تھوڑہ ہندوستان کے سیاسی مباحثت میں سب سے اہم مسئلہ قومیت کا تصور رہا ہے۔ مسلمان بھیش سے اپنا جد اگانہ تصور قومیت رکھتے ہیں اور انہوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بننے والے کا تصور قبول نہیں کیا ہے لیکن بیسویں صدی میں عربی اثرات اور ہندو سیاست کی وجہ سے تھوڑہ قومیت کا فتنہ ابھرا اور اس کے پیسے دور رس اثرات تعلیم یافتہ طبقے پر پڑے۔ علامہ اقبال، مولانا مودودی اور دوسرے مظہرین نے اس جمیع کا جواب دیا اور تھوڑہ قومیت کے تصور پر شریدہ ترین تنقید کی۔ یہ اسی بروقت نگری رہنمائی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تھوڑہ قومیت کے فتنہ سے بچ گئے اور دو قوی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک بیٹھا ہوئی۔ مولانا مودودی کی تحریرات نے اس پیداواری کے پیدا کرنے میں خصوصی حصہ ادا کیا۔ ہم اس مجموعہ کے موضوع کی مناسبت سے مولانا کے دو مفہامیں اس میں شامل کر رہے ہیں۔ یہ مفہامیں ترجمان القرآن پابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۷ء و پابت جون ۱۹۴۸ء سے لئے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے یہ مفہامیں دوسرے مفہامیں کے ساتھ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں اور بلاشبہ لاکھوں افراد کے ذہنوں کو متاثر کر چکے ہیں۔

## اسلامی تصور قومیت

وہ حکمت<sup>۱</sup> سے مدنیت کی طرف انسان کا پہلا قدم اٹھتے ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ کثیرت میں وحدت کی ایک شان پیدا ہو اور مشرک اغراض و مصالح کے لئے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کریں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسی اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بست بڑی تعداد اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی مجموعہ افراد کا نام "قوم" ہے۔ اگرچہ لفظ "قوم" اور "قومیت" اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں حدیث الحد ہیں۔ مگر جس معنی پر ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تمدن قدیم ہے۔ " القوم" اور "قومیت" جس بیت کا نام ہے وہ باہل، مصر، روم اور یونان میں بھی ولی ہی تھی جیسی آج فرانس، انگلستان، جermany اور اٹلی میں ہے۔

### قومیت کے غیر منفك لوازم

اس میں شک نہیں کہ قومیت کی ابتداء ایک مخصوص جذبہ سے ہوتی ہے، یعنی اس کا مقصد اول یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشرک مفاد و مصالح کے لئے عمل کریں اور اجتماعی ضروریات کے لئے ایک "قوم" بن کر رہیں۔ لیکن جب ان میں "قومیت" پیدا ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر "عصیت" کا رنگ

اس میں آ جاتا ہے اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصیت" میں بھی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک قوم اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو ایک رشتہ اتحاد میں مسلک کرے گی یا بالفاظ دیگر، اپنے گرد " القومیت" کا حصار جن لے گی تو لازماً وہ اس حصار کے اندر والوں اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملہ میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلہ میں اپنے کی حمایت کرے گی۔ جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف واقع ہو گا تو وہ اپنے کے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر فیر کے مفاد کو قربان کر دے گی۔ انسی وجہ سے ان میں صلح بھی ہو گی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں قومیت کی حد فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام عصیت و حیثیت ہے اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

### قومیت کے عناصر ترکیبی

قومیت کا قیام وحدت و اشتراک کی کسی ایک جنت سے ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی جنت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں الی زبردست قوت رابطہ و ضابطہ ہونی چاہئے کہ اجسام کے تعدد اور نقوص کے نکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلر، ایک خیال، ایک مقصد اور ایک عمل پر جمع کر دے اور قوم کے مختلف کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پوستہ کر دے کہ وہ سب ایک شخص چنان بن جائیں اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا تسلط و غلبہ حاصل کرے کہ قوی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحدوں اور ہر قربانی کے لئے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جستیں بہت سی ہوئی ممکن ہیں، لیکن آغاز عمد تاریخ سے آج تک دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں ان سب کی تغیر بجو ایک اسلامی قومیت کے، حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوئی ہے اور اس غیر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہو گئے

ہیں:

اشتراك نسل، جس کو "نسلیت" کہتے ہیں۔

اشتراك مرزبوم، جس کو "و میت" کہتے ہیں۔

اشتراك زبان، جو دعوت خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے قومیت کی تغیری میں خاص حصہ لیتا ہے۔

اشتراك رنگ، جو ایک رنگ کے لوگوں میں یک جنسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر یہ احساس ترقی کر کے ان کو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز و احتساب پر آمادہ کر دیتا ہے۔

معاشی اغراض کا اشتراك، جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتا ہے اور جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنے معاشی حقوق و منافع کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

نظام حکومت کا اشتراك، جو ایک سلطنت کی رعایا کو مشترک نظم و نت کے رشتہ میں مشلک کرتا ہے اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلہ میں حدود فاملہ قائم کر دیتا ہے۔

قدم تین عمد سے لے کر آج بیسوں صدی کے روشن زمانے تک، جتنی قومیتوں کے عناصر احصیلہ کا آپ سمجھنے کریں گے، ان سب میں آپ کو یہی مذکورہ بالا عناصر طیئیں گے۔

اب سے دو تین ہزار برس پہلے یونانیت، رومیت، اسراہیلیت، ایرانیت وغیرہ بھی انہی بنیادوں پر قائم تھیں جن پر آج جرمنیت، اطالویت، فرانسیسیت، انگریزیت، امریکنیت، رومنیت اور چاپانیت وغیرہ قائم ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تغیر کی گئی ہیں انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسان کے لئے ایک شدید

عجیب ہیں۔ انہوں نے عالم انسان کو سچھتوں ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور یہی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جاسکتا ہے مگر دوسرے حصہ میں کسی طرح تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نسل دوسری نسل میں نہیں بدل سکتی۔ ایک وطن دوسراؤطن نہیں بن سکتا۔ ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے۔ ایک رنگ دوسری رنگ نہیں بن سکتا۔ ایک قوم کی معاشری اغراض بینہ دوسری قوم کی اغراض نہیں بن سکتیں۔ ایک سلطنت کبھی دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیں ان بیوادوں پر تغیر ہوتی ہیں، ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سہیل نہیں لکھ سکتی۔ قوی عجیبیت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، مزاحمت اور منافست کی ایک رائی سمجھش میں جلا رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آہیں میں لڑو کر فنا ہو جاتی ہیں اور پھر انہی بیوادوں پر دوسری قومیں ایسے ہی ہٹکھے برپا کرنے کے لئے اٹھو کرڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد، بد امنی اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے، خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے، شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن کا ٹھکار کرتا ہے۔

### عجیب جاہلیہ

اس قسم کی قومیت کا فطری اعتقاد یہ ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عجیبیت پیدا کرے۔ وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے مقابلت اور نفرت برختنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق، صداقت، دیانت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات کہ ایک شخص کالا ہے، گورے کی نظر میں اسے تغیر ہمارتی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان ایشیائی ہے، فرمگی کی نفترتوں اور جاہلانہ دراز دستیوں اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ آئں شائن ہیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ جو من اس سے نفرت کرے۔

تشکیدی۔ کا محض سیاہ قام جبھی ہونا، اس کو جائز کر دیتا ہے کہ یورپیں کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے۔ امریکہ کے مذہب باشندوں کے لئے یہ قطعاً جائز ہے کہ وہ جیشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں کیونکہ وہ جبھی ہیں۔ ان کو اپنے ملکوں میں نہ رہنے دیں، عام سڑکوں پر نہ چلنے دیں، تعلیمی اداروں میں تعلیم نہ پانے دیں اور دوست تک سے محروم رکھیں۔ جو من کا جرمن ہونا اور فرانسیسی کا فرانسیسی ہونا اس بات کے لئے کافی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے محاسن یکسر معاوضہ نظر آئیں۔ سرحد کے آزاد افغانیوں کا افغانی ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا، انگریز اور فرانسیسی کو اس کا پورا حق بخش دیتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے بجم بر سائیں اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں، خواہ یورپ کے مذہب شریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ غرض یہ جسی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف سے اندھا بنا دیتی ہے اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی تو میتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل، کہیں سچ اور کہیں جھوٹ، کہیں کینگلی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ

۱) یہ پھوٹا لینڈ کے پامگ واؤ قبیلہ کا سردار تھا جس کو ایک یورپیں پر سزاۓ تازیانہ جاری کرنے کے جرم میں سلطنت برطانیہ نے حقوق ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ حالانکہ دیسی باشندوں کے ساتھ اس فوجی شخص کے افسوسناک برتابہ کا خود برطانوی ہائی کمشنر کو بھی اعتراف تھا۔ بعد میں غریب تشکیدی کو صرف اس وقت بحال کیا گیا جب کہ اس نے ہیئت کے لئے یہ عمد کر لیا کہ وہ کبھی کسی ایسے مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے گا جس کا تعلق کسی یورپیں سے ہو۔ مگر اسکی کوئی شرط اس عمد نامہ میں نہ رکھی گئی کہ یورپیں حضرات بھی دیسی باشندوں کی جان دہال اور عزت دہال سے تعریض نہ فرمائیں گے۔

ہلائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کے پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا پیدا ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان۔ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدوڑت میں بھی کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے، کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی ممکنگی نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانپنا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نہیں میں دے گی۔ مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بین بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

### قومیت کے عناصر پر ایک عقلی تنقید

تحوڑی دیر کے لئے اس پلو سے قطع نظر کر لجھے۔ یہ جتنے اشتراکات آج قومیت کی بنیاد بننے ہوئے ہیں ان کو خود ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھئے اور غور کیجئے کہ آیا یہ بجائے خود کوئی مضبوط عقلی بنیاد بھی رکھتے ہیں یا ان کی حقیقت محض سراب تھیں کی ہے۔

نسلیت کیا ہے؟ محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطہ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی نطفہ پھیل کر خاندان بنتا ہے، پھر قبیلہ، پھر نسل۔ اس آخری حد یعنی نسل تک پہنچنے پہنچنے انسان اپنے اس باپ سے جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی موروثیت محض ایک خیالی چیز ہے جاتی ہے۔ نام نہاد "نسل" کے اس دریا

میں بیرونی خون کے بہت سے نہیں نالے اکمل جاتے ہیں اور اگر کوئی صاحب عقل و علم انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمہ سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملٹر کے ہاد جو د خون کے اشتراک کی بنا پر انسان ایک "نسل" کو اپنے لئے مادہ اتحاد قرار دے سکتا ہے، تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بنائے وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملتا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی نسل اور ایک ہی اصل کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اور پیدا کر کر کمیں نہ کمیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ آریت اور سامیت کی تقسیم کیسی؟

مرزوکوم کے اشتراک کی حقیقت اس سے زیادہ موہوم ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مرلح سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا دھن قرار دے تو شاید وہ کسی ملک کو اپنا دھن نہیں کرہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے گرد ملکوں اور کوسوں اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط سمجھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا دھن ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظری علی ہے، ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا دھن کرنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مرلح گز کا دھن بھیل کر ہزاروں مرلح گز بن سکتا ہے، اسی دلیل کی بنا پر وہ بھیل کر پورا کرہ ارضی بھی بن سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنے زاویہ نظر کو ٹکڑہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا اور پہاڑ اور سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود فاصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان فرق کیا ہے، سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزاء ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دے دیا کہ وہ اسے ایک خالص خطہ

میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں، سارا کہہ زمین میرا  
وطن ہے، جتنے انسان رفع مسکون میں آپا دھیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے  
سیارے پر میں وہی پیدا کئی حق رکھتا ہوں، جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں  
جمال میں پیدا ہوا ہوں؟

اشتراك زبان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولنے والے ہیں وہ  
باصی تقاضہ اور تبادلہ خیالات کے زیادہ موقع رکھتے ہیں۔ اس سے اجنبیت کا پروہ  
بڑی حد تک اٹھ جاتا ہے، اور ایک زبان بولنے والے اپنے آپ کو ایک دوسرے  
کے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ مگر ادائے خیال کے وسیلہ کامشترک ہونا خود خیال  
کے اشتراك کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا  
ہے اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں تحریر ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف  
اس کے دس مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہو سکتے ہیں اور کچھ بعد نہیں کہ اس  
ایک ہی زبان کے بولنے والے ان مختلف خیالات کے معتقد ہو کر باہم مختلف ہو  
جائیں۔ لذاد حدت خیال جو حییعتنا " قومیت کی جان ہے، اشتراك زبان کی محاج  
نہیں ہے اور نہ اشتراك زبان کے ساتھ حدت خیال ضروری ہے۔ پھر ایک برا  
سوال یہ ہے کہ آدمی کی آدمیت اور اس کے ذاتی حسن و فتح میں اس کی زبان کو کیا  
دخل ہے؟ ایک جرمن بولنے والے شخص کو ایک فرنچ بولنے والے کے مقابلہ میں  
کیا محض اس بنا پر ترجیح دی جاسکتی ہے کہ وہ جرمن زبان بولے ہے؟ دیکھنے کی چیز اس  
کا جو ہر ذاتی ہے نہ کہ اس کی زبان۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ  
صرف یہ کہ ایک ملک کے انتظامی معاملات اور عام کاروبار میں وہی شخص مفید ہو  
سکتا ہے جو اس ملک کی زبان جانتا ہو۔ مگر انسانیت کی تقسیم اور قومی امتیاز کے لئے  
یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

انسانی جماعتوں میں رنگ کا امتیاز سب سے زیادہ لغو اور محمل چیز ہے۔ رنگ  
محض جسم کی صفت ہے، مگر انسان کو انسان ہونے کا شرف اس کے جسم کی بنا پر

نہیں، اس کی روح، اس کے نفس ناطقہ کی بنا پر ہے، جس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ پھر انسان اور انسان میں زردی اور سرخی، سیاہی اور سپیدی کا امتیاز کیسا؟ ہم کال گائے اور سپید گائے کے دودھ میں کوئی فرق نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کا دودھ ہے نہ کہ اس کا رنگ۔ لیکن عقل کی بے راہ روی کا براہو کہ اس نے ہم کو انسان کی نفسی صفات سے قطع نظر کر کے اس کی جلد کے رنگ کی طرف متوجہ کر دیا۔

معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خود غرضی کا ایک ناجائز پچھہ ہے۔ قدرت نے اس کو ہرگز پیدا نہیں کیا۔ آدمی کا پچھہ کام کرنے کی قوتیں ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جدوجہد کے لئے اسے ایک وسیع میدان ملتا ہے اور زندگی کے بے شمار وسائل اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی معیشت کے لئے صرف اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے رزق کے دروازے کھلیں، بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کے لئے وہ بند ہو جائیں۔ اسی خود غرضی میں انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے مشترک ہو جانے سے وہ وحدت پیدا ہوتی ہے جو انسیں ایک قوم بننے میں مدد دیتی ہے۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشی اغراض کا ایک حلقة قائم کر کے اپنے حقوق و مفاؤں کا تحفظ کر لیا۔ لیکن جب اس طرح بہت سی جماعتوں اپنے گرد اسی قسم کے حصاء سمجھنے لیتی ہیں تو انسان پر اس کے اپنے ہاتھوں سے عرصہ حیات تک ہو جاتا ہے۔ اس کی اپنی خود غرضی اس کے لئے پاؤں کی بیڑی اور ہاتھ کی ہٹکوی بین جاتی ہے۔ دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش میں وہ خود اپنے رزق کی سنجیاں گم کر دیتا ہے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے یہ منظر موجود ہے کہ یورپ، امریکہ اور چین کی سلطنتیں اسی کاخیاڑہ بمحکت رہی ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معاشی قلعوں کو کس طرح سمار کریں جن کو انہوں نے خود ہی حفاظت کا بہترین وسیلہ سمجھ کر تعمیر کیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھیں گے کہ کب معیشت کے لئے حلقوں کی تقسیم اور ان کی بنا پر قوی امتیازات کا قیام ایک

غیر عاقلانہ فعل ہے؟ خدا کی وسیع زمین پر انسان کو اپنے رب کا فضل جلاش کرنے کی آزادی دینے میں آخر کون سی قباحت ہے؟

نظام حکومت کا اشتراک بجائے خود ایک ناپائیدار اور ضعیف البینان جائز ہے اور اس کی بنا پر ہرگز کسی محکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں غسلک کر کے ایک قوم بنا دینے کا خیال کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ سلطنت جب تک غالب و قاہر رہتی ہے، رعایا اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہتی ہے۔ یہ گرفت جہاں ڈھیلی ہوئی مختلف عناصر منتشر ہو گئے۔ سلطنت مغلیہ میں مرکزی طاقت کے کمزور ہونے کے بعد کوئی چیز ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنی الگ الگ سیاسی قویتیں بنا لینے سے نہ روک سکی۔ یہی خشن سلطنت عثمانیہ کا ہوا۔ آخری دور میں جوان ترک نے عثمان قومیت کا قصر تعمیر کرنے کے لئے بہت کچھ زور لگایا۔ مگر ایک ٹھیس لگتے ہی سب اینٹ پتھر جدا ہو گئے۔ تازہ ترین مثال آشنا، ہنگری کی ہے اور تاریخ سے بہت سی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد جو لوگ سیاسی قویتوں کی تعمیر و ممکن سمجھتے ہیں وہ محض اپنے تخيّل کی شادابی کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس تخفید سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نسل انسانی میں یہ جتنی تفریقیں کی گئی ہیں۔ ان کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف حسی اور مادی تفریقیں ہیں جن کا ہر دائرہ زادیہ نظر کی ہر وسعت پر ثبوت جاتا ہے ان کا قیام و بقا جہالت کی تاریکی، نگاہ کی محدودیت اور دل کی تنگی پر منحصر ہے۔ علم و عرفان کی روشنی جس قدر پھیلتی ہے، بصیرت کی رسائی جس قدر بڑھتی ہے، قلب میں جتنی جتنی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ مادی اور حسی پرے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ نسلیت کو انسانیت کے لئے اور وطنیت کو آفاقت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اختلاف رنگ و زبان میں جو ہر انسانی کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کی زمین میں خدا کے سب بندوں کی معاشری اغراض مشترک پائی جاتی ہیں۔ سیاسی نظامات کے دائروںے محض

چند سالے نظر آتے ہیں جو آفیاب اقبال کی گردش ہے روئے زمین پر چلتے پھرتے اور رکھتے بڑھتے رہتے ہیں۔

### اسلام کا وسیع نظر

ٹھیک یہی بات ہے جو اسلام کہتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی فرق کو تعلیم نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں:

خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها وبث منہما رجالاً كثیر  
ونساء۔ (النساء: 1)

خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بنت سے مردوں اور عورتوں کو (دنیا میں) پھیلا دیا۔

تمہارے درمیان مرزیوم اور مولود و مدفن کا اختلاف کوئی جو ہری چیز نہیں ہے۔ اصل میں تم سب ایک ہی ہو۔

وهو الذي انشاكم من نفس واحدة فمستقر و مستودع۔ (الانعام: ٩٨)

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کا ایک ٹھکانہ ہے اور ایک جگہ اس کے پر دنیا کی ہے۔

اس کے بعد نسل اور خاندان کے اختلاف کی بھی یہ حقیقت بتلادی کہ:

يَا يَهُآ النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكْرٍ وَإِنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شَعُوبًا وَقَبَائِيلَ لِتَعْارِفُوا طَاطَانَ الْكَرْمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْرَبُونَ۔ (المجرات: ١٣)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت ہے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنایا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

یعنی یہ شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف کے لئے ہے، آپس کے بغض،

ایک دوسرے پر فاخت، ایک دوسرے سے جھوٹے کے لئے نہیں ہے۔ اس اختلاف میں انسانی اصل کی وحدت کو نہ بھول جاؤ۔ تم میں اگر کوئی حقیقی تفریق ہے تو وہ اخلاق و اعمال کی نیکی اور بدی کی بنا پر ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ گروہوں کی تفریق اور جماعتوں کا اختلاف خدا کا عذاب ہے جو تم کو آپس کی دشمنی کا مزہ چکھاتا ہے:

**اویلسکم شیعا و یزدیق بعضكم باس بعض۔ (الانعام: ٦٥)**

یا تو تم کو گروہ گروہ بناوے اور تمہیں ایک دوسرے کی قوت کا مزہ چکھائے۔

اس گروہ بندی کو اس نے من جملہ ان جرائم کے قرار دیا ہے جن کی بنا پر ”فرعون لعنت و عذاب کا مستحق ہوا۔

**ان فرعون علی الارض و جعل اهله اشیعا۔ (القصص: ٣)**

فرعون نے زمین پر تکبر کیا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

پھر کہا زمین خدا کی ہے، اس نے نوع انسانی کو اس میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا ہے، اس کی سب چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے، کچھ ضروری نہیں کہ انسان ایک خطہ کا بندہ بن کر رہ جائے۔ یہ وسیع زمین اس کے لئے کھلی ہوئی ہے، ایک جگہ اس کے لئے بھی ہو تو دوسری جگہ چلا جائے، جہاں جائے گا خدا کی نعمتیں موجود پائے گا۔

**ان جاعل فی الارض خلیفۃ۔ (البقرہ: ٣٠)**

(آدم کی تخلیق کے وقت خدا نے فرمایا کہ) میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر

۱۔ یہ آیت اس تاریخی جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون نے مصر کے باشندوں میں بعلی اور غیر بعلی کی تفرقی قائم کی اور دونوں کے ساتھ علف طرز عمل اختیار کیا۔

کرنے والا ہوں۔

الْمَتَرَانَ اللَّهُ سُخْرُكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ۔ (الْجُنُونُ: ٦٥)

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے تمہارے لئے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو زمین میں ہیں۔

الْمَتَكِنُ أَرْضَ اللَّهِ وَاسْعَةُ فَتْهَا جَرُوا فِيهَا۔ (النَّاسَاءُ: ٩٧)

کیا اللہ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں بھرت کر کے چلے جاتے۔

وَمَنْ يَهَا جَرُفْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدُ فِي الْأَرْضِ مِراثًا كَثِيرًا وَاسْعَةً

(النَّاسَاءُ: ١٠٠)

جو کوئی اللہ کی راہ میں بھرت کرے گا وہ زمین میں دافر جگہ اور کشائش پائے گا۔

آپ پورے قرآن کو دیکھ جائیے۔ اس میں ایک لفظ بھی آپ کو نیت یا دھیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے۔ تمام روئے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و صلاح کی طرف بلا تا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سر زمین کی۔ اس نے اگر کسی زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کیا ہے تو وہ صرف مکہ کی زمین ہے، لیکن اس کے متعلق بھی صاف کہہ دیا کہ سواعن العاکف فیہ والباد۔ (الْجُنُونُ: ٢٥) یعنی مکہ کے اصلی پا شندے اور پا ہر والے سب مسلمان برابر ہیں۔ اور جو مشرکین دہاں کے اصلی پا شندے تھے ان

۱۔ اسی وجہ سے فتحتے اسلام کے ایک گروہ نے مکہ کی سر زمین پر کسی کے حق ملکت کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت عمر رض الہ الٰی کو گھروں کے دروازے تک بند کرنے سے روکتے تھے تاکہ حاج و زائرین جہاں چاہیں اتریں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز مکہ میں مکاہت کرائے پر لینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے امیر مکہ کو فرمان لکھا تھا کہ لوگوں کو اس سے روکیں۔ بعض

کے متعلق کہا کہ وہ نجس ہیں، ان کو وہاں سے نکال باہر کرو۔ انما المشرکون نجس  
فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عاصمهم هذا۔ (التوبہ: ۲۸) مشرکین ناپاک ہیں لہذا  
اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اس تصریح کے بعد اسلام  
میں وطنیت کا کلی استعمال ہو جاتا ہے اور درحقیقت ایک مسلمان یہی کہہ سکے  
ہے کہ:

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خداۓ ماست

### عصبیت اور اسلام کی دشمنی

اسلام جب ظاہر ہوا تو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نسل و دہن  
کے تعصبات و احتیازات تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم ان تعصبات میں سب سے پیش پیش  
تھی۔ خاندانوں کے مفاخر اور نسبی و ذاتی وجاہتوں کے تخیلات ان کے اور  
اسلام کے درمیان شدت کے ساتھ حائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن اگر خدا کی  
طرف سے اترتا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اترتا۔ و قالوا لولا نزل هذا  
القرآن على رجل من القرىتين عظيم۔<sup>۱</sup> (الزخرف: ۳۱) ابو جمل سمجھتا کہ محمد ﷺ

باقیہ حاشیہ

فقماء نے کہا ہے کہ جس نے اپنے خرچ سے وہاں مکان بنایا وہ کرایہ لے سکتا ہے عمر میدان  
اور خرابات اور مکانوں کے حنوں پر سب کا حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد  
ہے کہ مکہ حرام لا یحفل بیع رباعها ولا اجر بیتها۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:  
انعامیں مناخ من سبق۔ یہ اس زمین کا حال ہے جس سے اسلام نے خصوصیت پیدا کی۔  
۱۔ "انوں نے کہا یہ قرآن دوستیوں میں سے کسی بھتی کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترتا؟"

رسالت کا دعویٰ کر کے اپنے خاندانی مفاخر میں ایک اور فخر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا قول تھا کہ ”ہم سے اور بتو عبد مناف سے مقابلہ تھا۔ ہم شواری میں ان کے حریف تھے۔ کھانے اور کھلانے میں، عطا اور بخشش میں ان کے برابر تھے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وحی آئی شروع ہوئی ہے۔ خدا کی قسم ہم تو محمد ﷺ کی تقدیق نہ کریں گے۔“ یہ صرف ابو جہل ہی کے خیالات نہ تھے بلکہ تمام مشرکین قریش کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ دین کا یہی عیب تھا کہ:

ذهب او قاطع ملک و نب از قریش و مکر از فضل عرب  
در نگاه او یکے بالا و پست با غلام خویش بریک خواں نشت  
قدر احرار عرب نشناخته با کلفتان حبس در ساخته  
احرار با اسوداں آ میختند آبروئے دود مانے ریختند  
اسی بنا پر قریش کے تمام خاندان نبی ہاشم سے گزر گئے اور نبی ہاشم نے بھی اسی قومی عصیت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی، حالانکہ ان میں سے اکثر مسلمان نہ تھے۔ شعب ابی طالب میں نبی ہاشم کو اسی لئے محصور کیا گیا اور تمام قریش نے اسی وجہ سے ان سے مقاطعہ کر لیا۔ جن مسلمانوں کے خاندان کمزور تھے ان کو شدید مظالم سے بچنے کے لئے جس کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور جن کے خاندان طاقتوں تھے وہ اپنی حق پرستی کی بنا پر نہیں بلکہ خاندانی طاقت کی بنا پر قریش کے ظلم و تم سے ایک حد تک محفوظ رہے۔

عرب کے یہودی انجیائے بنی اسرائیل کی پیشین گوئیوں کی بنا پر مدتوں سے ایک نبی کے مختار تھے۔ اُنہی کی دی ہوئی خبروں کا نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت شائع ہوئی تو مدینہ کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔ مگر خود یہودیوں کو جس چیز نے آپؐ کی تقدیق سے روکا وہ یہی نبی عصیت تھی۔ ان کو اس پر اعتراض تھا کہ آئے والا نبی نبی اسرائیل کے بجائے یہی اسماعیل میں کیوں آیا؟ اس تعلق نے ان کو یہاں تک مددوش کر دیا کہ وہ موحدین کو چھوڑ کر مشرکین کے ساتھی ہو گئے۔

یہی حال نصاریٰ کا تھا۔ آئے والے نبی کے وہ بھی مفتر تھے مگر ان کو توقع تھی کہ وہ شام میں پیدا ہو گا۔ عرب کے کسی نبی کے ماننے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ ہر قبیل کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچا تو اس نے قریش کے تاجریوں سے کہا کہ ”مجھے معلوم تھا کہ ایک نبی ابھی اور آئے والا ہے۔ مگر یہ امید نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہو گا۔“

متوقیٰ مصر کے پاس جب دعوت نامہ اسلام پہنچا تو اس نے بھی یہی کہا کہ ”ابھی ایک نبی آنا باقی ہے، یہ مجھے معلوم ہے مگر مجھے امید تھی کہ وہ شام میں آئے گا۔“

اسی تعصُّب کا دور دورہ عجم میں بھی تھا۔ خروپر دویز کے پاس جب حضور اکرم ﷺ کا نامہ مبارک پہنچا تو کس چیز نے اس کو غصب تاک کیا؟ یہی کہ ”ایک غلام قوم کا فرد اور پادشاہ عجم کو اس طرح بحاذب کرے!“ وہ عرب کی قوم کو ذیل سمجھتا تھا۔ انہا ماتحت خیال کرتا تھا۔ یہ بات ماننے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا کہ ایسی قوم میں کوئی حق کی طرف بلانے والا پیدا ہو گا۔

اسلام کے خلاف اس کے دشمن یہودیوں کے پاس سب سے بڑا کارگر جنہے یہی تھا کہ مسلمانوں میں قبائلی عصیت پیدا کریں۔ اسی بنیاد پر مدینہ کے منافقین سے ان کی سازباز تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے جنگ بیانث کا ذکر چیزیز کر انصار کے دونوں قبیلوں (اویس اور خزرج) میں عصیت کی ایک ایسی آگ بھڑکائی کہ تکواریں سکھنچنے کی نوبت آگئی۔ اسی پر یہ آہت نازل ہوئی کہ ..... پایاہا الذین امنوا ان تطیعوا فریقا مِنَ الْذِينَ اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین۔<sup>۱</sup> (آل عمران: ۱۰۰)

۱۔ مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مانو گے تو وہ تم کو ایمان سے کفر کی طرف پھیر دیں گے۔

یہی نسل و دملن کا تعصب تھا جس نے مدینہ میں قریش کے نبی کو حکمران دیکھ کر اور مهاجرین کو انصار کے باخون اور نخستاؤں میں پڑتے پھرتے دیکھ کر، مدینہ کے منافقین کو آتش ذیپ پا کر رکھا تھا۔ عبد اللہ بن ابی رکیس المนาافقین کما کرتا تھا کہ ”یہ قریش کے فقیر ہمارے ملک میں آ کر چھل پھول گئے ہیں۔ ان کی مثل الیکی ہے کہ کتنے کو کھلا پھا کر موٹا کر تاکہ بجھی کو پھاڑ کھائے۔“ وہ انصار سے کہتا تھا کہ ”تم نے ان کو اپنے سرچڑھا لیا ہے۔ اپنے ملک میں جگہ دی۔ اپنے اموال میں ان کو حصہ دیا۔ خدا کی تسمیہ آج تم ان سے ہاتھ روک لو تو یہ پڑتے پھرتے نظر آئیں گے۔“ ان کی ان باتوں کا جواب قرآن مجید میں اس طرح دیا گیا ہے:

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تَنْفَقُوا عَلَىٰ مِنْ عِنْدِ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفُضُوا طَوْلَةً  
خَزَانَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكُنْ لِلْمُنْفَقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ○ يَقُولُونَ لِنَّ  
رَجَعَنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لِيُخْرُجَنَ الْأَعْزَمُ مِنْهَا الْأَذْلَمُ طَوْلَةً اللَّهُ أَعْزَمُ وَلِرَسُولِهِ  
وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكُنْ الْمُنْفَقِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ (منافقون: ۷-۸)

یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر کچھ خرج نہ کرو تاکہ یہ تتر ہتر ہو جائیں۔ حالانکہ آسماؤں اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہے مگر منافقین اس کو نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم (میدان جنگ سے) مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔ حالانکہ عزت دراصل اللہ اور اس کے رسول اور مونوں کی ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں جانتے۔

یہی عصیت کا جوش تھا جس نے عبد اللہ بن ابی سے حضرت عائشہ پر تھت گلوائی اور خزرخ والوں کی حمایت نے اس دشمن خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کئے کی سزا پانے سے بچا لیا۔

## عصیت کے خلاف اسلام کا جہاد

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کفر و شرک کی جہالت کے بعد اسلام کی دعوت حق کا اگر کوئی سب سے بڑا دشمن تھا تو وہ یہی نسل و دمکن کا شیطان تھا اور یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ حیات نبویہ میں مظلالت کفر کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کو مٹانے کے لئے جہاد کیا وہ یہی عصیت جاہلیہ تھی۔ آپ احادیث و سیر کی کتابوں کو انھا کرو یہیں گے تو معلوم ہو گا کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان، پستی اور بلندی کی تفہیقوں کو مٹایا، انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام عجیبین دیواروں کو مصار کیا اور انسان ہونے کی حیثیت ہے تمام نبی آدم کو یکساں قرار دیا۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم یہ تھی:

لَيْسَ مِنْ مَا مَنَّا عَلَى الْعُصُبِيَّةِ لَيْسَ مِنْ دُعَائِنَا عَلَى الْعُصُبِيَّةِ لَيْسَ  
مِنَ الْمُنْقَاتِ عَلَى الْعُصُبِيَّةِ

جس نے عصیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصیت کی طرف بلا یا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

آپ ﷺ فرماتے تھے:

لَيْسَ لَأَحَدٌ فَضْلٌ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا بَذِينَ وَتَقُوَّهُ النَّاسُ كَلَّهُمْ بَنُو آدَمْ وَآدَمْ  
مِنْ تَرَابٍ

پرہیز گاری اور دین داری کے سوا کسی اور چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

نسل، دمکن، زبان اور رنگ کی تفہیق کو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر مٹایا کہ:

لأفضل لعربى على عجمى ولا لعجمى على عربى كلكم ابناء آدم

(بخاري و مسلم)

نَهْ كُسْتِ عَرَبِيَّ كُوْنِجِيَّ پِرْ فَضْلَتْ هَےْ اُور نَهْ بَجِيَّ كُوْنِجِيَّ كُوْنِجِيَّ پِرْ۔ تَمْ سَبْ آدَمْ عَلَيْهِ  
السَّلَامُ كِيْ أَوْلَادُ هُوْ۔

لأفضل لعربى على عجمى ولا لعجمى على عربى ولا لا ييصن على اسود  
ولا لاسود على اييصن الا بالتفقوف۔ (زاد المغار)

كُسْتِ عَرَبِيَّ كُوْنِجِيَّ پِرْ اُور كُسْتِ بَجِيَّ كُوْنِجِيَّ كُوْنِجِيَّ پِرْ، اُور كُسْتِ گُورَےْ كُوْنِجِيَّ کَالَّےْ پِرْ اُور  
كُسْتِ کَالَّےْ كُوْنِجِيَّ گُورَےْ پِرْ فَضْلَتْ نَهْ هَےْ، اگر فَضْلَتْ هَےْ تو وَهْ صَرْفْ  
پِرْ ہَیْزَ گَارِيَّ کِيْ بَنَا پِرْ هَےْ۔

اسْمَعُوا وَ اطِيعُوا وَ لَوْ اسْتَعْمَلْ عَلَيْكُمْ عَبْدَ جَبَشِيْ کَانَ رَاسَهُ زَيْبَقْ

(بخاري كتاب الأحكام)

سُنُو اُور اطاعت کرو چاہے تمہارے اوپر کوئی جبشی غلام ہی امیر ہنا دیا  
جائے جس کا سر کشش جیسا ہو۔<sup>۱</sup>

نَفْعَكَمْ کَےْ بَعْدِ جَبْ تَکُوَارَ کَےْ زُورَ نَےْ قَرِيشَ کَيْ أَكْرَى ہوئَيْ مُرْدَنُوںْ کَوْ جَحَكَا دِيَا  
تو حضور اکرم ﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں پورے زور کے ساتھ یہ  
اعلان فرمایا:

الا كل ماثرة اودم او مال يدعى فهو تحت قدمي هاتين۔

خوب سن رکھو کہ نخود ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج  
میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔

يَا مِعْشَرَ قَرِيشٍ إِنَّ اللَّهَ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعْظِيمُهَا الْأَبَاءُ۔

<sup>۱</sup> یہ خطاب شرقی عرب سے ہو رہا ہے کہ اگر تمہارا امیر کوئی جبشی ہو، تو اس کی اطاعت  
کرنا! کیا کوئی نیشنلیٹ اس چیز کا تصور بھی کر سکتا ہے؟

اے اہل قریش اللہ نے تمہاری جاہلیت کی خونت اور بانپ داؤ کی بزرگی  
کے ناز کو دور کر دیا۔

ایہا النّاس کلکم من آدم و آدم من تراب لا فخر للانساب لا فخر  
للعربیں علی العجمی ولا للعجمی علی العربیں ان اکرمکم عند الله  
اتقکم

اے لوگو! تم سب آدم علیہ السلام سے ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے  
تھے۔ نب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی  
فخر نہیں ہے۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وی ہے جو سب سے زیادہ  
پرہیزگار ہے۔

عبادت الہی کے بعد آپ اپنے خدا کے سامنے تین باتوں کی گواہی دیتے تھے۔  
پہلے اس بات کی کہ ”خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔“ پھر اس بات کی کہ ”محمد ﷺ  
اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔“ پھر اس بات کی کہ ”اللہ کے بندے سب بھائی بھائی  
ہیں۔“ (ان العباد کلهم اخوة)

### اسلامی قومیت کی بنیاد

اس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی،  
حسی اور دھمی بنیادوں کو جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں قائم کی گئی تھیں  
ڈھا دیا۔ رنگ، نسل، وطن، زبان، میہشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو جن  
کی بنا پر انسان نے اپنی جمالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا، مشاریا  
اور انسانیت کے مادے میں تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا۔

اس تحریک کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تغیر  
کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی اور ارضی امتیاز پر نہیں، بلکہ  
روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی،  
جس کا نام ”اسلام“ ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی باکری

وطنارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع بشری کو دعوت دی۔ پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری قوم سے ہے۔ ایک قوم ایمان اور اسلام کی ہے اور اس کے سب افراد ایک امت ہیں۔ وکذا لکج علیکم امة و سلطان<sup>۱</sup> اور ایک قوم کفر اور گمراہی کی ہے اور اس کے متعین اپنے اختلاف کے باوجود ایک گروہ ہیں۔ واللہ لا یہدی القوم الکفیرین۔<sup>۲</sup>

ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے انتیاز نہ اور نسب نہیں، اعتقاد اور عمل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفرقی میں جدا جدا ہو جائیں، اور دو بالکل اپنی آدمی اہلام میں تھہ ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہوں۔

وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ انتیاز نہیں ہے۔ یہاں انتیاز حق اور باطل کی بنیاد پر ہے جس کا کوئی وطن نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شر، ایک محلہ، ایک گھر کے دو آدمیوں کی قویتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک صہی رشتہ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک مراکشی کا قومی بھائی بن جائے۔

ریگ کا اختلاف بھی یہاں قوی تفرقی کا سبب نہیں ہے۔ یہاں اعتبار چھرے کے ریگ کا نہیں، اللہ کے ریگ کا ہے اور وہی بہترین ریگ ہے۔ صبغۃ اللہ طومن احسن من اللہ صفة<sup>۳</sup> ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ

<sup>۱</sup> البقرہ۔ ۱۳۳۔ اور اسی طرح توہم نے تم کو ایک امت وسط بنا�ا ہے۔

<sup>۲</sup> التوبہ۔ ۷۷۔ اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں کرتا۔

<sup>۳</sup> البقرہ۔ ۱۳۸۔ اللہ کا ریگ اختیار کرو اور اس کے ریگ سے اچھا کس کا ریگ ہو گا۔

قویتیں ہوں۔

زبان کا اقتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے۔ یہاں منہ کی زبان نہیں محسوس دل کی زبان کا اختبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور کبھی جاتی ہے۔ اس کے اختبار سے عرب اور افریقی کی ایک زبان ہو سکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں بے اصل ہے۔ یہاں جگہ ادولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے، انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی پادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ انہی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ ہندوستان میں ہوں یا ترکستان میں۔ اور جو خدا کی حکومت سے باغی ہیں اور شیطان سے جان و مال کا سورا کر چکے ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں۔ ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس سلطنت کی رعایا ہیں اور کس معاشی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس طرح اسلام نے قویت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ ایک مگر کے دو آدمی اس دائرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے دو آدمی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

سر عشق از عالم ارحام نیست او زمام درودم و شام نیست  
کو کب بے شرق و غرب و بے غروب در مدراش نے شمال و بے جنوب  
اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور اسی پر دشمنی بھی۔ اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کر دلتا ہے۔ جن کو اس نے جدا کر دیا ہے ان کو نہ خون کار شد جمع کر سکتا ہے، نہ خاک کا، نہ زبان کا، نہ رنگ کا، نہ روٹی کا، نہ حکومت کا اور جن کو اس نے جمع کر دیا ہے انہیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ کسی دریا، کسی پہاڑ، کسی سمندر، کسی زبان، کسی نسل، کسی رنگ اور کسی زر و زمین کے قضیہ کو یہ حق نہیں پہنچا کر اسلام کے

دارے میں امتیازی خلوط کھینچ کر مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرے۔ ہر مسلمان خواہ وہ چین کا باشندہ ہو یا مراکش کا، گورا ہو یا کالا، ہندی بولتا ہو یا عربی، سامی ہو یا آرین، ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری حکومت کی، مسلمان قوم کا فرد ہے، اسلامی سوسائٹی کا رکن ہے، اسلامی اسٹیٹ کا شری ہے، اسلامی فوج کا سپاہی ہے، اسلامی قانون کی حفاظت کا مستحق ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کوئی ایک دفعہ بھی ایسی نہیں ہے جو عبادات، معاملات، معاشرت، معيشت، سیاست، غرض زندگی کے کسی شعبہ میں جنیت یا زبان یا وطنیت کے لحاظ سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں کمتر یا بیشتر حقوق دیتی ہو۔

### اسلام کا طریق جمع و تفرق

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام نے تمام انسانی اور ماڈی رشتہوں کو قطع کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں! اس نے مسلمانوں کو صدر حکمی کا حکم دیا ہے، قطع رحم سے منع کیا ہے، ماں پاپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تاکید کی ہے، خون کے رشتہوں میں وراثت جاری کی ہے، خرد صدقات اور بذل و انجاق میں ذو القلبی کو غیر ذو القلبی پر ترجیح دی ہے، اپنے اہل دعیال، اپنے گھر بار، اور اپنے ماں کو وشنوں سے پچانے کا حکم دیا ہے، ظالم کے مقابلہ میں لڑنے کا حکم دیا ہے اور ایسی لڑائی میں جان دینے والے کو شہید قرار دیا ہے، زندگی کے تمام معاملات میں بلا امتیاز نہ ہب ہر انسان کے ساتھ ہمدردی، حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے کسی حکم کو یہ معنی نہیں پہنانے جاسکتے کہ وہ طبق وطن کی خدمت و حفاظت سے روکتا ہے، یا غیر مسلم ہمایہ کے ساتھ ملح و مالمت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

<sup>۱</sup> یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ مسلمان قوم کے تعلقات کی دو چیزیں ہیں۔ ایک ہیئت تو یہ ہے کہ انسان ہونے میں ہم اور وہ یکساں ہیں اور دوسری

حیثیت یہ ہے کہ اسلام

یہ سب کچھ ان مادی رشتہوں کی جائز اور فطری مراعات ہیں۔ مگر جس چیز نے  
قومیت کے معاملہ میں اسلام اور غیر اسلام کے اصول میں فرق کر دیا ہے وہ یہ ہے  
کہ دوسروں نے اپنی رشتہوں پر جداگانہ قومیتیں بنائی ہیں اور اسلام نے ان کو بنائے  
قومیت قرار نہیں دیا۔ وہ ایمان کے تعلق کو ان سب تعلقات پر ترجیح دیتا ہے اور  
وقت پڑے تو ان میں سے ہر ایک کو اس پر قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ کتنا  
ہے:

قد كانت لكم اسرة حسنة في ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم انا  
براً منكم وما تعبدون من دون الله كفربنا بكم وبدايبيتنا وبينكم  
العداوة والبغضاء ابدا حتى تؤمنوا بالله وحده (المتحير: ٢)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں یہ قابل تقدیر نمونہ تھا کہ انہوں نے اپنی دلتنی و نسلی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے مبیودوں سے جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پوچھتے ہو، کوئی تعلق نہیں ہے، ہم نے تم کو چھوڑ دیا۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے

اور کفر کے اختلاف نے ہمیں ان سے جدا کر دیا ہے۔ پہلی حیثیت سے ہم ان کے ساتھ ہمدردی، فیاضی، رداواری اور شرافت کا ہر وہ سلوک کریں گے جو انسانیت کا متفقی ہے اور اگر وہ دشمن اسلام نہ ہوں تو ان سے دوستی، مصالحت اور مسالت بھی کر لیں گے اور مشترک مقاصد کے لئے تعاون میں بھی دریغ نہ کریں گے۔ لیکن کسی طرح کامی اور دنیوی اشتراک ہم کو اور ان کو اس طور سے جمع نہیں کر سکتا کہ ہم اور وہ مل کر ایک قوم بن جائیں اور اسلامی قومیت کو چھوڑ کر کوئی مشترک ہندی یا چینی یا مصری قومیت قبول کر لیں کیونکہ ہماری دوسری حیثیت اس قسم کے اجتماع میں مانع ہے اور کفر و اسلام کامل کر ایک قوم بن جانا قطعاً "محال ہے۔

عداوت اور دشمنی ہو مگئی تا وقوع کیه تم ایک خدا پر ایمان نہ لاؤ۔  
وہ کہتا ہے:

لَا تَتَخَذُوا آباؤكُمْ وَالخَوَانِكُمْ لَوْلَيَاءَ إِنَّ إِسْتِحْبَوْنَ الْكُفُرَ عَلَى الْإِيمَانِ طَوْمَنْ  
يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (التوبہ: ۲۳)

اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور محبوب نہ رکھو اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو محبوب رکھیں۔ تم میں سے جو کوئی ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہو گا۔

اور:

إِنَّمَا أَنْهَاكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ عَدُوُّ الْكُفُرِ هُمُ الْمُهَاجِرُونَ (النَّعَمَانٌ: ۱۳)

تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہارے (بہ حیثیت مسلمان ہونے کے) دشمن ہیں، ان سے حذر کرو۔

وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے دین اور تمہارے وطن میں دشمنی ہو جائے تو دین کی خاطر وطن کو چھوڑ کر نکل جاؤ۔ جو شخص دین کی محبت پر وطن کی محبت کو قربان کر کے بھرت نہ کرے وہ منافق ہے، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ فلا تتخذوا  
منہم اولیاءَ حُسْنٍ يَهَا جَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (النساء: ۸۹)

اس طرح اسلام اور کفر کے اختلاف سے خون کے قریب ترین رشتہ ک جاتے ہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بیٹیے صرف اسی لئے جدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلام کے مخالف ہیں۔ ہم نسل قوم کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خدا سے دشمنی رکھتی ہے۔ وطن کو اس لئے خیر باد کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلام اور کفر میں عداوت ہے۔ کویا اسلام دنیا کی ہر چیز پر مقدم ہے، ہر چیز اسلام پر قربان کی جا سکتی ہے اور اسلام کی چیز پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اب دوسری طرف دیکھئے۔ یہی اسلام کا تعلق ہے جو ایسے لوگوں کو ملا کر بھائی بھائی بنا دیتا ہے جن کے درمیان نہ خون کا رشتہ ہے، نہ وطن کا، نہ زبان کا، نہ رنگ کا۔ تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا واذ کرو انعمة اللہ علیکم اذ کنتم  
اعداء فالف بین قلوبکم فاصبّحتم بنعمتہ الخوانا و کنتم على شفا  
حفرة من النار فانقذکم منها۔ (آل عمران: ۱۰۳)

تم سب مل کر اللہ کی رہی کو تمہارے رہو اور آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔  
اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے،  
اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت  
(اسلام) کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ تم (آپس کی عصیت کی بدولت)  
اگل سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم  
کو اس سے بچالیا۔

تمام غیر مسلموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:

فَلَن تَابُوا وَاقْتَمُوا الصَّلوٰة وَاتُوا الزَّكٰوة فَلَا خَوَانِكُمْ فِي الدِّين۔ (التوبہ: ۱۱)  
اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی  
بھائی ہیں۔

اور مسلمانوں کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ:

مُحَمَّد رَسُولُ اللَّهِ طَوَّالِ الظِّيَّنِ مَعْهُ أَشْدَاءُ عَلٰى الْكُفَّارِ رَحْمَانِ بَيْنَهُمْ  
(التحف: ۲۹)

محمد ﷺ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ وہ کفار پر  
سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ”مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے  
یہاں تک کہ لوگ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور  
محمد ﷺ کا بندہ اور رسول ہے۔ نیز وہ ہمارے قبلہ کی طرف منه پھیریں، ہمارا  
ذیجہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جو نبی کہ انسوں نے ایسا کیا ہم پر ان کے  
خون اور ان کے مال حرام ہو گئے۔ الایہ کہ حق اور انصاف کی خاطران کو طال کیا

جائے۔ اس کے بعد ان کے دعیٰ حقوق ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور ان پر دعیٰ واجبات ہیں جو سب مسلمانوں پر ہیں۔" (ابوداؤد کتاب الجماد)

بھرپری نہیں کہ حقوق اور فرائض میں مسلمان برابر ہیں اور ان میں کسی فرق و امتیاز کی محکایش نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ارشادِ نبوی ہے کہ:

الْمُسْلِمُ لِلْمُسْلِمِ كَالْبَنِيَانِ يُشَدِّدُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔

(متفق علیہ۔ محفوظہ کتاب الاداب باب الشفقة والرحمۃ علی الخلق)  
مسلمان کے ساتھ مسلمان کا تعلق ایسا ہے جیسے ایک دیوار کے اجزاء جن میں سے ہر ایک دوسرے سے قوت پاتا ہے۔

اور:

مثُلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادُّهِمْ وَتَرَاحِمِهِمْ وَتَعَااطُفِهِمْ كَمَثُلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا  
اشْتَكَ مِنْهُ عَضُُوٌ تَدَاعَى لِهِ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمْرِ۔

(متفق علیہ۔ محفوظہ۔ ایضاً")

آپس کی محبت اور رحمت و مریانی میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اس کے لئے بے خواب و بے آرام ہو جاتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کے اس جسم نامی کو رسول اللہ نے "جماعت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کے متعلق آپ کا فرمان ہے:

يَدَ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شَذِيفَ النَّارِ۔

جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے جو اس سے پھرزادہ آگ میں گیا۔

اور:

مِنْ فَارِقِ الْجَمَاعَةِ شَبَرٌ أَخْلَقَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عَنْقِهِ۔

(رواه احمد و ابوداؤد۔ محفوظہ۔ کتاب الایمان)

جو ایک بالشت بھر بھی جماعت سے جدا ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی

گردن سے اتار پھینکا۔

اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تک فرمایا کہ:

من اراد ان یفرق جماعتکم فاقتلواه

جو تمہاری جماعت میں تفرق پیدا کرنے کی کوشش کرے اس کو قتل کر

دو۔

اور

من اراد ان یفرق امر هذه الامة وہ جمیع فاضر بوه بالسیف کاننا من  
کان۔ (الملسم۔ کتاب الامارة)

جو کوئی اس امت کے بندے ہے ہوئے رشتہ کو پارہ پارہ کرنے کا ارادہ  
کرے، اس کی تکوار سے خبر لو خواہ وہ کوئی ہو۔

## اسلامی قومیت کی تعمیر کس طرح ہوئی؟

اس جماعت میں جس کی شیرازہ بندی اسلام کے تعلق کی بنا پر کی گئی تھی خون  
اور خاک، رنگ اور زبان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس میں سلمان رض ایرانی تھے جن  
سے ان کا نسب پوچھا جاتا، تو فرماتے کہ "سلمان بن اسلام" حضرت علی رض ان کے  
تعلق فرمایا کرتے تھے کہ "سلمان من اهل الہیت" "سلمان ہم اہل بیت میں سے  
ہیں۔" اس میں بازان بن ساسان اور ان کے بیٹے شربن بازان تھے جن کا نسب  
بهرام گور سے ملتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بازان کو یہن کا اور ان کے  
صاحبزادے کو صناعہ کا والی مقرر فرمایا تھا۔ اس جماعت میں بلاں جبشی رض تھے جن  
کے تعلق حضرت عمر رض فرمایا کرتے تھے کہ بلاں سیدنا و مولا سیدنا "بلاں رض  
ہمارے آقا کا غلام اور ہمارا آقا ہے۔" اس جماعت میں صیب رض روی تھے۔  
جنہیں حضرت عمر رض نے اپنی جگہ نماز میں امامت کے لئے کھڑا کیا۔ اس میں حضرت  
ابو حذیفہ رض کے غلام سالم رض تھے جن کے متعلق حضرت عمر رض نے اپنے انتقال  
کے وقت فرمایا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں خلافت کے لئے اپنی کو نامزوں کرتا۔

اس میں زید بن حارثہؓ ایک غلام تھے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی کی بیٹی ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بیانہ دیا تھا۔ اس میں حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے لٹکر کا سردار بنایا تھا، جس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو عیینہ بن الجراحؓ بھیے جلیل القدر صحابہ شریک تھے۔ انہی اسامہؓ کے متعلق حضرت عمرؓ اپنے بیٹے عبد اللہؓ سے فرماتے ہیں کہ ”اسامہؓ کا پاپ تمہرے پاپ سے افضل تھا اور اسامہؓ خود تمہرے افضل ہے۔“

### مهاجرین کا اسوہ

اس جماعت نے اسلام کے تمہرے عصیت کے ان تمام بتوں کو توڑ ڈالا جو نسل اور دملن، رنگ اور زبان وغیرہ کے نام سے موسم ہیں اور جن کی پرستش قدیم جاہلیت سے جدید جاہلیت کے زمانہ تک دنیا میں ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دملن مکہ کو چھوڑا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ ﷺ کو اور مهاجرین کو اپنے دملن سے وہ فطری محبت نہ تھی جو انسان کو ہوا کرتی ہے۔ مکہ کو چھوڑتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”اے مکہ! تو مجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر کیا کروں کہ تمہرے باشندے مجھ کو یہاں رہنے نہیں دیتے۔“ حضرت بالالؑ جب مدینہ جا کر پیار ہوئے تو کہ کی ایک ایک چیز کو یاد کرتے تھے۔ ان کی زبان سے لٹکے ہوئے یہ حضرت بھرے اشعار آج تک مشور ہیں:

**اللیت شعری هل ایتن لیلة**      مجفہ و حولی از خرو و جلیل  
**و هل ارون یوما میاه محبة**      و هل تبدولی شامة و طفیل  
 کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا میں (کبھی کوئی) رات مقام فخر میں گزاروں گا  
 اور میرے گرد از خر (ایک خوشبو دار گھاس) اور جلیل (باپوں کے پووے) ہوں

گے۔

اور کیا میں کسی دن عجتہ (جگہ کا نام ہے) کے گھاٹ پر بھی وارد ہوں گا اور مجھے شامہ و طفیل (پہاڑ اور مقام کے نام) نظر آئیں گے؟  
مگر اس کے باوجود حب وطن نے ان بزرگوں کو اسلام کی خاطر بھرت کرنے سے باذنه رکھا۔<sup>۱</sup>

### انصار کا طرز عمل

دوسری طرف اہل مدینہ نے رسول اکرم ﷺ اور مهاجرین کو سر آنکھوں پر بھایا اور اپنے جان و مال خدمت اقدس میں پیش کر دیئے۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”مدینہ قرآن سے لیخ ہوا۔“<sup>۲</sup> نبی اکرم ﷺ نے انصار اور مهاجرین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تو یہ ایسے بھائی بھائی بننے کے متوں ان کو ایک دوسرے کی میراث ملتی رہی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اس توارث کو بند کیا۔ واول موالا در حام بعضہم اولیٰ بعض۔<sup>۳</sup> انصار نے اپنے کمیت اور باغ آدمیے آدمیے تقسیم کر کے اپنے مهاجر بھائیوں کو دے دیئے اور جب بونفسیر کی زمینیں لیخ ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ زمین بھی ہمارے مهاجر بھائیوں کو دے دیجئے۔ لیکن ایثار تھا جسکی تعریف اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ ویو شرون علی انفسہم ولو کان بهم خصاصة۔<sup>۴</sup> حضرت عبد اللہ بن عوف رضی اللہ اور حضرت

<sup>۱</sup> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہتان گھڑا کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”حب الوطن من الایمان“ حالانکہ ایسی کوئی صحیح حدیث آپ سے ماوراء نہیں ہے۔

<sup>۲</sup> (الانفال: ۵۷) یعنی دراثت میں خونی رشتہوں کے لوگ ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

<sup>۳</sup> (المختصر: ۹) وہ ایسے لوگ ہیں جو خود حاجت مند ہونے پر بھی دوسروں کے حق میں ایثار کرتے ہیں۔

سعد بن رجع انصاری رض کے درمیان مواجهہ کرائی گئی تو حضرت سعد رض اپنے دوست بھائی کو آدمیاں مال دینے اور اپنی بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ محمد رسالت کے بعد جب مهاجرین پہم منصب خلافت پر سرفراز ہوئے تو کسی مدنی نے یہ نہ کہا کہ تم غیر ملکیوں کو ہمارے ملک پر حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام اور حضرت عمر رض نے مدینہ کے نواحی میں مهاجرین کو جا گیریں دیں اور کسی انصاری نے اس پر زبان تک نہ ہلاکی۔

### رشتہ دین پر مادی علاائق کی قربانی

پھر جنگ بدرو اور جنگ احمد میں مهاجرین مکہ دین کی خاطر خود اپنے رشد داروں سے ٹوٹے۔ حضرت ابو بکر رض نے اپنے بیٹے عبدالرحمن پر تکوار اٹھائی۔ حضرت حذیفہ رض نے اپنے باپ ابو حذیفہ پر حملہ کیا۔ حضرت عمر رض نے اپنے ماوس کے خون میں ہاتھ رکھ لے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام کے پیغمبر عباس رض، پیغمبرزاد بھائی عقل رض، داماد ابو العاص رض بدرو میں گرفتار ہوئے اور عام قیدیوں کی طرح رکھے گئے۔ حضرت عمر رض تو یہاں تک آمادہ ہو گئے تھے کہ سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے اور ہر شخص خود اپنے عزیز کو قتل کرے۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام غیر قبیلہ اور غیر علاقہ والوں کو لے کر خود اپنے قبیلہ اور اپنے وطن پر حملہ آور ہوئے اور غیروں کے ہاتھوں اپنوں کی گردنوں یہ پر تکوار چلوائی۔ عرب کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی کہ کوئی شخص خود اپنے قبیلہ اور اپنے وطن پر غیر قبیلہ والوں کو چڑھا لائے اور وہ بھی کسی انتقام یا ذرہ زمین کے قضیہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض ایک کلمہ حق کی خاطر۔ جب قریش کے اوپاش مارے جانے لگے تو ابوسفیان نے آکر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام! قریش کے نونہال کٹ رہے ہیں۔ آج کے بعد قریش کا نام و نشان نہ رہے گا۔" رحمۃ اللہ علیمین صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام نے یہ سن کر اہل مکہ کو امان دے دی۔ انصار سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام کا دل اپنی قوم کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "حضور صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام آخر آدمی ہی تو ہیں۔"

اپنے خاندان والوں کا پاس کری گئے۔ ”رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کی خبر پہنچی تو انصار کو جمع کیا اور فرمایا۔ ”مجھے خاندان والوں کی محبت نے ہرگز نہیں کھینچا۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اللہ کے لئے تمہارے پاس ہجرت کر کے جا چکا ہوں۔ اب میرا جینا تمہارے ساتھ ہے اور مرنا تمہارے ساتھ۔“ جو کچھ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا، اسے لفظ بلطفہ سچا کر کے دکھاریا۔ باوجودیکہ مکہ معظمہ کے فتح ہو جانے کے بعد وہ علت باقی نہ رہی تھی جس کی بنا پر حضور اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تھے، مگر آپ ﷺ نے مکہ میں قیام نہ فرمایا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ رسول خدا ﷺ نے مکہ پر کسی وطنی یا انتقامی جذبہ کے تحت حملہ نہ کیا تھا، بلکہ محض اعلانِ کلتہ الحق مقصود تھا۔

اس کے بعد جب ہوازن اور تقیف کے اموال فتح ہوئے تو پھر وہی غلط فہم پیدا ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ نے تھیمت میں سے قریش کے نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا۔ انصار کے بعض نوجوان سمجھے یہ قوی پاسداری کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے مگر کہ کہ ”خدا رسول اللہ ﷺ کو معاف کرے۔ وہ قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ اب تک ہماری تکواروں سے ان کے خون نکلتے رہے ہیں۔“ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پھر جمع کیا اور فرمایا کہ ”میں ان لوگوں کو اس لئے زیادہ دیتا ہوں کہ یہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ محض ان کی تائیف قلب مقصود ہے۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ یہ دنیا کا مال ہے جائیں اور تم خدا کے رسول ﷺ کو لے جاؤ؟“

غزوہ بنی المصطلق میں ایک غفاری اور ایک عوفی میں جگڑا ہو گیا۔ غفاری نے عوفی کو تھپڑا۔ بنی عوف انصار کے حلیف تھے۔ اس لئے عوفی نے انصار کو مدد کے لئے پکارا۔ بنی غفار مهاجرین کے حلیف تھے، اس لئے غفاری نے مهاجرین کو آواز دی۔ قریب تھا کہ فریقین کی تکواریں سمجھ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فریقین کو بلا کر فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی جو تمہاری

زبانوں سے بکل رہی تھی؟ (مالکم ولد عبود الجاہلیۃ) انہوں نے کہا کہ ایک مهاجر نے انصاری کو مارا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”تم اس جاہلیت کی پکار کو چھوڑ دو۔ یہ بڑی گھناؤنی چیز ہے۔“

اس غزوہ میں مدینہ کا مشہور قوم پرست لیڈر عبد اللہ بن ابی بھی شریک تھا۔ اس نے جو سنائے مهاجرین کے حلیف نے انصار کے حلیف کو مارا ہے تو کہا کہ ”یہ ہمارے ملک میں آکر پھل پھول گئے ہیں اور اب ہمارے ہی سامنے سراٹھاتے ہیں۔ ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کتنے کو کھلا پلا کر موٹا کرو ہماکہ وہ بھی کو پھاڑ کھائے۔ بخدا مدینہ والوں پہنچ کر جو ہم میں سے عزت والا ہو گا وہ ذلت وائلے کو نکال باہر کرے گا۔“ پھر اس نے انصار سے کہا کہ ”یہ تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی اور اپنے اموال ان پر بات دیئے۔ خدا کی حتم آج تم ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ ہوا کھائے نظر آئیں گے۔“ یہ باعث رسول اللہ ﷺ کے پہنچنے تو آپ ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو پلا کر فرمایا کہ تمہارا باپ یہ یہ کہتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے۔ اور ان کو خرچا کہ خزرج میں کوئی پیٹا اپنے باپ سے اتنی محبت نہیں کرتا۔ مگر یہ قصہ سن کر انہوں نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ ﷺ اگر حکم ہو تو میں اس کا سرکاٹ لاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر جب جنگ سے واپس ہوئے تو مدینہ پہنچ کر حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ کے آگے تکوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ”تو مدینہ میں گھس جئیں سکا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اجازت نہ دیں۔ تو کہتا ہے کہ ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلت وائلے کو مدینہ سے نکال دے گا۔ تو اب تجھے معلوم ہو کہ عزت صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے۔“ اس پر ابن ابی حیج اٹھا کہ ”لو سناے امل خزرج! اب میرا بیٹا مجھ کو گھر میں گھنے نہیں دیتا۔“ لوگوں نے آکر حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو سمجھایا۔ مگر انہوں نے کہا کہ ”رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر یہ مدینہ کے سائے میں بھی پناہ نہیں لے سکا۔“ آخر کار لوگ

رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جا کر عبد اللہ سے کو کہ اپنے باپ کو گھر میں جانے دے۔“ جب عبد اللہ نے یہ فرمان مبارک سنات تو گوار رکھ دی اور کہا کہ ”ان کا حکم ہے تو اب یہ جا سکتا ہے۔“<sup>۱</sup>

بنو یتیح پر جب حملہ کیا گیا تو حضرت عبادہ بن الصامت ﷺ کو ان کے معاملے میں حکم ہنا یا گیا اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ اس پورے قبیلہ کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ لوگ حضرت عبادہ کے قبیلے خزرج کے طیف تھے مگر انہوں نے اس تعلق کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔ اس طرح بنو قریظہ کے معاملہ میں اوس کے سردار سعد بن معاذ ﷺ کو حکم ہنا یا گیا اور ان کا فیصلہ یہ تھا کہ بنو قریظہ کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو سبایا اور ان کے اموال کو غیرمت قرار دیا جائے۔ اس معاملہ میں حضرت سعد ﷺ نے ان حلیفانہ تعلقات کا ذرا خیال نہ کیا جو اوس اور بنو قریظہ کے درمیان دست سے قائم تھے۔ حالانکہ عرب میں حلف کی جو اہمیت تھی وہ سب کو معلوم ہے اور مزید بڑا یہ لوگ صدیوں سے انصار کے ہم دطن تھے۔

### جمعیت اسلامیہ کی اصلی روح

ان شواہد سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی قومیت کی تغیر میں نسل و دلن اور زبان و رنگ کا قطعاً<sup>۲</sup> کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس عمارت کو جس معمار نے ہنا یا ہے اس کا تخلیل ساری دنیا سے نزاٹ کا۔ اس نے تمام عالم انسانی کے مواد خام پر نظر ڈالی۔ جہاں جہاں سے اس کو اچھا اور مفبوط مسئلہ ملا اس کو چھانٹ

<sup>۱</sup> اس واقعہ کی پوری تفصیل این جری کی تحریر (جلد ۲۸۔ صفحہ ۶۶ تا ۷۰) میں ملاحظہ فرمائیے۔

لیا۔ ایمان اور عمل صالح کے پختہ چونے سے ان متفق اجزاء کو چپسہ کر دیا اور ایک عالمگیر قومیت کا قصر تغیر کیا جو سارے کرد ارضی پر چھایا ہوا ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کا قیام و دوام منحصر ہے اس پر کہ اس کے تمام مختلف الاصل، مختلف الشکل، مختلف المقام اجزاء اپنی جدا جدا اصلیتوں کو بھول کر صرف ایک اصل کو یاد رکھیں، اپنے جدا جدا رنگ چھوڑ کر ایک رنگ میں رنگ جائیں، اپنے الگ الگ مقاموں سے قطع نظر کر کے ایک مخرج صدق سے لکھیں اور ایک مدخل صدق میں داخل ہو جائیں۔ یہی وحدت ملی اس نیان مخصوص کی جان ہے۔ اگر یہ وحدت ثوٹ جائے، اگر اجزاء ملت میں اپنی اصولوں اور نسلوں کے جدا جدا ہوئے، اپنے وطن اور مقام کے مختلف ہونے، اپنے رنگ و شکل کے متعدد ہونے اور اپنی اغراض دشمنی کے متفاہ ہونے کا احساس پیدا ہو جائے تو اس عمارت کی دیواریں پھٹ جائیں گی اور اس کی بنیادیں مل جائیں گی اور اس کے تمام اجزاء پارہ پارہ ہو جائیں گے۔ جس طرح ایک سلطنت میں کئی سلطنتیں نہیں بن سکتیں اسی طرح ایک قومیت میں کئی قومیتیں نہیں بن سکتیں۔ اسلامی قومیت کے اندر نسلی، دینی، لسانی اور لوئی قومیتوں کا جمع ہونا قطعاً محال ہے۔ ان دونوں حتم کی قومیتوں میں سے ایک یہ قائم رہ سکتی ہے۔ اس لئے کہ

جو درہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پس جو مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے اسے تمام قومیتوں کے احساس کو باطل اور سارے خاک و خون کے رشتہوں کو قطع کرنا پڑے گا اور جوان رشتہوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے اس کے متعلق ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلام اس کے قلب و روح میں نہیں اترتا۔ جامیت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آج نہیں تو کل وہ اسلام سے چھوٹے گا اور اسلام اس سے۔

**رسول اللہ ﷺ کی آخری وصیت**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری زمانہ میں سب سے زیادہ خطرہ

جس حیث کا تھا وہ یہی تھا کہ کہیں مسلمانوں میں جانشی عصیتیں پیدا نہ ہو جائیں اور ان کی بدولت اسلام کا قصر ملت پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ:

لَا تَرْجِعُونَ بَعْدِيْ كَفَارًا يَضُربُ بِعَضْكُمْ رِقَابُ بَعْضٍ

(بخاری کتاب الحشر)

کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد تم پھر کفر کی طرف پلٹ کر آپس میں ایک دوسرے کی گردیں ہارنے لگو۔

انہی زندگی کے آخری حج جمعۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو عرفات کے خطبہ میں عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

”سُنْ رَحْمَوْكَهُ امُورِ جَاهِلِيَّةِ مِنْ سَعَيْهُ هُرْجِزْ آجِ مِيرَےِ انْ دُونُوں قَدْمَوْنِ  
كَهِيْ نِچَےِ ہے۔ عَلِيُّ كَوْ عَجَمِيُّ پَرْ اور عَجَمِيُّ كَوْ عَلِيُّ پَرْ كُوئی فَضْلَتِ نَمِيْسِ ہے۔ تِمْ  
سَبْ آدَمُ كَيِّ اولادِ سَعَيْهُ ہے اور آدَمُ مِنِيْ سَعَيْهُ ہے۔ مُسْلِمَ مُسْلِمَانَ كَا  
بُھَائِيَّ ہے اور سَبْ مُسْلِمَانَ بُھَائِيَّ بُھَائِيَّ ہیں۔ جَاهِلِيَّتَ کَهِيْ سَبْ دُعَوَےِ باطلِ  
كَرْ دِيَئَےِ گَئَے۔ اَبْ تَهَارَےِ خُونَ اور تَهَارَيِ عَزَمَیْ اور تَهَارَےِ  
اموالِ ایک دوسرے کَهِيْ دِیَئَےِ ہیِ حِرامَ ہیں جیسے آجِ حجَّ کا دِن  
تَهَارَےِ اسِ مِيْنَهِ تَهَارَےِ اسِ شَرِمِ حِرامَ ہے۔“

پھر منی میں تشریف لے گئے تو اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ اس تقریر کو  
دہرا یا اوز اس پر اضافہ کیا:

”وَيَكُوْ ! مِيرَے بعد پھر گراہی کی طرف پلٹ کر ایک دوسرے کی گردیں  
نہ ہارنے لگنا۔

عَنْ قَرِيبٍ تَمْ اپنے رب سے ملنے والے ہو۔ وہاں تَهَارَےِ اعمالِ کی تم سے  
باز پرس ہو گی۔

سُنُو ! اگر کوئی نکلا جبھی بھی تَهَارَا امیر بنا دیا جائے اور وہ تم کو کتاب اللہ

کے مطابق چلائے تو اس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا۔“

یہ ارشاد فرمایا کہ پوچھا کر ”کیا میں نے تم کو یہ پیغام پہنچا دیا ہے؟“ لوگوں نے کہا۔ ہاں یا رسول اللہ ﷺ۔ فرمایا ”اے خدا تو گواہ رہیو۔“ اور لوگوں سے کہا کہ ”جو موجود ہے وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔“

حج سے واپس ہو کر شدائے احمد کے مقام پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

”مجھے اس کا خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے۔ مگر ڈرتا اس سے ہوں کہ کہیں تم دنیا میں جلانہ ہو جاؤ اور آپس میں لڑنے نہ گتو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح پہلی ایتکی ہلاک ہو جکی ہیں۔“

### اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ

یہ فتنہ جس کے ظاہر ہونے کا سید الکوئنی رض کو اندریشہ تھا حقیقت میں ویسا ہی مسلک ثابت ہوا۔ جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ قرن اول سے آج تک اسلام اور مسلمانوں پر جو جنگی بھی نازل ہوئی ہے اسی کی بدولت ہوئی ہے۔ وصال نبوی کے چند عی برس بعد ہاشمی اور اموی صیہیت کا فتنہ اٹھا اور اس نے اسلام کے اصلی نظام سیاست کو یہیشہ کے لئے درہم برہم کر دیا۔ پھر اس نے عربی، عجمی اور ترکی صیہیت کی شکل میں ظہور کیا اور اسلام کی سیاسی وحدت کا بھی خاتمه کر دیا۔ پھر علف ممالک میں جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں ان سب کی جنگی میں سب سے زیادہ اسی فتنہ کا ہاتھ تھا۔ قریب ترین زمانہ میں دو سب سے بڑی مسلمان سلطنتیں ہندستان اور ترکی کی تھیں۔ ان دونوں کو اسی فتنہ نے چاہ کیا۔ ہندستان میں مغل اور

ہندوستانی کی تفرقی نے سلطنت مغلیہ کو ختم کیا۔ اور ترکی میں ترک، عرب اور کوکی تفرقی بڑی کی موجب ہوئی۔

اسلام کی پوری تاریخ انھا کر دیکھ جائیے۔ جماں کوئی طاقت ور سلطنت آپ کو نظر آئے گی اس کی بنیاد میں آپ کو بلا احتیاز جنیت مختلف نسلوں اور مختلف قوموں کا خون ملے گا۔ ان کے میر، ان کے پس سالار، ان کے اہل قلم، ان کے اہل سیف، سب کے سب مختلف الاجناس پائے جائیں گے۔ آپ عراقی کو افریقہ میں، شامی کو ایران میں، افغانی کو ہندوستان میں، مسلمان حکومتوں کی اسی چاں بازی، دیانت، صداقت اور امانت کے ساتھ خدمت کرتے ہوئے دیکھیں گے جس سے وہ خود اپنے وطن کی خدمت کرتا۔ مسلمان سلطنتیں کبھی اپنے مردان کار کی فراہمی میں کسی ایک ملک یا ایک نسل کے وسائل پر مختصر نہیں رہیں۔ ہر جگہ سے قابل دماغ اور کارپرداز ہاتھ ان کے لئے جمع ہوئے اور انہوں نے ہردار الاسلام کو اپنا وطن اور گھر سمجھا۔ مگر جب نفسانیت، خود غرضی اور حصیت کا فتنہ انھا، اور مسلمانوں میں مرذبوم اور رنگ و نسل کے احتیازات نے راہ پائی، تو وہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کرنے لگے، دھڑے بندیوں اور سازشوں کا دور دور ہوا، جو قوتیں دشمنوں کے خلاف صرف ہوتی تھیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں، مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہوئی اور بڑی بڑی مسلمان سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

## مغرب کی اندھی تقلید

آج مغربی قوموں سے سبق سیکھ کر ہر جگہ کے مسلمان نسلیت اور وطنیت کے راگ الاپ رہے ہیں۔ عرب عربیت پر ناز کر رہا ہے۔ مصری کو اپنا فراعنہ یاد آ رہے ہیں۔ ترک اپنی ترکیت کے جوش میں چیلگیز خان اور ہلاکو سے رشتہ جوڑ رہا ہے۔ ایرانی اپنی ایرانیت کے جوش میں کھتا ہے کہ یہ محض عرب اپنی بیزم کا زور تھا کہ حسین ڈالو اور علی ڈالو ہمارے ہیرو بن گئے، حالانکہ حقیقت میں ہمارے قوی

ابطال تو رسم و اسخند پا رہتے۔ ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہمارا موجود ہیں جو آپ زمزم سے قلع تعلق کر کے آب گناہ سے دا بیگنی پیدا کرنا چاہئے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بھیم اور ارجمند کو اپنا توی ہیرو قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے بھی جنہیں ارض کہہ تو بھولے سے بھی یاد نہیں آتی لیکن ٹیکسلا، موہن جوڑا اور اور ہٹپا سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے لئے وہ شب و روز بے چین رہتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان نادانوں نے نہ اپنی تہذیب کو سمجھا ہے اور نہ مغربی تہذیب کو۔ اصول اور حقائق ان کی لگاؤں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ مخفی سلطنت ہیں جو اور سلطنت پر جو نقوش ان کو زیادہ ثماں اور زیادہ خوش رنگ نظر آتے ہیں انہی پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جو چیز مغربی قومیت کے لئے آب حیات ہے، وہی چیز اسلامی قومیت کے لئے ذہر ہے۔ مغربی قومیتوں کی بنیاد نسل و دھن اور زبان و رنگ کی وحدت پر قائم ہوئی ہے، اس لئے ہر قوم مجبور ہے کہ ہر اس شخص سے احتساب کرے جو اس کا ہم قوم، ہم نسل، ہم زبان نہ ہو، خواہ وہ اس کی سرحد سے ایک ہی میل کے فاصلہ پر کیوں نہ رہتا ہو۔ وہاں ایک قوم کا آدمی دوسری قوم کا سچا وفادار نہیں ہو سکتا۔ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کا سچا خاوم نہیں ملن سکتا۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے فرد پر یہ اعتماد نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے مفاد کو اپنی قوم کے مفاد پر ترجیح دے گا۔ مگر اسلامی قومیت کا معاملہ اس کے بالکل بر عکس ہے۔ یہاں قومیت کی بنیاد نسل و دھن کے بجائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان ہر جنسی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شری ملن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندوستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لئے اسی جاں پازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لئے لڑتا ہے۔ اس لئے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافی یا نسلی تفرقی کی کوئی

وجہ نہیں۔ اس محاں میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی خداق ہوئے ہیں۔ جو وہاں سبب قوت ہے وہ یہاں عین سبب ضعف ہے اور جو یہاں مایہ حیات ہے وہ وہاں بعینہ سم قاتل ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

انی طرت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی  
ان کی جمیعت کا ہے ملک و نب پر انحصار  
قوت ذہب سے مخلص ہے جمیعت تری  
بعض لوگ اس خیال خام میں جلا ہیں کہ وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا  
ہونے کے بعد بھی اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی رہ سکتا ہے۔  
اس لئے وہ اپنے نفس کو یہ کہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ یہ دونوں حرم کی قومیتیں ساتھ  
ساتھ چلیں گی، ایک سے دوسری پر آنحضرت آئے گی، اور ہم ان دونوں کے فوائد جمع  
کر لیں گے۔ لیکن یہ محض جعل اور قلت گلر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح خدا نے ایک  
یعنی میں دو قلب نہیں رکھے اسی طرح ایک قلب میں دو قومیتوں کے ہتھفاڈ اور  
متصادم جذبات کو جمع کرنے کی ممکنگش بھی نہیں رکھی ہے۔ احساس قومیت کا لازمی  
نتیجہ اپنے اور غیر کا امتیاز ہے۔ اسلامی قومیت کے احساس کا فطری متفاہی ہے کہ  
آپ مسلم کو اپنا اور غیر مسلم کو غیر سمجھیں۔ اور وطنی یا نسلی قومیت کے احساس کا  
طبعی اتفاہی ہے کہ آپ ہر اس شخص کو اپنا سمجھیں جو آپ کا ہم وطن یا ہم نسل ہو  
اور اس کو غیر سمجھیں جو دوسرے ملک یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اب کوئی صاحب  
عقل ہمیں سمجھا دے کہ دونوں احساس ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ ممکن  
ہے کہ آپ اپنے غیر مسلم ہم وطن کو اپنا بھی سمجھیں اور غیر بھی؟ اور غیر وطنی  
مسلمان سے بعید بھی ہوں اور قریب بھی؟ هل یجتمعان معاً؟

الیس منکم رجل رشید؟<sup>۱</sup>

پس یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں میں ہدایت 'ترکیت'، 'افغانیت'، 'عربیت' اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت کا احساس مٹنے اور اسلامی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کو مستلزم ہے اور یہ نتیجہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ پارہ مشاہدہ میں آ چکا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی دلتنی یا نسلی تقصبات پیدا ہوئے تو مسلمان نے مسلمان کا مگلا ضرور کانا اور لا ترجعون بعدی کفارا یا ضرب بعضکم رقب بعض کے اندیشہ نبوی کی تصدیق کر کے ہی چھوڑی۔ لہذا دلتنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرتا ہی ہے تو بھرپور ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ دلتنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی عین ضد ہے۔

<sup>۱</sup> سورہ ہود۔ ۲۸۔ کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں ہے۔

(۲)

## اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم

زمانہ حال میں مسلمانوں کی جماعت کے لئے لفظ "قوم" کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عموماً یہی اصطلاح ہماری اجتماعی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے رائج ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کا تجاوز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کے لئے لفظ "قوم" (یا نیشن کے معنی میں کسی دوسرے لفظ کو) اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ میں مختصرًا یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان الفاظ میں اصلی قباحت کیا ہے جس کی وجہ سے اسلام میں ان سے پرہیز کیا گیا اور وہ دوسرے الفاظ کون سے ہیں جن کو قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بحث ہے، بلکہ اس سے ہمارے ان بہت سے تصورات کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جن کی بدولت زندگی میں ہمارا روایہ بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

لفظ "قوم" اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ (Nation)، دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہل جاہلیت نے "قومیت" (Nationality) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (Cultural Basis) پر قائم نہیں کیا، نہ قدیم جاہلیت کے دور میں اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ ان کے دل دماغ کے ریشوں میں نسلی اور رواتی علاائق کی محبت کچھ اس طرح پلا دی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح

آج بھی لفظ "بنیشن" کے مفہوم میں مشترک جنیت (Common Descent) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے اور یہ چیز پونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً "شعب و فیروہ" کو مسلمانوں کی جماعت کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لئے کیوں نہ استعمال کی جاسکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً "کوئی دخل نہ تھا" جس کی تالیف و ترتیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی اور جس کا آغاز ہی بھرت اور قطع نسب اور ترک علاقے مادی سے ہوا تھا۔

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے۔ جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور چیزوں ہیں اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتہ ہی کوں نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسرے شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اختبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے۔ کیونکہ ان کا طریق نکر اور طریق عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر منقص ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

استحوذ عليهم الشیطان فانهم ذکر الله طائلون حزب الشیطان طالا

ان حزب الشیطان هم الخسرون۔ (الجادل: ۱۹)

شیطان ان پر غالب آگیا اور اس نے خدا سے انھیں عامل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامردی رہنے والی ہے۔

بر عکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اھباد سے بھم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے ان کے آباو اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے نتائے ہوئے طریق تھر اور مسلک حیات میں متفق ہو گئے تو کویا الہی رشتے (جلال اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باب اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ پیٹا باب کی وراثت تک نہیں پاسکا۔ حدیث کے الفاظ میں لا یتوارث اہل ملتین۔ وہ مختلف ملتوں کے لوگ آہیں میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواملت حرام ہو جاتی ہے، محسن اس لئے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو چکے۔ قرآن میں ہے: لَا هنْ حَلْ لِهِمْ وَلَا هُمْ يَحْلُونَ لَهُنَّ - نہ وہ ان کے لئے حلال، نہ یہ ان کے لئے حلال۔ (المتحہ - ۱۰)

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری، ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کر دیتا ہے، حتیٰ کہ حزب اللہ والے کے لئے خود اپنی نسلی برادری کے ان لوگوں میں شادی پیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے جو حزب الشیطان سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن کرتا ہے ””مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔““ موسیٰ لوعذی مشرک مجسم سے بہتر ہے، خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔““ موسیٰ غلام مشرک آزاد شخص سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔““

پارٹی کا یہ اختلاف نسل و دینی قویت کا تعلق صرف کافر ہی نہیں رکھ بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے جو دائمًا قائم رہتی ہے تو فیکر وہ اللہ کی پارٹی کے اصول تسلیم نہ کر لیں۔ قرآن کتاب ہے:

قد كا نت لكم اسوة حسنة فی ابراہیم والذین معه اذ قالوا لقومهم انا  
براء منکم و معا تعبدون من دون الله كفرنا بکم و بدا بینا و بینکم  
العدوا و البغضاء ابدا حتى تؤمنوا بالله وحده الا قول ابراہیم لا يه  
لا ستغفرن لک۔ (المتحـ - ٢)

”تمہارے لیے بترن نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی (نسلی) قوم والوں سے صاف کہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو، کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمہارے درمیان بیشہ کے لیے عدالت پڑ گئی تو فیکر تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ مگر تمہارے لیے ابراہیم کے اس قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے کافرباپ سے کہا کہ میں تیرے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔

و ما كان استغفار ابراہیم لا يه الا عن موعدة وعدها ایا ها فلما تبین له انه  
عدولله تبرأ منه (توہہ: ۱۱۳)

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا محض اس وعدے کی بنا پر تھا جو اس سے کر چکا تھا۔ مگر جب اس پر کھل گیا کہ اس کا باپ خدا کا دشن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گیا۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک خاندان والوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان بھی محبت کا تعلق حرام کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر باپ اور بھائی اور بیٹے بھی حزب الشیطان میں شامل ہوں تو حزب اللہ والا اپنی پارٹی سے غداری کرے گا اگر ان سے محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

لَا تجِدُ قوماً يؤمنون بالله واليَوْم الْآخِر يوادُون مِنْ حَادِّ اللَّه وَرَسُولِهِ وَلَوْ  
كَانُوا بَاءُهُمْ أَوْ أَبْنَاهُمْ أَوْ أَخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتِهِمْ ط..... اولئک حزب اللہ ط  
الآن حزب اللہ هم المغلبون (المجادلة: ٢٢)

تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی  
ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے، خواہ وہ ان  
کے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں..... یہ اللہ کی پارٹی  
کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخر کار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے  
والے ہیں۔

دوسرًا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا  
ہے۔ وہ لفظ "امت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔  
امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے  
درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے  
مثلاً "ایک زمانہ کے لوگ بھی "امت" کے جاتے ہیں۔ ایک نسل یا ایک ملک کے  
لوگ بھی "امت" کے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس اصل مشترک کی بنا پر امت کہا  
گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور  
ان کی پارٹی کا اصول اور ملک ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أَخْرَجْتَ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ  
وَتَوْمَنُونَ بِاللَّهِ ط..... (آل عمران: ١١٠)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم  
دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أَمَّةً وَسُطْلَانَكُونَا شَهِدًا عَلَى النَّاسِ وَيَكُونُ الرَّسُولُ  
عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط..... (بقرہ: ١٣٣)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر

مگر ان ہو اور رسول تم پر مگر ان ہو۔

ان آیات پر غور کیجئے۔ "یقین کی امت" سے مراد یہ ہے کہ "مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) کا ہم ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانت کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو مانئے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے۔ اس لئے یہ یقین کی امت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے ان کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں خدا کی قانون کو قائم کرنے کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوع انسانی پر مگر ان ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے اور "نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے" کافرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے لیڈر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمدرد عمل کا جو مضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتون سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

تیرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے تھی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ علیکم بالجماعة اور یہاں اللہ علی الجماعة اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "بیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا

ہاتھ ہے۔ بلکہ ایسے تمام موقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی توہینت ظاہر کرنے کے لئے "قوم" کے بجائے جماعت، حزب اور پارٹی کے لفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے۔ ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی ملک اور کسی اصول کا ہیرد ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ ملک ہو۔ لیکن پارٹی، جماعت اور حزب کے لفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں ان کے لحاظ سے اصول اور ملک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے قادر ہوتا ہے۔ آپ ایک پارٹی کے اصول و ملک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے، نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کے نمایاں ہے بن سکتے ہیں، نہ اس کے مخالف کے محافظ کر نہدار ہو سکتے ہیں، اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و ملک سے تو تحقیق نہیں ہوں، لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبروں کے بھی ممبروں کے حقوق لٹنے چاہئیں تو آپ کا یہ استدلال اعماقہ انگلیز ہو گا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن پارٹی کے تصور کو قوم کے تصور سے بدل ڈالیے۔ اس کے بعد یہ سب حرکات کرنے کی سمجھائش نکل آتی ہے۔

اسلام نے اپنی بین الاقوامی پارٹی کے ارکان میں یک جتنی اور ان کی معاشرت میں یکسانی پیدا کرنے کے لئے اور ان کو ایک سوسائٹی ہنا دینے کے لئے حکم دیا تھا کہ آپس ہی میں بیانہ شادی کرو۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اولاد کے لئے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تجویز کیا گیا تھا کہ وہ خود بخود پارٹی کے اصول و ملک کے ہیرد بن کر اٹھیں اور تبلیغ کے ساتھ افراش نسل سے بھی پارٹی کی قوت بڑھتی رہے۔

یہیں سے اس پارٹی کے قوم بننے کی ابتداء ہوتی ہے۔ بعد میں مشترک معاشرت، نسلی تعلقات اور تاریخی روایات نے اس قومیت کو زیادہ مسلح کر دیا۔

اس حد تک جو کچھ ہوا، درست ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں، اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بخلافاً بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک قوم جیسی کہ جو من ایک قوم ہے یا جاپانی ایک قوم ہے یا انگریز ایک قوم ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیزوںہ اصول اور ملک ہیں جس پر اسلام نے ان کو ایک امت بنایا تھا، وہ مشن ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے پیروؤں کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے انہوں نے غیر مسلم قوموں سے "قومیت" کا جاہلی تصور لے لیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی غلطی ہے اور اس کے تبع اثرات اتنے بھیل گئے ہیں کہ احیائے اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھ سکا جب تک کہ اس غلطی کو دور نہ کر دیا جائے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت، رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے مخفی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی، بلکہ صرف اس پا پر ہوتی ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک ملک کے پیرو ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ایک رکن اگر جماعتی اصول اور ملک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرتا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بر عکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدارانہ اور پاغیانہ طرز عمل سے روکیں، نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں، پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال بآہر کریں۔ ایسی مثالیں بھی دنیا میں نہ پیدا نہیں ہیں کہ جو شخص پارٹی کے ملک سے شدید انحراف کرتا ہے اسے کچھ خاص حالتوں میں قتل بیک کر دیا

جاتا ہے۔ ایک ذرا مسلمانوں کا حال دیکھیے کہ اپنے آپ کو پارٹی کے بجائے قوم سمجھنے کی وجہ سے یہ کبھی شدید غلط فہمی میں جلا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لئے غیر اسلامی اصولوں پر کوئی کام کرتا ہے تو دوسرے مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ اس کی مدد کریں گے۔ اگر مدد نہیں کی جاتی تو شکایت کرتا ہے کہ دیکھو، مسلمان مسلمان کے کام نہیں آتے۔ سفارش کرنے والے ان کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھائی کا بھلا ہوتا ہے، اس کی مدد کرو۔ مدد کرنے والے بھی اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو اپنے اس فعل کو اسلامی ہمدردی سے موسم کرتے ہیں۔ اس سارے معاملہ میں ہر ایک کی زبان پر اسلامی ہمدردی، اسلامی برادری، اسلام کے رشتہ دینی کا نام بار بار آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام کے خلاف عمل کرنے میں خود اسلام ہی کا حوالہ دینا اور اس کے نام سے ہمدردی چاہتا یا ہمدردی کرنا صریح لغو بات ہے۔ جس اسلام کا یہ لوگ نام لیتے ہیں اگر حقیقت میں وہ ان کے اندر زندہ ہو تو جونہی ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسلامی جماعت کا کوئی شخص کوئی کام اسلامی نظریہ کے خلاف کر رہا ہے، یہ اس کی مخالفت پر کمرست ہو جائیں اور اس سے توبہ کرا کے چھوڑیں۔ سمجھی کا مدد چاہنا تو درکنار، ایک زندہ اسلامی سوسائٹی میں تو کوئی شخص اصول اسلام کی خلاف ورزی کا نام تک نہیں لے سکتا لیکن آپ کی سوسائٹی میں رات دن بھی معاملہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے اندر جاہلی قومیت آگئی ہے۔ جس چیز کو آپ اسلامی اخوت کہ رہے ہیں یہ دراصل جاہلی قومیت کا رشتہ ہے جو آپ نے غیر مسلموں سے لے لیا ہے۔

۱۔ اسلام میں قتل مرتد کی بھی بنا ہے۔ روی اشتراکی بھی اشتراکیت سے مرتد ہونے کی بھی سزا دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مرتد کی سزا ۔۔۔۔ اسلام میں" از سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک جیلیکیشنز لیٹریڈ، لاہور۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گتا ہے اور آپ اس کو بے ٹکف "اسلامی مفاد" بھی کہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد یا قومی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس دولت آئے، ان کی عزت بڑے، ان کو اقتدار نصیب ہو، اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا میں جائے۔ بلا خاکہ اس کے کہ یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی ہیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرز عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفت اسلام سے قطع نظر کر کے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسم ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت، ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی، ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں، خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسرا اصول اسلام کے منافی کیوں نہ ہو۔ جس طرح جو نیت کسی اصول کا نام نہیں، شخص ایک قومیت کا نام ہے، اور جس طرح ایک جرمن قوم پرست صرف جرمنوں کی سرپلندی چاہتا ہے، خواہ کسی طریقے سے ہو، اسی طرح آپ نے بھی "مسلمانیت" کو شخص ایک قومیت بنا لیا ہے اور آپ کے مسلمان قوم پرست شخص اپنی قوم کی سرپلندی چاہتے ہیں خواہ یہ سرپلندی اصولاً اور عملاً اسلام کے بالکل بر عکس طریقوں کی ہیروی کا نتیجہ ہو۔ کیا یہ جاہلیت نہیں ہے؟ کیا اور حقیقت آپ اس بات کو بھول نہیں گئے ہیں کہ مسلمان صرف اس بنی الاقوامی پارٹی کا نام تھا جو دنیا میں انسانیت کی فلاں و بہوں کے لیے ایک خاص نظریہ اور ایک عملی پروگرام لے کر اٹھی تھی؟ اس نظریہ اور پروگرام کو الگ کرنے کے بعد شخص اپنی شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو لوگ کسی دوسرے نظریہ اور پروگرام پر کام کرتے ہیں ان کے کاموں کو آپ

”اسلامی“ کیسے کہ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ ہو شخص سرمایہ داری کے اصول پر کام کرتا ہوا اسے اشتراکی کے نام سے یاد کیا چاہے؟ کیا سرمایہ دارانہ حکومت کو بھی آپ اشتراکی حکومت کہتے ہیں؟ کیا فاشستی طرز ادارہ کو آپ جمہوری طرز ادارہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اس طرح اصطلاحوں کو بے جا استعمال کرے تو آپ شاید اسے جاں اور بے وقوف کرنے میں ذرا تال نہیں کریں گے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کو بالکل بے جا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں کسی کو جاہلیت کی بو عک محسوس نہیں ہوتی۔

مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ”اسم ذات“ نہیں بلکہ ”اسم صفت“ ہی ہو سکتا ہے اور ”بیرو اسلام“ کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام ”اسلام“ ہے۔ لہذا آپ اس لفاظ کو شخص مسلمان کے لئے اس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا چینی کے الفاظ ”شخص ہندو“، ”شخص جاپانی یا شخص چینی“ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جو نبی اصل اسلام سے ہٹا، اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخوبی سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت میں کرتا ہے۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح ”مسلمان کا مفاد“، ”مسلمان کی ترقی“، ”مسلمان کی حکومت و ریاست“، ”مسلمان کی وزارت“، ”مسلمان کی تنظیم“ اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آپ صرف ان موقع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اسلامی نظریہ اور اصول کے مطابق ہوں اور اس مشن کو پورا کرنے سے متعلق ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی لفظ مسلمان کا استعمال درست

نہیں۔ آپ ان کو جس دوسرے نام سے چاہیں، موسوم کریں، بہر حال مسلمان کے نام سے موتوم نہیں کر سکتے کیونکہ صفت اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا قوم کا نام اشتراکی ہے اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد یا کسی حکومت یا کسی حکیم کو اشتراکیوں کی حکومت یا حکیم یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جاسکتا ہے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملہ میں آپ نے یہ کہوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جاسکتا ہے۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تہدن اور اپنی تاریخ کے متعلق آپ کے رویہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو پادشاہیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں آپ ان کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کے تحت نہیں مسلمان تھے۔ جو تہدن قرطبه و بغداد اور دہلی و قاہروہ کے عیش پرست درباروں میں پروردش پایا تھا، آپ اسے "اسلامی تہدن" کہتے ہیں حالانکہ اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرے کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب برے سے یہ ہے ہی نہیں کہ ایک میت کو پروردگار کرنے کے لئے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تعمیر کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاظر بیان

۔ مسلمان کا مفاد بجائے خود کوئی غلط چیز نہیں ہے لیکن جو چیز اسلام کے خلاف ہو اس میں مسلمان کا مفاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اصل چیز یہ ہے کہ تمام امور کو اسلام کی کسوٹی پر پر کھا جائے۔

کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطہ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصہ آب زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قاتل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے، بلکہ آپ اسے "تاریخ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں، گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر اپنی گزشتہ تاریخ کا احصا پ کریں، اور پورے انصاف کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کر کے دیکھیں اور دکھائیں۔ اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویہ نظر میں یہ کبھی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جا سکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویہ نظر آپ نے اپنی ملی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کر کے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس قوم کی طرف سے، یا اس کے ہام سے، یا اس کے لیے ہر شخص اور ہر گروہ من مالی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں کی قوم" سے تعلق رکھتا ہو، خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اس پارٹی کے ساتھ لگ چکنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آئے، خواہ اس کا مشن اسلام کے مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جائے، خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں ساتھے جب کسی مجھے مسلمان آپ کو اقتدار کی کریں پر بیٹھا نظر آتا ہے، خواہ وہ

اس اقتدار کو بالکل اسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو، جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اگر ان چیزوں کا نام اسلامی مقادیر کھٹتے ہیں جو حقیقتاً غیر اسلامی ہیں، ان اداروں کی حمایت و حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصول اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوئے ہیں۔ اور ان مقاصد کے پیچھے اپناروپیہ اور اپنی قومی طاقت صالح کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بنی الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمران بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے اندر قوم کے بجائے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو ایک زندہ تصور نہ بنائیں گے، زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویہ درست نہ ہو گا۔

## استدرآک

اس مضمون کی اشاعت کے بعد متعدد اصحاب نے اس شہر کا اظہار کیا کہ "اسلامی جماعت" کو "قوم" کے بجائے پارٹی کہنے سے اس امر کی محاجائش نکلتی ہے کہ وہ کسی وطنی قومیت کی جزء بن کر رہے ہے۔ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اس بڑے مجموعے میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر مسلمان ایک پارٹی ہیں تو وہ بھی اپنے وطن کی قوم کا ایک جزء بن کر رہ سکتے ہیں۔

چونکہ جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کا اور ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بحث استعمال

ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مختص ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اس معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے اور یہی مفہوم "پارٹی" کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس قوم کا جزء بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جمافی تصور (World Idea) لے کر اٹھتی ہے۔ جس کے سامنے تمام ہی نوع انسانی کے لے بلالحاظ قوم و وطن ایک عالمگیر ملک ہوتا ہے۔ جو پوری زندگی کی تشكیل و تحریک ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ و مسلک، عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لے کر انفرادی برداشت اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالتا چاہتا ہے جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تہذیب (Civilisation) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزء بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ ان نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنتی ہیں۔ پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک ناہی قومیت (Expendding Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر رونے

زمین کی پوری آبادی کو اپنے دارے میں لینے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بناتی ہیں بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilisation) بنانے کے لئے اٹھتی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی نگہ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جمیں قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہو گا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریہ حیات اور فلسفہ اجتماعی (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی ہمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے " القوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش کسی شخص کو اس قوم کا مجرم نہیں بنایا سکتی۔ جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لئے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لئے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بناء پر قائم ہوتا ہے جماعتی حیثیت جو کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کے تزل (Degeneration) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل  
زر الاله اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بدھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں  
کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و ملک کی بنیاد پر  
عالگیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی  
اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی  
کلی نظام بنا سکتے۔ اس لئے یہ دونوں مسلک کوئی عالگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک  
طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی  
سائنسیک تہذیب اٹھی، جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنا لانا چاہا، مگر اول یوم  
پیدائش سے اس پر یہ نیشنلیزم کا بھوت سوار ہو گیا۔ لہذا یہ بھی عالگیر قومیت بنانے میں  
ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدود کو توڑ کر  
جهانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالگیر ہو۔ لیکن  
چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے، جو اس کے پیش  
نظر ہے، اس لئے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالم گیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو  
سکی ہے۔ اس وقت تک میدان میں تھا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و ملک ہے جو  
نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالم گیر قومیت بناتا ہے،  
لہذا جو لوگ اسلام کی اپہرث سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا  
مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی

<sup>۱</sup> بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی یہ نہیں ہے۔ انسانیں اور اس کی  
جماعت کے طرز میں روی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ روی  
اشتراکیت کے لزیجہ میں، حتیٰ کہ ۲۰۰۰ کے جدید دستور حکومت میں بھی جگہ جگہ " قادر لینڈ"  
(وطن آبائی) کا ذکر ہتا ہے۔ مگر اسلام کو دیکھنے پر ہر جگہ "دارالاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے  
نہ کہ قادر یا مادر لینڈ کا۔

ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے۔ اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو، اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی ناپوشی غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے اندر ”تاریخی قومیت“ کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصلی حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفہ اجتماعی کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں، ان کی کافرنسوں اور جمیعتوں میں، ان کے اخباروں اور رسالوں میں، کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی کے اس مشن کا ذکر نہیں آتا۔ جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے، وہ ”مسلمانوں“ کا مقام ہے۔ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ

کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، اور مفاد سے مراو ان نسلی مسلمانوں کا مادی و سیاسی  
مفاد ہے یا بدرجہ آخر اس کچھ کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثت میں ملی ہے۔۔۔ اس  
مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو، اس کی طرف یہ دوڑ جاتے  
ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مولیٰ ہر اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو  
جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند  
ہے نہ یہ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو، وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے  
جس کو میں مسلمانوں کا تزل کہتا ہوں، اور اسی تزل کے خلاف احتجاج کرنے کے  
لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی  
طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف  
اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party sense) پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے برے نتائج اتنے زیادہ ہیں  
کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی وجہ سے جسی دخود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان  
ہر رہ رو کے چیزوں پر چلنے اور ہر نظریے اور مسئلہ کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا  
ہے، خواہ وہ اسلام کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہی  
ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنٹ بھی بتا ہے۔ کیونٹ بھی بن جاتا ہے۔ فاشتی اصول تسلیم  
کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی فلسفوں اور  
مابعد الطبعی افکار اور علمی نظریات میں سے قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو  
مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی، اجتماعی یا تدنی تحریک ایسی نہیں جس  
کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں اور لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو  
مسلمان کہتے ہیں، سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور  
دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ”مسلمان“ کوئی پیدا ائشی  
لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت ہے، جو شخص اسلام کی  
راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلنے، اس کو مسلمان کہنا اس لفظ کا بالکل غلط

استعمال ہے۔ مسلم نیشنٹ اور مسلم کیونٹ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی طرح کی تناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح "کیونٹ ماجن" اور "بد صٹ قصائی" کی اصطلاحیں تناقض ہیں۔

---

حصہ دوم

## اسلامی نظم حملکت: اصول اور نظام کار

- اسلام کے دستوری قانون کے مأخذ
- اسلامی ریاست کی بنیادیں
- اسلامی دستور کی بنیادیں
- اسلامی ریاست کا مثالی دور
- اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد
- چند دستوری اور سیاسی مسائل

## باب ۶

### اسلام کے دستوری قانون کے مأخذ

- قرآن مجید
- سنت رسول اللہ
- خلافت راشدہ کا تعامل اور مجتہدین امت  
کے فضلے
- مشکلات اور موائع
- ضمیمه: سنت رسول بحیثیت مأخذ قانون

کتاب کے اس دوسرے حصے میں ہم اسلامی ریاست کے بنیادی اصول اور اس کے نظام کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ اس سے اسلامی دستور کا ایک واضح خاکہ بھی ہمارے سامنے آجائے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ میں سب سے پہلے ہم اسلام کے دستوری قانون کے مأخذ سے بحث کر لیں تاکہ بعد کے تمام مباحث کی اساس ہمارے سامنے آجائے۔ اسلامی ریاست کے بارے میں اگر پہلے ہی قدم پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کے اصل مأخذ قرآن و سنت ہیں، دوسرے ممالک کے تجربات نہیں تو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ مسلمان ممالک کے حکمرانوں اور متجددین کی اصل فکری غلطی یہ یہ ہے کہ وہ بات تو کرتے ہیں اسلامی ریاست کی لیکن بطور مأخذ رجوع کرتے ہیں مغربی اقوام کی طرف۔ بلاشبہ ہم دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں لیکن خود اپنے نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب سے پہلے دستوری مأخذ اور ان سے استفادہ کی راہ کی مشکلات کو پیش کر رہے ہیں۔

اس بحث کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی پیش آئی۔ اور وہ ہے فتنہ انکار حدیث۔ ایک گروہ حدیث کے بارے میں ذہنوں کو مخلوک کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے جھت اور مأخذ قانون ہونے پر اعتراض کرتا ہے۔ اس نقطے نظر پر تنقید اور صحیح صورت حال کی تشریع بے حد ضروری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی نظم حملکت کا کوئی واضح خاکہ بن ہی نہیں سکتا۔

اس باب کو مصنف محترم کی مختلف تحریرات سے مرتب کیا گیا ہے اور حاشیوں میں ان مقامات کی نشاندہی کردی گئی ہے جہاں سے متعلقہ مواد لیا گیا ہے۔

مرتب

## اسلام کے دستوری قانون کے مأخذ

اسلامی ریاست وہ ریاست ہے جو حاکیت الٰہی اور خلافت علیٰ منہاج النبوة کے نظام کو اس کے تمام تضمنات کے ساتھ قائم کرنے کی داعی ہو۔ آج دنیا میں جہان بھی ایسی ریاست قائم کرنے اور اس کی نوعیت اور نظام کا معین کرنے کی کوشش کی جائے گی تو چند خاص مأخذ کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور وہ ہیں قرآن، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تعامل خلافت راشدہ اور مجتہدین امت کے فیضی۔ اسلام کے غیر تحریری دستور مملکت کے یہی چار مأخذ ہیں۔ اور انہی کے مطالعہ سے اسلامی ریاست کی نوعیت اور اس کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے اور انہی سے ہم وہ اصول و کلیات اور احکام و دفعات اخذ کر سکتے ہیں جو اسلامی دستور کا جزو ہوں گی۔

(۱)

## قرآن مجید

اس کا سب سے پہلا ماقذہ قرآن مجید ہے۔ اسلام <sup>۱</sup> کی اصطلاح میں "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لیے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کتاب گویا اسی پیغام کا سرکاری بیان (Official Version) یا اسلامی اصطلاح کے مطابق "اللہ کلام" ہے جسے لوگوں تک پہنچانے، جس کی توضیح و تشریح کرنے، اور جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پیغمبر دنیا میں بھیجے گئے۔ سنت اللہ یہ ہے کہ خدا کو پیغمبر کے ذریعہ سے جو تعلیم بندوں کو دینی مقصود ہے وہ اس کے اصول و صفات مسائل پیغمبر کے دل پر القا کرتا ہے۔ اس ہدایت کے الفاظ اور معانی دونوں میں پیغمبر کی اپنی عقل و فکر، ارادے اور خواہش کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ پیغمبر اس کلام کو ایک امانت دار قادر کی حیثیت سے خدا کے بندوں تک پہنچا رہتا ہے۔ پھر خدا کے عطا کیے ہوئے علم اور بصیرت سے اس کے معانی و مطالب کی تشریح کرتا ہے، انھی انہی اصولوں پر اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تہدن کا نظام قائم کرتا ہے۔ اپنی تعلیم و تلقین اور اپنی پاکیزہ پرست سے لوگوں کے خیالات و روحانیات اور افکار میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ تقویٰ اور طہارت اور پاکیزگی نفس اور حسن عمل کی روح ان میں پھونکتا ہے۔ اپنی تربیت اور عملی رہنمائی سے ان کو اس طور پر منظم کرتا ہے کہ ان سے ایک نئی

<sup>۱</sup> ماخوذ از "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی"۔

سو سائیٰ، نئی ذہنیت، نئے افکار و خیالات، نئے آداب و اطوار اور نئے آئین دقوانیں کے ساتھ وجود میں آ جاتی ہے، پھر وہ ان میں اللہ کی کتاب اور اس کے ساتھ اپنی سنت، اپنی تعلیم اور اپنی پاکیزہ سیرت کے آثار چھوڑ جاتا ہے جو ہیشہ اس جماعت اور اس کے بعد آئے والی نسلوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کی نازل کردہ کتب سماوی میں سب سے آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔ مسلمان ایمان تو تمام آسمانی کتب پر رکھتے ہیں لیکن ان کے لیے قانون ہدایت اور آئین زندگی کی حیثیت صرف قرآن مجید کو حاصل ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ جہاں سے بالفعل اتباع کی مرحد شروع ہوتی ہے، وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن مجید ساتھ تعلق استوار کیا گیا ہے اور ہمارے لیے یہی کتاب اصل مأخذ ہدایت اور جماعت (Authority) ہے، اس کے متعدد وجہوں ہیں۔

۱ - قرآن مجید انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پیش کیا تھا۔ اول روز سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے ہر زمانے میں اس کو لفظ پر لفظ یاد کیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے روزانہ اس کی تلاوت کی ہے، ہیشہ اس کے نئے ضبط کتابت میں لائے جاتے رہے ہیں اور کبھی اس کی عبارت میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ لہذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی ممکنائش نہیں ہے کہ جو قرآن نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن گیا تھا وہی آج دنیا میں موجود ہے اور ہیشہ موجود رہے گا۔ اس میں کبھی ایک لفظ کا تغیر و تبدل نہ ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

۲ - وہ عربی زبان میں اتراء ہے جو ایک زندہ زبان ہے اور آج تک اس زبان کا فصح اور معیاری لزیج روی ہے جو نزول قرآن کے وقت تھا۔ اس کے معانی و مطالب معلوم کرنے میں انسان کے لیے وہ دقتیں نہیں ہیں جو مردہ زبانوں کی کتابوں کو سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔

۳ - وہ سراسر حق، اور از اول تا آخر الہی تعلیمات سے لبرن ہے۔ اس میں کہیں انسانی جذبات، نفسانی خواہشات، قوی یا طائی خود غرضیوں اور جاہلانہ گمراہیوں کا شاہد ہے تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے اندر کلام الہی کے ساتھ انسانی کلام کی ذرہ برابر آمیزش نہیں ہو سکی ہے۔

۴ - وہ ایک جامع کتاب ہے جس کے اندر ان تمام حقائق و معارف اور خیرات و صالحات کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے کی انسانی کتابوں میں بیان کیے گئے تھے۔ ایسی جامع کتاب کی موجودگی میں انسان آپ سے آپ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۵ - وہ انسانی ہدایات اور الہی تعلیمات کا جدیدہ ترین مجموعہ (Latest Edition) ہے۔ بعض ہدایات جو پچھلی کتابوں میں مخصوص حالات کے تحت دی گئی تھیں، وہ اس میں سے نکال دی گئیں اور بہت سی نئی تعلیمات جو پچھلی کتابوں میں نہ تھیں، اس میں اضافہ کر دی گئیں۔ مانند  
من آیة او ننسهانات بخیر منها او مثلها طالم تعلم ان اللہ علیٰ کل شئی قادر  
(البقرہ - ۱۰۶)

لہذا جو شخص آپاً اجادہ کا نہیں بلکہ فی الواقع خدا تعالیٰ ہدایت کا پروپر ہے اس کے لیے لازم ہے کہ اسی آخری لور جدیدہ ائمہ یثین کا اتباع کرے نہ کہ پرانے ائمہ یثینوں کا۔ جدت اب قرآن ہے، اس سے پہلے کی کتب نہیں۔ یہی وجہ ہیں جن کی بنا پر اسلام نے تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کو متبع قرار دیا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے کہ وہ اسی ایک کتاب کو اپنا دستور العمل بنائے اور مسلمانوں کے لیے اسی کتاب کو اولیں مأخذ ہدایت قرار دیا۔

أَنَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَكَ اللَّهُ۔

(آلہ النساء - ۱۰۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتماری ہے تاکہ تو لوگوں کے

درہمان اس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے تجھے دیا ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ فَأُولَئِنَّكُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف = ۱۵۷)

پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنوں نے اس کی مدد اور حمایت کی اور اس نور کا انتفاع کیا جو اس کے ساتھ اترتا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِنَّكُمُ الْكُفَّارُ ..... فَأُولَئِنَّكُمْ هُمُ الظَّالِمُونَ ..... فَأُولَئِنَّكُمُ الْفَاسِقُونَ ..... (المائدہ - ۳۷ - ۳۸)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں..... وہی ظالم ہیں..... وہی فاسق ہیں۔

یہاں اے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تمنی حکم ثابت کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں، تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یاد دوسرے انسانوں کے ہاتھے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تمنی ہے جو جرام کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً "اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ہانیا" اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ صحیک صحیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرا یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکلا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی

نوعیت کے اخبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو، وہاں یہ تینوں چیزوں موجود نہ ہوں البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔

مسلمانوں<sup>۱</sup> کے لئے اصل سند اور جدت قرآن پاک ہے جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ ہرگز قابل اتباع نہیں ہے۔

اتبعوا مَا أَنْزَلَ اللَّٰهُمَّ مِنْ رِبِّكُمْ وَلَا تَتَبَعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْ لِيَأْءُو۔

(الاعراف - ۳)

جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کار سازوں کی پیروی نہ کرو۔ اور قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات میں رو و بدل کا حق کسی کو حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی نہیں ہے۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبْدِلَهُمْ مِنْ تَلْقَائِنِي نَفْسٍ جَاءَنِي أَتَبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ جَاءَنِي  
الْخَلْفَانِ عَصَيْتَ رَبِّي عذَابٌ يَوْمٌ عَظِيمٌ۔ (یونس: ۱۵)

اے محمد ﷺ! کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلتے کا حق نہیں رکھتا۔ میں تو صرف اسی دھی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف اتاری جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ذر ہے۔

قرآن مجید<sup>۲</sup> اسلامی تصور ریاست کا سب سے پہلا مأخذ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرائیں ہیں۔ یہ احکام و فرائیں انسان کی پوری زندگی کے

<sup>۱</sup> مأخذ از اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ صفحہ ۲۳۷-۲۳۸۔

<sup>۲</sup> اسلامی دستور کی بنیادیں۔ صفحہ ۵۔

معاملات پر حاوی ہیں۔ ان میں صرف انفرادی کردار اور سیرت عی کے بارے میں ہدایات نہیں دی گئی ہیں بلکہ اجتماعی زندگی (Social Life) کے بھی ہر پہلو کی اصلاح و تنظیم کے لئے کچھ اصول اور کچھ قطعی احکام دیئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنی ریاست کین اصولوں اور کن مقاصد کے لئے قائم کریں۔

---

(۲)

## سنت رسول اللہ ﷺ

دوسرा مانع سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کی ہدایات کو اور اس کے دینے ہوئے اصولوں کو عرب کی سر زمین میں کس طرح نافذ کیا، کس طرح اسلام کے تخلیل کو عمل کا جامہ پہنایا، کس طرح اس تخلیل پر ایک سوسائٹی کی تھکیل کی، پھر کس طرح اس سوسائٹی کو منتظر کر کے ایک ائمیث کی شکل دی اور اس ائمیث کے مختلف شعبوں کو کس طرح چلا کر تھایا۔ یہ تجذیب سنت رسول اللہ ﷺ سے ہمیں معلوم ہو سکتی ہیں اور انہی کی مدد سے ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کا تھیک تھیک نشاکیا ہے، یہ قرآن کے دینے ہوئے اصولوں کا عملی حالات پر انطباق ہے جس سے ہم کو اسلامی دستور کے لئے نہایت نیتی نظائر (Precedents) حاصل ہوتے ہیں اور دستوری روایات (Conventions of the Constitution) کا بڑا اہم مواد بہم پہنچتا ہے۔

سنت ہمارے دستوری قانون کا دوسرا مانع ہے اور بڑا ہی اہم مانع ہے۔ افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے ایک گروہ اس کی اہمیت کو کم کرنے اور اس کے

۱۔ اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو: سنت کی آئندی بیشیت از مولا نا مودودی، تفہیمات جلد اول و تفہیمات جلد سوم۔

۲۔ اسلامی دستور کی بنیادیں صفحہ ۶۔

قانونی جمٹ (Legal Sanction) ہونے کے پہلو کا انکار کر کے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار بروپا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لئے ہم مخترا<sup>۱</sup> اس کے جمٹ ہونے پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ<sup>۲</sup> ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچاویئے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہسہ سکر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجہ میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی۔ ایک نیا نظام تہذیب و تدنی وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد ﷺ نے کئے، یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنانے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح محض ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و جمٹ نہیں رکھتا۔ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و جمٹ ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جمال تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ محمد ﷺ صرف نامہ بر نہیں تھے، بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کئے ہوئے رہبر، حاکم اور معلم بھی تھے جن کی یہودی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہل ایمان کے لئے نمونہ قرار دیا گیا تھا اور آپ ان تمام حیثیتوں میں مامور من اللہ

۱۔ میں الاقوای اسلامی کلوکیم میں پڑھے ہوئے مقالہ پر اعتراضات کے جواب میں یہ باتیں کہی گئیں جو ترجمان القرآن بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ ”سنت کی آئی حیثیت“ سے بھی کچھ اقتباسات یہاں لئے گئے ہیں۔

تھے۔ کہ میں اسلام قول کرنے والوں نے باختیار خود آپ ﷺ کو اپنا لیڈر منتخب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس قیادت کے منصب سے وہ نعوذ باللہ آپ کو ہٹانے کے بجائے تھے اور نہ ہی ایسا ہوا کہ مدینہ چیخ کر جب اسلامی ریاست کی بنا ڈالی گئی اس وقت انصار و مهاجرین نے کوئی مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا ہو کہ محمد ﷺ ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائد اعلیٰ ہوں گے۔ قرآن حضور اکرم ﷺ کی یہ تمام حیثیتیں خود معین کرتا ہے اور یہ سب منصب نبوت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ مانئے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نہیں ہو اور اس کے بعد وہ مخفی ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد ﷺ کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نبی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماذہ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیخ کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد ﷺ صرف علاوہ قرآن کی حد تک نہیں تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت ﷺ کو بطور خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضور ﷺ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔

اس بارے میں کوئی لشتبہ نہیں چھوڑا گیا کہ۔

قرآن نے حضور اکرم ﷺ کی کیا حیثیت معین کی ہے اور منصب رسالت کے کون کون سے کام آپ ﷺ نے انجام دیئے۔

## (الف) رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم و مرلي

قرآن پاک<sup>۱</sup> میں چار مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے منصب رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ لِبْرَاهِيمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمَاعِيلَ ..... رَبُّنَا وَابْنُهُ فِيهِمْ  
رَسُولًا مُّنْهَمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيَعْلَمُهُمْ الْكِتَبُ وَالْحِكْمَةُ وَيَزْكِيْهِمْ

(آل عمران: ۱۲۹-۱۳۰)

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسماعیل اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (انہوں نے دعا کی)..... اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انسی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمائو جو انہیں تمہی آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تذکیرہ کرے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيَزْكِيْكُمْ وَيَعْلَمُكُمْ  
الْكِتَبُ وَالْحِكْمَةُ وَيَعْلَمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ (آل عمران: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تذکیرہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باعث سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لَقَدْ مِنَ اللَّهِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَذْبَعَثُ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ  
آيَاتِهِ وَيَزْكِيْهِمْ وَيَعْلَمُهُمْ الْكِتَبُ وَالْحِكْمَةُ۔ (آل عمران: ۱۶۳)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جب کہ ان کے اندر خود انسی

میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

هُو الَّذِي بَعَثَ فِي الْأَمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَيْتَهُ وَيُزَكِّيهِمْ وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (الجمعہ: ۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو بتا کید دھرا یا مگیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صرف آیات قرآن سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے فتاویٰ کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ اور تیسرا یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی تربیت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی افرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشوونما دیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لئے آپ ﷺ جو تذکیرہ بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ کو پڑھ کر سنادینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے اور قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مہلی کے مناصب جو حضور اکرم ﷺ کو حاصل تھے ان پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مأمور فرمایا تھا۔ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے

اجزاء نہ تھے اور آنحضرت ﷺ ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو یہاں یہ کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باشی حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضور اکرم ﷺ نے کی اسے من جانب اللہ مانئے اور سند تعلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

### (ب) رسول اللہ ﷺ بحیثیت شارح کتاب اللہ سورہ علی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَانْزَلْنَا إِلَيْكَ الْذِكْرَ لِتَبْيَّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ۔ (آیت: ۲۳)

اور (ایے نبی ﷺ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تم تو گوں کے لئے واضح کر دو اس تعلیم کو جوان کی طرف اتاری گئی ہے۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پردویہ خدمت کی سکی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے ان کی آپ توضیح و تشرع فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھو سکتا ہے کہ کسی بات کی تشرع و توضیح بعض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنادینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشرع کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد پچھہ کھتا ہے تاکہ سخنے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرو (Practical Demonstration) کر کے ہاتا ہے کہ مصنف کا فنا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و دعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنادیں کسی طفل کعب کے نزدیک بھی تشرع و توضیح قرار پاسکتا۔ اب فرمائیے کہ اس آیت کی رو سے نبی اکرم ﷺ قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول

اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپ ﷺ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے اور آپ کے پہنچائے ہوئے الفاظ قرآن کو لے کر آپ کی شرح و تفہیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہو گا۔

### (ج) رسول اللہ ﷺ بحیثیت پیشواؤ نمونہ تقلید

سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُنَدْ كُنْتُمْ تَحْبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبَعْنَاهُنَّ يَحْبِبُكُمُ اللَّهُ ..... قُلْ اطِّعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تُولُوا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكُفَّارِينَ۔ (آیات: ۳۲-۳۱)

(اے نبی ﷺ) کو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا..... کو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورہ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أَسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ۔ (آیت: ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو پیشواؤ مقرر کر رہا ہے، ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے، ان کی زندگی کو نمونہ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرم رہا ہے کہ یہ روشن اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضور اکرم ﷺ رہنمایا اور یہاں خود میں بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپ ﷺ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپ ﷺ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضرت ﷺ کا مامور من اللہ رہنا و پیشواؤ

قرار دے رہے ہیں، تو پھر آپ ﷺ کی حیروی اور آپ ﷺ کے نمونہ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سرا اسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی حیروی ہے۔ اگر یہ مراد ہوتی تو فاتباعوا القرآن فرمایا جاتا ہے کہ فاتباعونی۔ اور اس صورت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اسوہ حسنہ کرنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

### (و) رسول اللہ ﷺ بحیثیت شارع

سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَا أَمْرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايُهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيَحِلُّ لَهُمُ الْأَطْيَبُتْ وَيَحْرُمُ عَلَيْهِمُ  
الْخَبُثُ وَيُضْعِفُ عَنْهُمُ اصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (آیت: ۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر نپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو نشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نبی اور تحمل و تحريم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے، بلکہ جو کچھ نبی اکرم ﷺ نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے، وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لئے وہ بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورہ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وَمَا أَنْتُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَإِنْتُمْ هَاجُ وَاتَّقُوا اللَّهَ طَوْلَانَ اللَّهِ  
شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (آیت: ۷)

جو کچھ رسول حسمیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کروئے اس سے

رک جاؤ ایور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دیئے والا ہے۔

ان دونوں آنکھوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جاسکتی کہ ان میں قرآن کے امر اور قرآن کی تخلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تخلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میان سے یہ کہتا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی، آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے گئے۔

### (ھ) رسول اللہ ﷺ بحیثیت قاضی

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اس نے نبی اکرم ﷺ کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَنَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَكَ اللَّهُ

(النساء: ۱۰۵)

(اے نبی ﷺ) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فہمہ کرو۔  
وَقُلْ اَمْنُتُ بِمَا اَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأَمْرَتُ لَأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

(الشوری: ۱۵)

اور (اے نبی ﷺ) کو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کرو۔  
إِنَّمَا كَلَّنَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ لَذَادِ عِوَادَةِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطْعَنَا۔ (النور: ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب توہ بلاۓ جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے توہ کہیں کہ ہم نے سنًا اور مان نیا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا أَنَّهُ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِنَّ الرَّسُولَ رَأْيُ الْمُنَافِقِينَ  
يَصِدُّونَ عَنْكَ صِدْرُوكَ (النساء: ٦١)۔

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنی کھراتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يَوْمَنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُوكُ فِيمَا شَجَرَ بِيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي  
أَنفُسِهِمْ حَرْجًا مَا قَضَيْتُ وَيَسِّلُمُوا قَسْلِيْمًا۔ (النساء: ٦٥)

پس (اے نبی ﷺ) تیرے رب کی حیثیت وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے بھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ ہاں لیں، پھر جو فیصلہ تو کرنے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی عجیب تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے برو چشم قبول کر لیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی اکرم ﷺ خود ساختہ یا مسلمانوں کے مقرر کئے ہوئے حج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے حج تھے۔ تیسرا آہت ہتاری ہے کہ آپ ﷺ کی حیثیت ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ﷺ کی حیثیت میں آپ ﷺ ابھی حج بھی تھے اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس وقت تک بھج نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ ﷺ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویہ نہ اختیار کر لے۔ چوتھی آہت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لئے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسول ﷺ حج کی حیثیت سے، اور ان دونوں سے مدد موزنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آہت میں بالکل بے لائی طریقہ سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو شخص حج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی عجیب محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

(و) رسول اللہ ملکهم بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور بخوار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم و فرمازو تھے اور آپ ﷺ کو یہ منصب بھی رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے عطا ہوا تھا۔

وَمَا رَسَّلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيَطَّاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ۔ (النساء: ۶۲)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے ازن (Sanction) ہے۔

مَنْ يَطِعُ الرَّسُولَ فَقَدْ أطَاعَ اللَّهَ۔ (النساء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

أَنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ أَنَّمَا يَبَايِعُونَ اللَّهَ۔ (الفتح: ۱۰)

(اے نبی ﷺ) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِّيعُوا اللَّهَ وَاطِّيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تَبْطِلُوا اعْمَالَكُمْ

(محمد: ۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمْ  
الْخِيرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ طَوْمَنْ يَعْصِي اللَّهُ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔

(الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر انہ کے لئے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطْبِعُوا اللَّهَ وَاتْبِعُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِكُمْ هُنَّ  
تَفَازُعُكُمْ فِي شَيْءٍ فَرُوْهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ لَنْ كُنْتُمْ تَوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ۔ (النساء: ٥٩)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی  
اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان  
نزاع ہو جائے تو اس کو پھر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان  
رکھتے ہو اللہ اور روز آخر پر۔

یہ آیات صاف بتاری ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم  
کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو، یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ  
وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرماندا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے  
منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا یعنی اللہ کی طرف  
سے اس کا حاکم مطابع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت یعنی اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے  
بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی  
کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاتھ مقبول نہ ہو۔  
اس کے مقابلے میں اہل ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور اس کے  
حکمران سب شامل ہیں) قطعاً "یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کرچکا  
ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔"

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے  
جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:  
سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت۔

پھر تیرے درجے میں اولی الامر کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے،

بلکہ ان سے الگ اور پلا اتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آبیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لئے مرجع دو ہیں، ایک اللہ' دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسول ﷺ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جب کہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہد رسالت میں خود ذات رسول کی طرف اور اس عہد کے بعد سنت رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔<sup>۱</sup>

### سنت کے مأخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع

اب اگر آپ واقعی قرآن کو مانتے ہیں اور اس کتاب مقدس کا نام لے کر خود اپنے من گھرست نظریات کے معتقد بننے ہوئے نہیں ہیں، تو دیکھ لجئے کہ قرآن مجید صاف و صریح اور قطعاً "فِيْرَ شَبَّرَ الْفَاظُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُوْ خَدَّا كی طرف سے مقرر کیا ہوا مطمئن، ملی، پیشوا، رہنمای شارح کلام اللہ، شارع

<sup>۱</sup> بلکہ اگر نائز نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہد رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنت رسول اللہ ﷺ کی مرجع تھی۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرہ عرب پر پہنچی ہوئی تھی۔ دس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ برآہ راست نبی اکرم ﷺ سے کرایا جائے۔ لامحالہ اس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنرزوں، قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے مأخذ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنت رسول اللہ ﷺ کی تھی۔

(Law Giver) ہم کے یہ تمام مناصب اس کتاب پاک کی رو سے منصب رسالت کے اجزاء لاینک ہیں۔ کلام الہی کی بھی تصریحات ہیں جن کی عناہ پر صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورہ بالا تمام جیشیات میں حضور اکرم ﷺ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا مانع قانون (Source of Law) ہے۔

سنن کو بجائے خود مانع قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال تک جو ثبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنن چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقیں ناقابل انکار ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد ﷺ کی سنن پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں چیم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرز تحریر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات، نظریہ حیات اور طریق حیات کے افہار سے جو گھری ممائیت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا غفر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت ہائے رکھنے کی سب سے بڑی بیادی وجہ ہے، میں اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنن پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنن ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لئے ہمیں اندر ہیرے میں ٹھوٹنا پڑ رہا ہو۔

جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے عمد ثبوت میں

مسلمانوں کے لئے محض ایک بڑا وحدت اور واعظ نہیں تھے بلکہ علما ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مولیٰ، معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تکمیل آپ ﷺ کے ہتھیارے، سکھائے اور مقرر کئے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے نمازِ روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور ہاتھی باقی مخصوص وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ ﷺ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً "مسجدوں میں راجح ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں، اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لیکن دین کے جو ضابطے آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ خدمات کے جو فیصلے آپ ﷺ نے کئے وہی ملک کا قانون قرار پائے، لاائسوں میں جو معاملات آپ ﷺ نے وہ بنوں کے ساتھ اور رفع پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کئے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا، جو آپ ﷺ نے خود راجح کیں یا جنہیں پہلے کے مردی طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ ﷺ نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔

یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لے کر خاندان، منڈی، عدالت، ایوان حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں عمل و رازمہ شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے ہدید سے لے کر دور حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ تھوڑی صدی تک تو ان ادارت کے تسلیل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو

صرف حکومت و حکومت اور پلیک لاء کے اوارات عملاً درہم برہم ہو جائے سے ہوا ہے..... ان (سنتوں) کے معاٹے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی بیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنت ثابتہ کیا ہے۔ ایک تو وہ معلوم اور متعارف سنن تحسیں جن کا ذکر ہم اور پر کرچے ہیں اور دوسرے ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ حقیقی جنہیں حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں شہرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر<sup>۱</sup> و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص اشخاص کے علم میں آئی تحسیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے..... ان سنتوں کا علم جو متفق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا، امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فوراً<sup>۲</sup> ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاً، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے نے پہلے یہ معلوم کر لیتا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاٹے میں آنحضرت ﷺ کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور اس سے تیری چو تھی صدی تک ان متفق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

<sup>۱</sup>۔ شرعی اصطلاح میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا ہو یا کوئی طریقہ رائج پایا ہو اور اسے منع نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریر کے معنی ہیں کسی چیز کو برقرار رکھنا۔

ہے۔ موضوعات گھر نے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنا دی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص مزاپا سکتا تھا یا کوئی لزム بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا، ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افقاء کی مندیں اتنی بے پرواہ نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر دیتا۔ اسی لئے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چجان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی، اور وہ سارا مowa جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا رد کردی گئی ہے، تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیق رائے قائم کر سکے۔ چونکہ ان کے لئے سنت قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں نیچلے ہونے تھے اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں نکل کے معاملات چلنے تھے، اس لئے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لا ابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نسل نسل میراث میں ملے ہیں اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لا نیخل معمر ہے جس سے وہ دو چار ہو گیا ہے۔

(۳)

## خلافت راشدہ کا تعامل

اور

## مجہرین امت کے فیصلے

غیرا<sup>۱</sup> مانند خلافت راشدہ کا تعامل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد اسلامی ائمۃ  
کو خلفائے راشدین نے جس طرح چلایا اس کے نتائج اور اس کی روایات سے  
حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے لئے  
ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں یہ اصول شروع سے آج تک مسلم رہا  
ہے کہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابہ کرام نے پالا تھا کی ہیں (جسے  
اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے) اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفائے  
راشدین نے صحابہ کے مخورے سے کر دیے ہیں وہ ہمارے لئے جنت ہیں، یعنی ان  
کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ صحابہ کے کسی معاملہ میں متفق ہو جانے کا  
مطلوب یہ ہے کہ وہ ایک مستند تعبیر قانون اور معتبر طریق عمل ہے۔ جہاں ان کے  
درمیان اختلافات ہوئے ہیں، وہاں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں دو یا  
دو سے زیادہ تعبیروں کی مکملیت ہے اور ایسے معاملات میں دلیل سے ایک قول کو

<sup>۱</sup> اقتباس از "اسلامی دستور کی تدوین" از مولانا مودودی صاحب۔ مطبوعہ اسلامک پبلی

دوسرے قول پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ مگر جہاں ان کے درمیان کامل اتفاق ہو گیا ہے۔ وہاں ان کا فعلہ لازماً ایک ہی تحریر اور ایک ہی طرز عمل کو صحیح و مستحدہ ثابت کرنے تھے، کیونکہ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے براہ راست شاگرد اور تربیت یافتے تھے اور ان سب کا متفق ہو کر دین کے معاملے میں غلطی کر جانا یادیں کے سمجھنے میں راہ صواب سے ہٹ جانا قابلِ حلیم نہیں ہے۔

چوتھا مأخذ مجتہدین امت کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آئے پر اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں کئے ہیں۔ یہ چاہے جماعت نہ ہوں، مگر بہر حال اسلامی دستور کی روح اور اس کے اصولوں کو سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے دستور کے چار مأخذ۔ ہم جب بھی اسلامی حکومت کا دستور تحریری محل میں لانا چاہیں، ہم کو انہی مأخذ سے اس کے قواعد جمع کر کے مرتب کرنے ہوں گے، بالکل اسی طرح ہیسے انگستان کے لوگ اگر آج اپنا دستور مدون کرنا چاہیں تو اسیں اپنے وضعی قانون (Statute Law) اور عرفی قانون (Law of Common Law) اور اپنے دستوری (Conventions of the Constitution) سے ایک ایک جزاً اخذ کر کے صفحہ کاغذ پر ثبت کرنا ہو گا اور بہت سے دستوری احکام و قواعد ان کو اپنی عدالتوں کے فیصلوں سے جن جن کرنا لئے ہوں گے۔ اُ

ان اسلامی قانون کے سلسلہ کے دوسرے مباحث کے لئے ملاحظہ ہو صرف کی کتاب: "اسلامی قانون" مطبوعہ اسلامک ہیلی کیٹر لائبریری لاہور۔ مرتب

(۲)

## مشکلات اور موانع

جہاں تک اسلامی دستورِ مملکت کے ان مأخذ کا تعلق ہے، یہ سب تحریری فعل میں موجود ہیں۔ قرآن لکھا ہوا ہے۔ سنت رسول ﷺ اور تعامل خلفائے راشدین کے تعلق سارا مoad کتابوں میں مل سکتا ہے۔ مجتہدین امت کی آراء بھی معترض کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ مفتوح ہے نہ ثابت۔ لیکن اس کے باوجود ان مأخذ سے اس غیر تحریری دستور کے قواعد اخذ کر کے ان کو تحریری دستور کی شکل دینے میں چند مشکلات اور چند وقایتیں حاصل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ ان کو بھی اچھی طرح سمجھو لیں۔

### (الف) اصطلاحات کی اجنیبت

سب سے پہلی وقت زبان کی ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں دستوری احکام کو بیان کرنے کے لئے جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ اب بالعموم لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہو گئی ہیں، کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے اور ان اصطلاحوں کا چلن نہیں رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ دستوری اصطلاحات ہیں، مثلاً "سلطان"، "ملک"، "حکم"، "امر"، "ولایت" وغیرہ۔ ان الفاظ کے صحیح دستوری مفہوم کو عربی میں بھی کم لوگ سمجھتے ہیں اور ترجموں میں منتقل ہو کر ان کا سارا مطلب خط ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی قرآن

کے دستوری احکام کا ذکر من کر حیرت کے ساتھ پوچھنے لگتے ہیں کہ قرآن میں کون سی آئیت دستور سے تعلق رکھتی ہے؟ فی الواقع ان بخواروں کی حیرت بجا ہے۔ قرآن میں کوئی سورت "الدستور" کے نام سے نہیں ہے اور نہ بیسیوں صدی کی اصطلاحات میں کوئی آئیت نازل ہوئی ہے۔

### (ب) قدیم فقیہی لڑپچر کی ناماؤس ترتیب

دوسری وقت یہ ہے کہ ہمارے فقیہی لڑپچر میں دستوری مسائل کمیں الگ ابواب کے تحت سمجھایاں نہیں کئے گئے ہیں بلکہ دستور اور قوانین ایک دوسرے کے ساتھ خلط لاط ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قانون سے الگ دستور کا جداگانہ تصور بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، بلکہ خود لفظ دستور کا استعمال بھی اپنے جدید معنوں میں ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ البتہ ان مسائل پر جنہیں اب ہم دستوری مسائل کتے ہیں، تمام فقہائے اسلام نے بحث کی ہے، مگر ان کی بحثیں ہم کو فقیہی کتابوں کے اندر مختلف قانونی ابواب میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ ایک مسئلے پر کتاب القناء میں بحث ہے تو دوسرے پر کتاب الامارت میں۔ ایک مسئلہ کتاب السیر (مسائل صلح و جنگ کی کتاب) میں بیان ہوا ہے تو دوسرا کتاب النکاح والطلاق میں۔ ایک مسئلہ کتاب الحدود (فوجداری قانون کی کتاب) میں آیا ہے تو دوسرا کتاب الخنز (پلک فینائس کی کتاب) یعنی۔ پھر ان کی زبان اور اصطلاحات آج کل کی راجح اصطلاحوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک کوئی شخص قانون کے مختلف شعبوں اور ان کے مسائل پر کافی بصیرت نہ رکھتا ہو اور پھر عربی زبان سے بھی بخوبی واقف نہ ہو، اس کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کہاں قانون ملکی کے درمیان قانون میں الاقوام کا کوئی مسئلہ آگیا ہے اور کہاں پر سل لاء کے درمیان دستوری قانون کے کسی مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مچھلی صدیوں کے دوران میں ہمارے بہترین قانونی دماغوں نے غایت درجہ بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے، مگر آج ان کی چھوڑی ہوئی میراث کو چھان پچک کر ایک ایک قانونی شعبے کے مواد کو الگ الگ

کرنا اور اسے منقح صورت میں سامنے لانا ایک بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے جس کے لئے موجودہ نسلیں، جنہوں نے مدت سے دوسروں کے پس خورده پر قباعت کر لی ہے، مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتی ہیں۔ بلکہ تم یہ ہے کہ آج وہ اپنی اس آبائی میراث کو بے جانے بوجھے تھارت کی لگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

### (ج) نظام تعلیم کا نقش

تیسرا مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم ایک کافی مدت سے بڑی ناقص ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہمارے ہاں علوم دینی پڑھتے ہیں وہ موجودہ زمانے کے علم، ایساٹ اور اس کے مسائل اور دستوری قانون اور اس سے تعلق رکھنے والے معاملات سے بیگانہ ہیں۔ اس لئے وہ قرآن و حدیث اور فقہ کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں تو عمریں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے لئے اس وقت کے سیاسی و دستوری مسائل کو آج کل کی زبان اور اصطلاحوں میں سمجھنا اور پھر ان کے پارے میں اسلام کے کیا احکام اور اصول ہیں اور وہ کہاں کہاں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عملًا ہمارے تمدن و سیاست اور قانون و عدالت کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے جدید مسائل سے تو واقف ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا دین ان مسائل کے پارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ وہ دستور اور سیاست اور قانون کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں مغربی تعلیمات اور مغرب کے عملی نمونوں ہی کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ قرآن اور سنت اور اسلامی روایات کے پارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں۔ اسلئے ان میں سے جو لوگ واقعی نیک نیتی کے ساتھ اسلامی زندگی کا از سر نواحیاء چاہتے ہیں وہ بھی اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ان مسائل کے پارے میں اسلام کی ہدایات ان کے سامنے اس زبان میں پیش کرے جسے وہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی چیز ہے جو ایک صحیح اسلامی دستور کی تدوین میں حارج ہو رہی ہے۔

## (و) اجتہاد بلا علم کا دعویٰ

چوتھی شکل ایک اور ہے جو اب بڑھتے بڑھتے ایک لینے اور مذاق کی حل اقتدار کر سکتی ہے۔ حال میں یہ ایک نرالا انداز لگر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں ”پریسٹ ہڈ“ نہیں ہے، قرآن اور سنت اور شریعت پر ”لا“ کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو، جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ دین کے معاملے میں ملائی کی بات ہماری بات سے زیادہ وزنی ہو۔ یہ باقاعدہ لوگ کہتے ہیں جونہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں، نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے، نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کئے ہیں۔ وہ ایجاد اوری کے ساتھ اپنے علم کا لفظ محسوس کرنے اور اسے دور کرنے کے بجائے سرے سے علم کی ضرورت ہی کا انکار کرنے پر قل مگئے ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر اپنی تجیروں سے اسلام کی صورت بگاڑ دینے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اگر جہالت کی اس طغیانی کو یونہی بڑھنے دیا گیا تو پہنچ نہیں کل کوئی اٹھو کر کے کہ اسلام میں ”وکیل ہڈ“ نہیں ہے اس لئے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اشیاء اور فرمائیں کہ اسلام میں ”انجینئر ہڈ“ نہیں ہے اس لئے ہم بھی انجینئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف ب سے بھی واقف نہ ہوں۔ اور پھر کوئی تیرے صاحب اسلام میں ”ڈاکٹر ہڈ“ کا انکار کر کے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علم طب کی ہوا بھی نہیں ہو۔ میں سخت حیران ہوں کہ اچھے خاص پڑھے لکھے اور ذی عزت لوگ یہ کیسی اوچھی اور طفلانہ باقی کرنے پر اتر آئے ہیں اور کیوں انہوں نے اپنی ساری قوم کو لہیانا دان فرض کر لیا ہے کہ وہ ان کی یہ باقی سن کر آمنا و صدقہ کردے دنے گی بے شک اسلام میں پریسٹ ہڈ نہیں ہے، مگر انہیں معلوم بھی ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب

صرف یہ ہے کہ اسلام میں نہ تو نبی اسرائیل کی طرح دین کا علم اور دینی خدمات کی نسل اور قبیلے کی میراث ہیں اور نہ عیسائیوں کی طرح دین و دنیا کے ورثیان تفرق کی گئی ہے کہ دنیا قیصروں کے حوالے اور دین پادریوں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ بلاشبہ یہاں قرآن اور سنت اور شریعت پر کسی کا اجارہ نہیں ہے اور ملا کسی نسل یا خاندان کا نام نہیں ہے جس کو دین کی تعبیر کرنے کا آبائی حق ملا ہوا ہو۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر دکیل اور بیج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجنینئر مگ پڑھ کر انجنینئر اور طب پڑھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے اور اسی طرح ہر شخص قرآن اور سنت کے علم پر وقت اور محنت صرف کر کے مسائل شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریست ہڈ نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ بھی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کوئی بازیچہ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اٹھ کر اس کے احکام اور تعالیمات کے پارے میں ماہرانہ فیصلے صادر کرنے شروع کر دے، خواہ اس نے کتاب اور سنت میں بصیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی ہو۔ علم کے بغیر اتحاری بخنسے کا دعویٰ اگر دنیا کے کسی دو بھرے معاملے میں قابل قبول نہیں ہے تو آخر دین یعنی کے معاملہ میں کیوں قابل قبول ہو؟

یہ چوتھی وجہ گی ہے جو اسلامی ریاست کے تصور کو پر اندازہ کرنے اور اسلامی دستور کی تدوین کے معاملے میں اب ڈال دی گئی ہے اور اس وقت درحقیقت یہی سب سے بڑی وجہ گی ہے۔ پہلی تین مشکلات کو تو محنت اور کوشش سے رفع کیا جاسکتا ہے اور خدا کے فضل سے ایک حد تک رفع کر بھی دیا گیا ہے لیکن اس نئی الجھن کا علاج سخت مشکل ہے "خصوصاً" جب کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے ہو جو بالفعل اقتدار کی تجویں پر قابض ہیں۔

---

## ضمیمه باب ششم

### سنن رسول اللہ مطبیعہ علم بحیثیت مأخذ قانون

(ذیل میں جسٹس ایس اے رحمان صاحب کے ایک خط پر مصنف کا تبصرہ درج کیا جا رہا ہے۔ وہ خط دراصل اس مراسلت کا ایک حصہ تھا جو ترجمان القرآن کے صفحات میں صاحب موصوف اور پروفیسر عبدالحمید مدبیقی صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ ان صفحات میں اس بحث کو نقل کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سنن کے متعلق جو اہم سائل ذیر بحث آگئے ہیں ان سے عام ناظرین استفادہ کر سکیں۔ فاضل مکتب نگار کے اصل خط کو یہاں درج کرنے کی حاجت نہیں ہے کیونکہ اس کا متعلقہ حصہ خود ہمارے تبصرے میں آگیا ہے۔

فاضل مکتب نگار نے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے ہوئے نمبردار جو اشارات فرمائے ہیں ان میں سے نمبر ۳ کچھ بحث طلب ہے، کیونکہ اپنی موجودہ مختصر صورت میں وہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے میں اس کے متعلق کچھ باقیں اس توقع کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ ان پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

مدبیقی صاحب نے اس خیال کا انعام کیا تھا کہ آئندہ سلف کی مرتب کردہ فقہ پر نظر ہانی اگر کی جاسکتی ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان کا کوئی اجتہاد و استنباط قرآن و سنن کے مطابق ہے یا نہیں۔ فاضل مکتب نگار اس کے متعلق فرماتے ہیں:

”جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تحریر و تعبیر کا حق برقرار رکھتے ہوئے ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا لیکن جیسا کہ آپ ہانتے ہیں سنن کا مسئلہ مختلف نیہ ہے۔“

ان الفاظ ہے یہ گمان ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک قرآن تو اسلامی احکام معلوم کرنے کے لئے ضرور مرجع و سند ہے مگر وہ سنت کو یہ حیثیت دینے میں اس بنا پر مثال ہیں کہ اس کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اب یہ بات ان کے بیان سے واضح نہیں ہوتی کہ اس مسئلے میں کیا چیز مختلف فیہ ہے؟

**کیا سنت کا مأخذ قانون ہونا مسلمانوں میں اختلافی مسئلہ ہے؟**

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ بجائے خود سنت (یعنی رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل اور امر و نہی) کا مأخذ قانون اور مرجع احکام ہونا یعنی مختلف فیہ ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ جس روز سے امت مسلمہ وجود میں آئی ہے اس وقت سے آج تک یہ بات اہل اسلام میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہی ہے۔ تمام امت نے یہیشہ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف اور متبع ہیں<sup>۱</sup>، ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے امر و نہی کا اتباع ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جس طریقے پر چلنے کی انسوں نے اپنے قول و عمل اور تقریر اس سے تعلیم دی ہے اس کی ہیروی پر ہم مامور ہیں اور زندگی کے جس معاملے کا بھی انسوں نے فیصلہ کر دیا ہے اس میں کوئی دوسرا فیصلہ کر لینے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخ اسلام کے گذشتہ ۱۳۸۱ سال میں کس نے اور کب اس سے اختلاف کیا ہے۔ زوال ایجخ نکالنے والے کچھ منفرد اور شاذ قسم کے خبیث تو دنیا میں یہیشہ ہرگز وہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کے افراد نے کبھی مسلمات قوم کے خلاف کوئی بات کر دی ہو تو اس کی ہنا پر یہ کہہ دینا صحیح نہیں ہے کہ ایک عالم گیر مسلمہ مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ مسلمہ

<sup>۱</sup> تقریر سے مراد کسی رائج وقت طریقے کو برقرار رکھنا یا کسی شخص کو کوئی عمل کرتے دیکھ کر منع نہ کرنا ہے۔

نہیں رہا۔ اس طرح تو خطیوں کی تائیت سے قرآن بھی نہیں پچاہے۔ کہنے والے تحریف قرآن تک کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب کیا ان کی وجہ سے ہم کلامِ الہی کے مرجع و سند ہونے کو بھی خلاف فیہ مان لیں گے؟

کیا اختلافات کی منجاش ہونا سنت کے مأخذ قانون ہونے میں مانع ہے؟

لیکن اگر خلاف فیہ سنت کا بجائے خود مرجع و سند ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنت ثابت ہے یا نہیں، تو ایسا یہ اختلاف قرآن کی آیات کے مفہوم و مفہماں میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحب علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے لکھا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتب نگار نے خود قرآن مجید میں اختلاف تغیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی منجاش ہونے کے باوجود وہ بجاۓ خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی منجاش ہونے کے باوجود فی نفسہ "سنت" کو مرجع و سند حلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے۔

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون دان سے جیسے کہ محترم مکتب نگار ہیں، تھی نہیں وہ سمجھتی کہ قرآن کے کسی حکم کی خلاف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے یا عدالت نے تغیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرتے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل فنا قرار دیا ہو اس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلہ میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا الجیسی ملیپجر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لئے حکم رسول ہے اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول

کا حکم دی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور اس کے رسول کو آخری سند (Final Authority) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لئے قانون واجب الالجاع ہے۔ لہذا میں جناب ایس اے رحمان صاحب کی یہ بات سمجھتے ہے مخذول ہوں کہ احکام فہد کی تحقیق میں وہ قرآن کو تو ان اختلافات کے باوجود مرجع و سند مانتے ہیں جو اس کے شناکی نسبین میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، مگر سنت کو یہ حدیث دینے میں اس بنا پر تامل کرتے ہیں کہ جزئیات مسائل کے متعلق سنتوں کے شخص کرنے میں اختلافات واقع ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

کیا احادیث موضوع کی موجودگی واقعی بے اطمینانی کی موجب ہے؟ آگے چل کر صاحب موضوع سنت کو سند قرار نہ دینے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ”متعدد احادیث موضوع تداولہ مجموعوں میں شامل ہو گئی ہیں۔“ اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ”اس موضوع پر حفظ کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔“ بظاہر اس ارشاد سے ان کا دعا یہ متصور ہوتا ہے کہ سنت ایک مخلوق چیز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شبہ اختصار بیان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور فی الواقع ان کا دعا یہ نہ ہو۔ لیکن اگر ان کا دعا یہی ہے تو میں عرض کردار گا کہ وہ اس مسئلے پر مزید غور فرمائیں۔ انشاء اللہ انہیں خود محسوس ہو گا کہ جس چیز کو وہ سنت کے مخلوق ہونے کی دلیل سمجھ رہے ہیں وہی دراصل اس کے محفوظ ہونے کا اطمینان دلاتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اس سوال کو چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ کون سے تداول مجموعے ہیں جن میں احادیث موضوع شامل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ مختلف محدثین نے جو مجموعے بھی مرتب کئے ہیں ان میں اپنی حد تک پوری چیز میں کر کے انہوں نے یہی کوشش کی ہے کہ قابل اعتماد روایات جمع کریں۔ مگر اس معاملے میں صحاح ستہ اور موطا کا پایہ

س قدر بلند ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ نبھی لیں کہ سب مجموعوں میں موضوعات نے کچھ نہ کچھ راہ پالی ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ وہ "ضخیم کتابیں" جن کا ذکر فاضل مکتوب نگار کر رہے ہیں آخر ہیں کس موضوع پر۔ ان کاموں کا تو ہے کہ کون کون سی حدیثیں و ضعی ہیں، کون کون سے راوی کذاب اور وضایع حدیث ہیں، کہاں کہاں موضوع احادیث نے راہ پالی ہے، کس کتاب کی کون کون سی روایات ساقط الاعتبار ہیں، کن راویوں پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں اور کن پر نہیں کر سکتے، "موضوع" کو "صحیح" سے جدا کرنے کے طریقے کیا ہیں اور روایات کی صحت، ضعف، علت وغیرہ کی تحقیق کن کن طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ ان ضخیم کتابوں کی اطلاع پا کر تو ہمیں امن کا ویسا ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے جیسا کسی کو یہ سن کر ہو کہ بکھرت چور پکڑ لئے گئے ہیں، بڑے بڑے جیل خانے ان سے بھر گئے ہیں، بہت سے اموال مسروقہ برآمد کر لئے گئے ہیں اور سراغ رسانی کا ایک باقاعدہ انتظام موجود ہے جس سے آئندہ بھی چور پکڑے جاسکتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہو گی اگر کسی کے لئے یہی اطلاع اُنہی بے اطمینانی کی موجب ثابت ہو اور وہ اسے بد امنی کے ثبوت میں پیش کرنے لگے۔ بے شک بڑی مثالی حالت امن ہوتی اگر چوری کا سرے سے کبھی وقوع ہی نہ ہوتا۔ بلاشبہ اس طرح کی واردات ہو جانے سے کچھ نہ کچھ بے اطمینانی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے، لیکن مکمل حالت امن زندگی کے اور کس معاملے میں ہم کو نصیب ہے جو یہاں ہم اسے طلب کریں۔ جس حالت پر ہم دنیا میں بالعموم مطمئن رہتے ہیں اس کے لئے اتنا امن کافی ہے کہ چوروں کی اکثریت پکڑ کر بند کر دی جائے اور جو قلیل تعداد بھی آزاد پھر رہی ہو اس کے پکڑے جانے کا معقول انتظام موجود ہو۔ کیا ہمارے پریم کورٹ کے فاضل بجست کے معاملے میں اتنے امن پر قائم نہیں ہو سکتے؟ کیا وہ اس مکمل امن سے کم کسی حصہ پر راضی نہیں ہیں جس میں سرے سے چوری کے وقوع ہی کا نام و نشان نہ پایا جائے؟

## روایات کی صحبت جانپنھنے کے اصول

آخر غل فاضل محترم تحریر فرمائے ہیں:

”میں اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کا قائل نہیں۔ سفنِ متوارث جن کا تعلق طریق عبادات مثلاً نماز یا مناسک حج وغیرہ سے ہے ان کی حیثیت مصون و مامون ہے۔ لیکن باقی ماندہ موارد احادیث روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں پر پرکھا جانا چاہئے پیشہ راس کے کہ اس کی صحبت قبول کی جائے میں تاریخی تنقید کا قائل ہوں۔“

یہ ایک حد تک صحیح نقطہ نظر ہے لیکن اس میں چند امور ایسے ہیں جن پر میں آں محترم کو مزید غور و تکری کی دعوت دوں گا۔ جس تاریخی تنقید کے وہ قائل ہیں، فن حدیث اسی تنقید ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی ہے آج تک اس فن میں بھی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، کسی مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر صحبت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (Improvement) کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کی تنقید کے اصول اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ دور کے ناقدین تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس بے بھی آگے بڑھ کر میں بلا خوف تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے، ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھہر سکے اور اس کو قابل تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جاسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے جدید

زمانے کے اہل علم اس فن کا تحقیقی مطالعہ نہیں کرتے اور قدیم طرز کے اہل علم جو اس میں بصیرت رکھتے ہیں وہ اس کو عصر حاضر کی زبان اور اسالیب بیان میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے باہر والے تو درکنار خود ہمارے اپنے گرفتے لوگ آج اس کی قدر نہیں پچان رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علوم حدیث میں سے اگر صرف ایک علیحدہ حدیثی کے فن کی تفصیلات سامنے رکھ دی جائیں تو دنیا کو معلوم ہو کہ تاریخی تقدیم کسی چیز کا نام ہے۔ تاہم میں یہ کوئی گاہکہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو جانپنے اور پر کھنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کئے ہیں وہ حرف آخر ہیں۔ آج اگر کوئی ان کے اصولوں سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی کی یا خامی کی نشان دہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تقدیم کے لئے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون یہ نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ ﷺ کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنت ثابتہ ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچھ بھی بات حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

### روایت کی حقیقت

احادیث کے پر کھنے میں روایت کے ساتھ روایت کا استعمال بھی، جس کا ذکر محترم مکتب لگانے کیا ہے، ایک متفق علیہ چیز ہے۔ اگرچہ روایت کے مفہوم، اصول اور حدود میں فقماء و محدثین کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلاف رہے ہیں، لیکن بجائے خود اس کے استعمال پر "تقریباً" اتفاق ہے اور دور صحابہ کرام سے لے کر آج تک اسے استعمال کیا جا رہا ہے البتہ اس سلسلے میں جو بات پیش نظر رہی چاہئے اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتب لگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہو گا، وہ یہ ہے کہ روایت صرف اُنی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فتنہ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کرچکے ہوں، جن میں ایک

مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کا رجھری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو اور خاص طور پر یہ سمجھ کہ جن کی عقل اسلامی نظام فکر و عمل کے حدود ارجمند سے باہر کے نظریات، اصول اور اقدار لے کر اسلامی روایات کو ان کے معیار سے پر کھنے کا رجحان نہ رکھتی ہو۔ بلاشبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگاسکتے، نہ کسی کہنے والے کی زبان کچڑ سکتے ہیں لیکن بہرال یہ امر صحیح ہے کہ اسلامی علوم سے کوئے لوگ اگر اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آئند پا کر قبول اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پا کر رد کرنے لگیں یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظام فکر و عمل میں پروردش پائے ہوئے حضرات یا کیک اٹھ کر اپنی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے رو و قول کا کار و بار پھیلا دیں تو مسلم ملت میں نہ ان کی دائریت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اس ملت کا اجتماعی ضرر ایسے بے شکنے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی تھیک کام کر سکتی ہے۔ اپنی رنگ و مزاج کی عقل یا غیر تربیت یافتہ عقل بجو اس کے کہ اشارہ پھیلانے کوئی تغیری خدمات اس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی۔

### سنن کے معجزہ ہونے کے دلائل

سنن کی جو تقسیم محترم مکتوب نگار نے "سنن متوارث جن کا تعلق طرق عبادات ہے" اور "باقی ماندہ مواد احادیث" میں کی ہے، اور ان میں سے مقدم الذکر کو مصون و مامون اور سوخر الذکر کو محتاج تحفیظ قرار دیا ہے، اس سے اتفاق کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں جو تصور کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو طریقے نبی اکرم ﷺ نے عبادات کے متعلق سمجھائے تھے وہ تو امت میں عملاً جاری ہو گئے اور نسل کے بعد نسل ان کی پیدا کرتی رہی، اس لئے یہ "متوارث" سنتیں محفوظ رہ گئیں، باقی رہے دوسرے معاملات زندگی تو ان میں حضور اکرم ﷺ کی ہدایات نہ عملاً جاری ہوئیں، نہ ان پر کوئی نظام تبدیل و معاشرت کام کرتا رہا،

نہ وہ بازاروں اور منڈیوں میں راجح ہوئیں، نہ عدالتوں میں ان پر فیصلے ہوئے، اس لئے وہ بس متفرق لوگوں کی سینہ بسینہ روایات تک محدود رہ گئیں اور یہی مواد ایسا ہے کہ اب اس میں سے بڑی دیدہ ریزی کے بعد قابل اعتبار چیزیں تلاش کرنی ہوں گی۔ فاضل مکتب نگار کا تصور اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو میں بہت شکر گزار ہوں گا کہ وہ میری نلط فضی رفع کرویں۔ لیکن اگر یہی ان کا تصور ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ تاریخ سنت کی واقعی صورت حال سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے محمد نبوت میں مسلمانوں کے لئے محض ایک پیرو مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ "عماً" ان کی جماعت کے قائد، رہنماء، حاکم، قاضی، شارع، مرلي، معلم بکچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تکمیل آپ نبی کے ہتھے سکھائے اور مقرر کئے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے یہ کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسک حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو، اور باقی باقین محض و عظاو ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ ﷺ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً "مسجدوں میں راجح ہوئی اور اسی وقت جماعتوں اس پر قائم ہونے لگیں۔ صحیح اسی طرح شادی بیاہ اور خلاق دور اشت کے متعلق جو قوانین آپ ﷺ نے مقرر کئے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ ﷺ نے مقرر کئے انہیں کا بازاروں میں چلن ہونے لگا، مقدمات کے جو فیصلے آپ ﷺ نے کئے وہی ملک کا قانون قرار پائے، رواجوں میں جو معاملات آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کئے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ ﷺ نے یا تو خود راجح کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ ﷺ نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔ یہ وہ معلوم و

متعارف سنیں تھیں جن پر مسجد سے لے کر خاندان، منڈی، عدالت، ایوان حکومت اور بین الاقوی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عمد سے لے کر دور حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔ بھیل صدی تک توازن ادارات کے تسلیل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پلک لا کے ادارات عمل "درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ "متوارث" سنتوں کی محظوظیت کے قائل ہیں تو عبادات اور معاملات دونوں سے متعلق رکھنے والی یہ سب معلوم و متعارف سنیں متوارث ہی ہیں۔ ان کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی متفہ روایات اور دوسری طرف امت کا متوازن عمل" دونوں ایک دوسروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی بے راہ روی سے جو الحاقی چیز بھی کبھی داخل ہوئی ہے۔ علماء امت نے اپنے اپنے دور میں بروقت "بدعت" کی حیثیت سے اس کی الگ نشان دہی کر دی ہے اور قریب قریب ہر ایسی بدعت کی تاریخ موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد کس زمانے سے اس کا رواج شروع ہوا مسلمانوں کے لئے ان بدعتات کو سنن متعارفہ سے میتیز کرنا کبھی مشکل نہیں رہا ہے۔

### اخبار آحادی کی حیثیت

ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک تم سنتوں کی دہ تھی جنہیں حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں شرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضور اکرم ﷺ کے کسی فیصلے، ارشاد، ابر و نبی، تقریر و اجازت یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔ یہ سنیں عبادات اور معاملات دونوں ہی طرح کے امور سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا تعلق صرف معاملات سے تھا۔ ان

سنن کا علم جو حقوق افراد کے پاس نکلا ہوا تھا۔ امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فوراً "عی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاء، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آمده مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت ﷺ کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنن کا کوئی علم تھا، اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یعنی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور اس سے تیری چوتحی صدی تک ان حقوق سنون کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ موضوعات گزرنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ قریب قریب سب ناکام ہو گئیں، کیونکہ جن سنون سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنون پر احکام اور قوانین کا مدار تھا ان کے پارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افقاء کی مددیں اتنی بے پروا نہیں ہو سکتی تھیں کہ یوں ہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی ﷺ کہہ دیتا اور ایک حکم یا حج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر دیتا۔ اسی لئے جو سننیں احکام سے متعلق تھیں ان کے پارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چلنیوں سے ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انسیں پر کھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی، اور وہ سازا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مالی گئی ہے یا رد کردی گئی ہے تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قول کے متعلق تحقیقی رائے قائم کر سکے۔ ان سنون کا ایک محتدہ حصہ فقراء اور محرومین کے درمیان متفق علیہ ہے اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے ایک چیز کو سنن مانا ہے اور بعض نے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہل علم کے درمیان بحثیں جادی رہی ہیں

اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لئے بھی مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق تحقیق سے خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوجہ ہونے کی کسی کے لئے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبہ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دور عی سے حدیشوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گمراہ ہٹ لاق ہو گئی ہے۔

### احکامی احادیث کی احتیازی حیثیت

اس سلسلے میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لئی چاہیے کہ احادیث میں جو مواد احکام سے متعلق نہیں ہے بلکہ جس کی نوعیت محض ترجیح ہے، یا جو فتن، ملام، رفاقت، مناقب، فضائل اور ای ای طرح کے دوسرے امور سے تعلق رکھتا ہے، اس کی چنان میں وہ عرق ریزی نہیں کی گئی ہے جو احکامی سنتوں کے پاب میں ہوئی ہے۔ اس لئے موضوعات نے اگر راہ پائی بھی ہے تو زیادہ تر انہی ابواب کی روایات میں پائی ہے۔ احکامی سنتیں بے اصل اور جھوٹی روایتوں سے تقریباً بالکل ہی پاک کر دی گئی ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں ضعیف خبریں تو ضرور موجود ہیں مگر موضوعات کی نشان دہی مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے اور اخبار ضعیفہ میں سے بھی جس کسی کو فقہ کے کسی سکول نے قبول کیا ہے اس بنا پر کیا ہے کہ اس کے نزدیک وہ قرآن سے، سنن متعارفہ کے جانے پہچانے نظام سے، اور شریعت کے جامع اصولوں سے مناسب رکھتی ہے، یعنی روایتہ "ضعیف ہونے کے باوجود درایتہ" اس میں معنی کی قوت موجود ہے۔

محترم مکتبہ نگار کی چند سطروں پر یہ تفصیل تبصرہ میں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ یہ سطروں کسی عام آدمی کے قلم سے نہیں لکھی ہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ کے قلم سے لکھی ہیں جنہیں ہمارے پریم کورٹ کے نج کی بلند پوزیشن جاصل ہے۔

سنت کی شرعی و قانونی حیثیت کے متعلق اس پوزیشن کے بزرگوں کی رائے میں ذرہ برابر بھی کوئی کمزور پہلو ہو تو وہ بڑے دور رس تماج پیدا کر سکتا ہے۔ قریب کے زمانے میں سنت کے متعلق عدیہ کی بعض دوسری بلند پایہ شخصیتوں کے اپے ریمارکس بھی سامنے آئے ہیں جو صحیح نقطہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو باشی میں نے اس تبصرے میں عرض کی ہیں انہیں فاضل مکتب نگاری نہیں، ہمارے دوسرے حکام عدالت بھی اسی بے لگ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں جس کی ہم اپنی عدیہ سے توقع رکھتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۸ء)

---

## باب ۷

### اسلامی ریاست کی بنیادیں

- حاکیت کس کی ہے؟
- ریاست کے حدود عمل
- اعضاء ریاست کے حدود عمل اور ان کا باہمی تعلق
- ریاست کا مقصد وجود
- حکومت کی تشكیل کیسے ہو؟
- اولی الامر کے اوصاف
- شریعت اور اس کی بنیادیں
- حقوق شریعت
- شریوں پر حکومت کے حقوق

۲۳ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی بار آئیسوٹی ایشن کے صدر نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اسلامی دستور کے موضوع پر ایک محفل مذاکہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے پڑھے لکھے طبقے، خصوصیت سے وکاء کے ذہن میں اسلامی دستور کے متعلق جو الجھنیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ زمانہ ملک کی تاریخ میں بڑا اہم تھا اور سارے ملک میں اسلامی دستور کا مقابلہ بڑے زور شور سے برپا تھا۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں ناظم الدین رپورٹ پیش کی جانے والی تھی لیکن عوایی مقابلہ کے پیش نظر رپورٹ کے اجرا کو ایک ماہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ فطری طور پر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھر رہے تھے جن کا جواب ضروری تھا۔ مولانا مودودی نے اس محفل مذاکہ میں شرکت کر کے کئی گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا۔ مذاکہ کا آغاز مولانا مودودی کی ایک تقریر سے ہوا جس میں موصوف نے اسلامی ریاست اور اسلامی دستور کے بنیادی خدو خال واضح کیے اور اس کے بعد کئی گھنٹے تک سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہا۔ مندرجہ ذیل صفحات میں مولانا موصوف کی تقریر پیش کی جا رہی ہے جو اسلامی ریاست کی بنیادوں کو واضح کرتی ہے۔

مرتب

## اسلامی ریاست کی بنیادیں

میں سب سے پہلے دستور و ریاست کے چھ بڑے بڑے اور بنیادی مسائل کو لے کر مختصرًا یہ بتاؤں گا کہ اسلام کے اصلی مأخذ میں ان کے متعلق کیا قواعد ہیں ملتے ہیں۔ اس سے آپ خود یہ اندازہ کر سکیں گے کہ اسلام دستوری مسائل میں کوئی راہنمائی کرتا ہے یا نہیں، اور کرتا ہے تو آیا اس کی نوعیت مخفی سفارشات کی ہے یا ایسے قطعی احکام کی جنہیں ہم مسلمان ہوتے ہوئے رد نہیں کر سکتے۔ اس سلطے میں طوالت بے پہنچ کے لئے میں دستور کے صرف ۹ بنیادی مسائل پر مفہوم کروں گا:

- ۱۔ پہلا سوال یہ ہے کہ حاکیت کس کی ہے؟ کسی بادشاہ کی؟ یا کسی طبقہ کی؟ یا پوری قوم کی؟ یا خدا کی؟
- ۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کے حدود عمل کیا ہے؟ کس حد تک وہ اطاعت کی مسخر ہے اور کہاں اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جاتا ہے؟
- ۳۔ تیرا بنیادی سوال دستور کے بارے میں یہ ہے کہ ریاست کے مختلف اعضاء (Executive) یعنی انتظامیہ (Organs of the State) عدیلہ (Judiciary) اور مقتنہ (Legislature) کے الگ الگ حدود عمل کیا ہیں؟ ان میں سے ہر ایک کیا فریضہ ادا کرے گا اور کہن حدود کے اندر کرے گا؟ اور پھر ان کے درمیان تعلق کی کیا نوعیت ہو گی؟
- ۴۔ چوتھا اہم سوال یہ ہے کہ ریاست کا مقصد وجود کیا ہے؟ کس غرض کے لئے ریاست کام کرے گی اور اس کی پالیسی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

- ۵۔ پانچ سوال یہ ہے کہ ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے حکومت کی تشكیل کیسے کی جائے گی؟
- ۶۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ حکومت کے نظام کو چلانے والوں کی صفات کیا ہوں گی؟ کون لوگ اس کو چلانے کے اہل قرار دیجئے جائیں گے؟ (Qualifications)
- ۷۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ دستور میں شریعت کی بنیادیں کیا ہوں گی؟ کیسے کوئی شخص اس ریاست کا شریعی قرار پائے گا اور کیسے نہیں؟
- ۸۔ آٹھواں سوال یہ ہے کہ شریوں کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اور پھر
- ۹۔ نوواں سوال یہ ہے کہ شریوں پر ریاست کے حقوق کیا ہیں؟
- ہر دستور کے معاملے میں یہ سوالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام ان سوالات کا کیا جواب دیتا ہے؟

(I)

## حاکیت کس کی ہے؟

سب سے پہلے اس سوال کو بھیجئے کہ اسلامی ریاست کا دستور "حاکیت" کا مقام کس کو رہتا ہے؟

اس کا قطعی اور ناطق جواب قرآن سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ حاکیت ہر معنی میں اللہ تعالیٰ کی ہے اس لئے کہ وہی فی الواقع حاکم حقیقی ہے اور اسی کا یہ حق ہے کہ اس کو حاکم اعلیٰ مانا جائے۔ اس مسئلے کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھنا چاہے تو میں اسے مشورہ دوں گا کہ پہلے وہ "حاکیت" کے معنی اور تصور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

### حاکیت کا مفہوم

علم سیاست کی اصطلاح میں یہ لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ کسی شخص یا مجموعہ اشخاص یا ادارے کے صاحب حاکیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم قانون ہے۔ اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں، خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت۔ اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں، اسی کے دینے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو بھی سلب کر دے وہ آپ سے آپ معدوم ہو جاتا ہے۔ ایک قانونی حق پیدا ہی اس بنا پر ہوتا ہے کہ شارع (Lawgiver) نے اس حق کو پیدا کیا ہے، اس لئے جب شارع نے اس کو سلب کر

یا تو سرے سے کوئی حق باقی نہیں رہا کہ اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔ قانون صاحب حاکیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند کرتا ہے، مگر خود صاحب حاکیت کو پابند کرنے والا کوئی قانون نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں قادر مطلق ہے۔ اس کے احکام کے بارے میں خیر اور شر، صحیح اور مخلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ دہ کرے وہی خیر ہے، اس کے کسی تالع کو اسے شر قرار دے کر رد کر دینے کا حق نہیں ہے۔ جو کچھ دہ کرے وہ صحیح ہے مگری تالع اس کو خط قرار نہیں دے سکتا۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اسے سبوج و قدوس اور منزہ عن الخطایانا جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو۔

یہ ہے قانونی حاکیت (Legal Sovereignty) کا تصور جسے ایک قانون دان، فقیہ یا (Jurist) پیش کرتا ہے اور جس سے کم کسی چیز کا نام "حاکیت" نہیں ہے۔ مگر یہ حاکیت اس وقت تک بالکل ایک مفروضہ رہتی ہے جب تک اس کی پشت پر کوئی واقعی حاکیت یا علم سیاست کی اصطلاح میں سیاسی حاکیت قانونی حاکیت کو مسلط کرے۔

## حاکیت فی الواقع کس کی ہے؟

اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی حاکیت فی الواقع انسانی دائرے میں موجود بھی ہے؟ اور ہے تو وہ کہاں ہے؟ کس کو اس حاکیت کا حامل کہا جاسکتا ہے؟

کیا کسی شاہی نظام میں واقعی کوئی پادشاہ ایسی حاکیت کا حامل ہے یا کبھی پایا گیا ہے یا پایا جاسکتا ہے؟ آپ کسی بڑے سے بڑے مقنار مطلق فرمان روائی لجھتے۔ اس کے اقتدار کا آپ تجویہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کے اختیارات کو بہت سی خارجی چیزیں محدود کر رہی ہیں جو اس کے ارادے کی تالع نہیں ہیں۔

پھر کیا کسی جموروی نظام میں کسی خاص جگہ اٹھی رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ یہاں

واقعی حاکیت موجود ہے؟ جس کو بھی آپ اس کا حامل قرار دیں گے، تجویز کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس کے ظاہری اختیار مطلق کے پیچے کچھ اور طاقتیں ہیں جن کے ہاتھ میں اس کی پاگیں ہیں۔

مگر وجہ ہے کہ علم سیاست کے ماہرین جب حاکیت کا واضح تصور لے کر انسانی سوسائٹی کے دائرے میں اس کا واقعی مصدقہ تلاش کرتے ہیں تو انہیں سخت پریشانی پیش آتی ہے۔ کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر یہ جامہ راست آتا ہو۔ اس لئے کہ انسانیت کے دائرے میں، بلکہ درحقیقت مخلوقات کے دائرے میں اس قامت کی کوئی ہستی سرے سے موجودی نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن پار پار کھاتا ہے کہ فی الواقع حاکیت کا حامل صرف ایک خدا ہے۔ وہی عمار مطلق ہے (فَعَالٌ لِّعَايِرِيد)۔ وہی غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے۔ (لَا يُسْتَأْلِعُ عَمَّا يَفْعَلُ)۔<sup>۱</sup> وہی تمام اقتدار کا مالک ہے۔ (بِيَدِهِ مُلْكُوتٍ كُلِّ شَيْءٍ)۔<sup>۲</sup> وہی ایک ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ (وَهُوَ يَجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ)۔<sup>۳</sup> اور اسی کی ذات نزہ عن الخطا ہے (الْمَلِكُ الْقَدُوسُ السَّلَامُ)۔<sup>۴</sup>

## حاکیت کس کا حق ہے؟

پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت نفس الامری سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر کسی غیر اللہ کو یہ حاکمانہ حیثیت دے دی جائے تو کیا نی ا الواقع اس کا یہ

<sup>۱</sup> ہود: ۷۰۔ جو کچھ چاہے اسے پورے طور پر کر سکا ہے۔

<sup>۲</sup> الانہیاء: ۲۳۔ جو کچھ دہ کرتا ہے اس کی کوئی پرسش نہیں۔

<sup>۳</sup> المؤمنون: ۸۸۔ اس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے۔

<sup>۴</sup> المؤمنون: ۸۸۔ وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکا۔

<sup>۵</sup> الحشر: ۲۳۔ ہاد شاہ حقیقی، پاک ذات، سلامتی امن دینے والا۔

حق ہے کہ اس کا حکم قانون ہو، اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کے حکم کے بازے میں خبر و شرعاً صحیح و غلط کا سوال نہ انٹھایا جاسکے؟ یہ حق خواہ کسی شخص کو دیا جائے، یا کسی ادارے کو، یا باشندوں کی اکثریت کو، بہر حال یہ پوچھا جائے گا کہ اس کو آخر یہ حق کس بنیاد پر حاصل ہوا ہے؟ اور اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اسے افراود پر اس طرح حاکم ہونے کا حق حاصل ہے؟ اس سوال کا زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ لوگوں کی رضامندی اس حاکیت کے برحق ہونے کی دلیل ہے؟ مگر کیا آپ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی رضامندی سے اپنے آپ کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس خریدار کو اس شخص پر جائز حق مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے؟ اگر یہ رضامندی اس ملکیت کو برحق نہیں بناتی تو آخر کسی غلط شخص کی بنا پر شخص جہور کا رضامند ہو جانا کسی حاکیت کو برحق کیسے بناتا ہے؟ قرآن اس صحیحی کو بھی یہ کہہ کر سمجھا دیتا ہے کہ اللہ کی خلوق پر کسی خلوق کو بھی حکم چلانے کا حق نہیں ہے، یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور اس بنا پر حاصل ہے کہ وہی اپنی خلوق کا خالق ہے۔ الٰہُ الخَلْقُ وَالاَمْرُ۔ ۱۔ ”خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کے لئے ہے۔“ یہ ایک الیک معقول بات ہے جسے کم از کم وہ لوگ تو رو نہیں کر سکتے جو خدا کو خالق تسلیم کرتے ہیں۔

### حاکیت کس کی ہونی چاہئے؟

پھر تیرسا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض حق اور باطل کی بحث کو نظر انداز کر کے حاکیت کا یہ منصب کسی انسانی اقتدار کو دے بھی دیا جائے تو کیا اس میں انسانیت کی بھلائی ہے؟ انسان، خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو، یا کوئی طبقہ، یا کسی قوم کا

مجموعہ، بہر حال حاکیت کی اتنی بڑی خوراک ہضم نہیں کر سکتا کہ اس کو افراد پر حمچلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور اس کے مقابلے میں کسی کا کوئی حق نہ ہو اور اس کے فعلے کو بے خدامان لیا جائے۔ اس طرح کے اختیارات جب بھی کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہوں گے، ظلم ضرور ہو گا۔ معاشرے کے اندر بھی ظلم ہو گا اور معاشرے کے باہر دوسرے ہمایہ معاشروں پر بھی ظلم ہو گا۔ فساد اس بندوبست کی فطرت میں مضر ہے اور جب کبھی انسانوں نے زندگی کا یہ نجgar اختیار کیا ہے فساد رونما ہوئے بغیر نہیں رہا ہے۔ اس لئے کہ جس کی فی الواقع حاکیت نہیں ہے اور جس کو حاکیت کا حق بھی حاصل نہیں ہے، اسے اگر مصنوعی طور پر حاکیت کا مقام حاصل ہو جائے تو وہ اس منصب کے اختیارات کبھی صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ یہی بات ہے جسے قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ ”جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فعلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔“

### اللہ کی قانونی حاکیت

ان وجوہ سے اسلام میں یہ قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ قانونی حاکیت اسی کی مانی جائے جس کی واقعی حاکیت ساری کائنات پر قائم ہے اور جسے انسانوں پر بھی حاکیت کا لاشریک حق حاصل ہے۔ اس بات کو قرآن میں اتنی بار بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے اور اتنے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ پر زور الفاظ کسی بات کو بیان کرنے کے لئے ہو نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا:

لِنَحْكُمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمْرًا إِنَّا نَعْبُدُهُ وَإِنَّا إِيَّاهُ ذَالِكُ الدِّينُ الْقَيِّمُ

(یوسف: ۳۰)

حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں، اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو، یہی صحیح طریقہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ رِبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أُولَئِيَّاءَ۔ (اعراف: ۳)

پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دو مرے سرستوں کی پیروی نہ کرو۔

تیری جگہ خدا کی اس قانونی حاکیت سے انحراف کرنے کو مرتع کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكُفَّارُ۔ (المائدہ: ۳۳)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قانونی حاکیت تسلیم کرنے والے ایمان و اسلام ہے اور اس سے انکار قطعی کفر ہے۔

### رسول اللہ ملیک الملک کی حیثیت

دنیا میں اللہ کی اس قانونی حاکیت کے نمائندے انبیاء علیہم السلام ہیں۔ یعنی جس ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شارع (Law Giver) کا ہمارے لئے کیا حکم اور کیا قانون ہے، وہ ذریعہ انبیاء ہیں اور اسی بنا پر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ان کی بے چون و چہرا اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آیا ہے اس نے یہی اعلان کیا ہے کہ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاتَّبِعُوهُ۔ ”پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔“ اور

قرآن اس بات کو بطور ایک قطعی اصول کے بیان کرتا ہے کہ:  
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيَطَّاعَ بِذِنِ اللَّهِ۔ (النساء: ۶۲)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

مَنْ يَطِعُ الرَّسُولَ فَقَدِ اطَّاعَ اللَّهَ۔ (النساء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

حتیٰ کہ قرآن کسی ایسے شخص کو مسلمان مانتے سے انکار کرتا ہے جو اختلاف امور میں رسول اللہ ﷺ کو آخری فیصلہ دینے والی اتحارثی تسلیم نہ کرے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يَوْمَنُونَ حَتَّىٰ يَحْكُمُوكُ فِيمَا شَجَرَ بِيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي  
أَنفُسِهِمْ حَرْجًا مَا قَضَيْتُ وَيَسِّمُوا تَسْلِيْمًا۔ (النساء: ۶۵)

لیں نہیں، تمہرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلاف میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی شکی بھی عحسوں نہ کریں بلکہ سر ببر تسلیم کر لیں۔

پھر وہ کہتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قُضِيَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا إِنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَيْرُ  
مِنْ أَمْرِهِمْ طَوْمَنْ يَعْصِي اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا۔

(الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جب کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لئے پھر خود اپنے معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی ہاتھی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی محفوظیت ہی باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں

قانونی حاکیت خالصتہ" اور "کلپنہ" اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

### اللہ کی سیاسی حاکیت

اس اہم ترین دستوری مسئلے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر سیاسی حاکیت (Political Sovereignty) کس کی ہے؟ اس کا جواب لا محالہ بھی ہے اور بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے، کونکہ انسانوں میں جو ایکجھی بھی سیاسی طاقت سے اللہ تعالیٰ کی قانونی حاکیت کو نافذ (Enforce) کرنے کے لئے قائم ہو گی اس کو کسی بھی طرح قانون اور سیاست کی اصطلاح میں صاحب حاکیت (Sovereign) نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو طاقت قانونی حاکیت نہ رکھتی ہو اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی ایک بالاتر قانون نے محدود اور پاپند کر دیا ہو جسے برلنے کا اسے اختیار نہ ہو، وہ حاکیت کی حامل تو نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی صحیح پوزیشن کس لفظ سے ادا کی جائے؟ اس سوال کو قرآن ہی نے حل کر دیا ہے۔ وہ اسے لفظ خلافت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ بجائے خود حاکم اعلیٰ نہیں ہے بلکہ حاکم اعلیٰ کی نائب ہے۔

### جمهوری خلافت

اس نیابت کے لفظ سے آپ کا ذہن خل اللہ، اور پاپائیت اور بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights of the King) کی طرف خل نہ ہو جائے۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اللہ کی نیابت کا یہ مقام کسی فرد واحد، پاکسی خاندان، یا کسی مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکیت کو تسلیم کریں اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانونِ الہی کو بالاتر قانون مان لیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيُسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

(النور: ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم میں سے ایمان قول کیا  
اور عمل صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ چیز اسلامی خلافت کو تصریح اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست (Theocracy) کے بر عکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے، اور ہم مسلمان ہے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے ان کی جمہوریت میں بھی عامُّ رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی ہے اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی مقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔

---

(۲)

## ریاست کے حدود عمل

خلافت کی اس تشریع سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی دستور میں ریاست کے حدود عمل کیا ہیں۔ جب یہ ریاست اللہ کی خلافت ہے اور اللہ کی قانونی حاکیت تسلیم کرتی ہے تو لامحالہ اس کا دائرہ اختیار ان حدود کے اندر ہی محدود رہے گا جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ ریاست جو کچھ کر سکتی ہے ان حدود کے اندر ہی کر سکتی ہے، ان سے تجاوز کرنے کی وہ ازروئے دستور مجاز نہیں ہے۔ یہ بات صرف منطقی طور پر عی خدا کی قانونی حاکیت کے اصول سے نہیں بلکہ قرآن خود اس کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔ وہ جگہ جگہ احکام دے کر تنفسہ کرتا ہے۔ تلک حدود اللہ فلا تقربوها۔ ”یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، ان کے پاس نہ پھکو۔“ تلک حدود اللہ فلا تعتدوها۔ ”یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔“ ومن یتعد حدود اللہ فما ولنک هم الظالمون۔“ اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔“ پھر وہ بطور ایک قاعدہ کہیے کہ یہ حکم دعا ہے کہ:

یا ایها الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولى الامر منکم فان  
تنازعتم فی شیء عفردوه الی اللہ والرسول ان کنتم تو مذون بالله والیوم  
الآخر۔ (النساء: ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم کسی جنز میں جھکزو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ

اور آخرت کے دن پر۔

اس آیت کی رو سے ریاست کی اطاعت لازماً خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد، اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ احکام خدا اور رسول کی پابندی سے آزاد ہو کر ریاست کو سرے سے اطاعت کے مقابلے کا حق ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی نکتے کو نبی اکرم ﷺ نے یوں واضح فرمایا کہ لا طاعة لمن عص الله۔ "کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے۔" اور لا طاعة لمحظوق فی معصیۃ الخالق۔ "خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کے لئے اطاعت نہیں ہے۔"

اس اصول کے ساتھ دوسرا اصول جو یہ آیت مقرر کرتی ہے، یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو اختلاف بھی رونما ہو، خواہ وہ افراد اور افراد کے درمیان ہو یا گروہوں اور گروہوں کے درمیان یا بریعت اور ریاست کے درمیان یا ریاست کے مختلف شعبوں اور اجزاء کے درمیان، بہر حال اس کا فیصلہ کرنے کے لئے رجوع اس بنیادی قانون ہی کی طرف کیا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو دیا ہے۔ یہ اصول اپنی عین نوعیت ہی کے اعتبار سے اس بات کا تھاضا کرتا ہے کہ ریاست میں لازماً "کوئی ادارہ ایسا ہو ناچاہئے جو اختلافی معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کرے۔"

(۳)

## اعضاء ریاست کے حدود و عمل اور ان کا باہمی تعلق

بین سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ ریاست کے مختلف اعضا (Organs of the State) کے اختیارات اور حدود عمل کیا ہیں۔

### مجلس قانون ساز کے حدود

مقدنہ (Legislature) یہ وہ چیز ہے جسے ہمارے ہاں کی قدیم اصطلاح میں "امل المثل والعقد" کہا جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ جو ریاست اللہ اور رسول کی قانونی حاکیت مان کر ہنائی گئی ہو، اس کی مقدنہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے خلاف اپنے اجماع سے بھی کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں آپ کو قرآن کا یہ فیصلہ سنا چکا ہوں کہ "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ اور رسول جس معاملے کا فیصلہ کر چکے ہوں اس میں ان کو پھر کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔" اور "جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔" ان احکام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی کرنا مجلس قانون ساز کے حدود اختیار سے باہر ہو، اور ہر ایسا قانون، اگر وہ لیجسٹلیچر پاس بھی کر دے، لازماً حدود دستور سے متجاوز (Ultravires of the Constitution) قرار پائے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ پھر اسلامی ریاست میں مقدنہ کا کام یعنی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مقدنہ کے کئی کام ہیں:

۱۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول کے واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، ان میں اگرچہ مقتضے کوئی روبدل نہیں کر سکتی، مگر یہ کام مقتضے ہی کا ہے کہ ان کے نفاذ کے لئے ضروری قواعد و ضوابط (Rules and Regulations) مقرر کر دے۔

۲۔ جن معاملات میں کتاب و سنت کے احکام ایک سے زیادہ تعبیرات کے متحمل ہوں، ان میں مقتضے یہ طے کرے گی کہ کون سی تعبیر کو قانونی حل دی جائے۔ اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ مقتضے ایسے اہل علم پر مشتمل ہو جو تعبیر احکام کی الہیت رکھتے ہوں، ورنہ ان کے خلط فیصلے شریعت کو منع کر ڈالیں گے۔ لیکن یہ سوال رائے دہندوں کی صلاحیت انتخاب سے تعلق رکھتا ہے۔ اصولاً یہ ماننا پڑے گا کہ قانون سازی کی اغراض کے لئے مقتضے ہی مختلف تعبیرات میں سے ایک کو ترجیح دینے کی مجاز ہے اور اسی کی تعبیر قانون بننے گی، بشرطیکہ وہ تعبیر کی حد سے گزر کر تحریف کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

۳۔ جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں ان میں مقتضے کا کام یہ ہے کہ اسلام کے اصول عامہ کو پیش نظر رکھ کر نئے قوانین وضع کرے یا اگر ان کے بارے میں پہلے سے مدون کئے ہوئے قوانین کتب فقہ میں موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لے۔

۴۔ جن معاملات میں کوئی اصولی رہنمائی بھی نہ ملتی ہو ان میں یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قانون سازی میں آزاد چھوڑ دیا ہے، اس لئے ایسے معاملات میں مقتضے ہر طرح کے مناسب قوانین بنا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ جو کچھ منوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

یہ چاروں قاعدرے ہم کو سنت رسول اللہ ﷺ اور تعالیٰ خلقائے راشدین اور محدثین امت کی آراء سے معلوم ہوتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان میں سے ہر

ایک کا مخذلتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو شخص اسلامی ریاست کے بنیادی اصول سمجھ لے اسے خود عمل عام (Common Sense) بھی یہ بتا سکتی ہے کہ اس طرز کی ریاست میں متفہ کے بھی حدود عمل ہونے چاہئیں۔

### انظامیہ کے حدود عمل

اب انظامیہ کو لجھئے۔ ایک اسلامی ریاست میں انظامیہ (Executive) کا اصل کام احکام الٰہی کو نافذ کرنا اور ان کے نفاذ کے لئے ملک اور محاذرے میں مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ بھی امتیازی خصوصیت اس کو ایک فیر مسلم ریاست کی انظامیہ سے ممیز کرتی ہے، ورنہ ایک کافر حکومت اور مسلم حکومت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ انظامیہ وہی چیز ہے جس کے لئے قرآن میں "اولی الامر" اور حدیث میں "امراء" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن و حدیث دوںوں میں ان کے سمع و طاعت (Obedience) کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ احکام خدا اور رسول کے تابع رہیں، ان سے آزاد ہو کر معصیت اور بدعت اور احادیث فی الدین کی راہ پر نہ چل پڑیں۔ قرآن اس باب میں صاف کرتا ہے کہ:

و لا تطبع من اغفلنا قلبہ عن ذكرنا و اتبع هر و كان امره فرطه۔

(الکعن: ۲۸)

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نشیں کی پیردی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حدود آشنا نہ ہو۔

و لا تطیعوا امر المشرفین لا الذين يفسدون في الأرض ولا يصلحون۔

(الشوراء: ۱۵۱ - ۱۵۲)

اور ان حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

اور نبی اکرم ﷺ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

لَنْ أُمْرِ عَلَيْكُمْ عَبْدًا مَجْدِعًا يَقُولُ دُكْمَ بِكَتْلَبِ اللَّهِ فَاسْمَعُوا وَاطِّيعُوا۔

(مسلم)

اگر تم پر کوئی نکلا غلام بھی امیر ہٹا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

السمع والطاعة على المروع المسلم في ما لا حب وكره مالم يوم بمعصية  
فإنما أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (تفقیح علیہ)

ایک مرد مسلمان پر سمع و طاعت لاؤم ہے خواہ برضا و رغبت، خواہ بکراہت، تاؤ تھیجہ اس کو محیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر محیت کا حکم دیا جائے تو نہ کسی ہے نہ طاقت۔

لَا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف۔ (تفقیح علیہ)

محیت میں کوئی طاعت نہیں ہے۔ طاعت صرف معروف میں ہے۔

من الحديث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد۔ (تفقیح علیہ)

جس نے ہمارے اس کام (یعنی اسلامی نظام زندگی) میں کوئی الیٰ نئی بات ثکالی جو اس کے مزاج سے بیگانہ ہو تو وہ مردود ہے۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعلن على هدم الاسلام

(البيهقي في شعب اليمان)

جس نے کسی صاحب بدعت (یعنی اسلامی زندگی میں فیر اسلامی طریقے رائج کرنے والے) کی توقیر کی اس نے اسلام کو مندم کرنے میں مدد دی۔

ان تو نیحات کے بعد اس معاملے میں کوئی اشباه باقی نہیں رہ جاتا کہ اسلام میں انتظامی حکومت اور اس کے لفظ و نطق کے لئے کیا حدود عمل مقرر کئے گئے

ہیں۔

## حدیث کے حدود عمل

رعیٰ عدیث (Judiciary) جو ہماری قدیم اصطلاح "قضاء" کی ہم معنی ہے، تو اس کا دائرہ عمل بھی خدا کی قانونی حاکیت کا اصول آپ سے آپ میں کرتا ہے۔ اسلام جب کبھی اپنے اصولوں پر ریاست قائم کرتا ہے، اس کے اولین نجح خود انہیاء ہوتے ہیں، اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ قانون اللہ کے مطابق کریں۔ پھر جو لوگ انہیاء کے بعد اس کری پڑیں اس کے لئے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد اس قانون پر رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے ان کو ملائے ہے۔ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کے دور کو عاصی اسی موضوع پر ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے توراتہ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اور نبی اسرائیل کے سارے نبی اور پھر ربائی اور احبار اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان کے بعد عیسیٰ ابن مريم کو بھیجا اور ان کو انجلیل عطا کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اہل انجلیل کو چاہئے کہ وہ بھی اس ہدایت پر فیصلے کریں جو اللہ نے انجلیل میں نازل کی ہے۔ اس تاریخ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ کتاب (قرآن) تمہاری طرف تجیک تجیک حق کے ساتھ نازل کی ہے۔

فَلِحُكْمِ بِيَنْهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَنْعَمُ أَهْوَانُهُمْ عَمَّا جَاءُكُمْ مِنَ الْحَقِّ

(اماکدہ: ۳۸)

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس تقریر کو اس فقرے پر ختم فرماتا ہے۔

الْحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ طَوْمَنَ اَحْسَنَ مِنَ اللَّهِ حَكْمًا قَوْمٌ يَوْقَنُونَ۔

(المائدہ: ۵۰)

بھر کیا لوگ جاہلیت کے فیصلے ہاتھے ہیں؟ یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

اس تقریر کے دوران میں اللہ تعالیٰ تم نے مرتبہ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں، وہی فاسق ہیں۔ (المائدہ: ۳۲ - ۵۰) اس کے بعد شاید یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتیں قانون الہی کو نافذ کرنے کے لئے بتی ہیں نہ کہ اس کے خلاف فیصلے کرنے کے لئے۔

### مختلف اعضاۓ ریاست کا باہمی تعلق

اس سلسلے میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام میں ریاست کے ان تینوں اعضاۓ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس باب میں احکام تو موجود نہیں ہیں، مگر عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے تعامل (Convention) سے ہم کو پوری روشنی ملتی ہے۔ اس تعامل سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک صدر ریاست کا تعلق ہے، وہ صدر ہونے کی حدیثت سے ریاست کے ان تینوں شعبوں کا صدر ہے۔ یہی حدیث نبی اکرم ﷺ کو حاصل تھی اور یہی خلفائے راشدین کو حاصل رہی مگر صدر سے نیچے اتر کر ہم تینوں شعبوں کو اس دور میں ایک دوسرے سے الگ پاتے ہیں۔ اس زمانے میں اہل العمل والمعقول الگ تھے، جن کے مشورے سے خلافت راشدہ کے دور میں انتظامی معاملات بھی چلانے جاتے تھے اور قانونی سائل کے فیصلے بھی کئے جاتے تھے۔ نظم و نسق کے ذمہ دار امراء الگ تھے جن کا قضاۓ (عدالت) میں کوئی وغل نہ تھا اور قاضی (نج اور محضیث) الگ تھے جن پر انتظامی ذمہ داریوں کا کوئی بار نہ تھا۔

ملک کے اہم معاملات میں پالیسی بنانے یا انتظامی اور قانونی سائل کو حل

کرنے کی جب کبھی ضرورت پیش آتی، خلافائے راشدین ہیشہ اہل العمل والعقد کو بلا کر مشورہ کرتے تھے اور مشورے سے جب کوئی فیصلہ ہو جاتا تو اہل العمل والعقد کا کام ختم ہو جاتا۔

انتظامی عمدہ دار خلیفہ کے ماتحت تھے، وہی ان کو مقرر کرتا تھا اور اسی کے احکام کے مطابق وہ لطم و نق چلاتے تھے۔

قانیوں کا تقریب بھی اگرچہ خلیفہ کرتا تھا، مگر ایک مرتبہ قاضی مقرر ہو جانے کے بعد پھر خلیفہ کو بھی یہ حق نہ تھا کہ ان کے فیملوں پر اثر انداز ہو۔ بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں، یا مستظمہ کے صدر ہونے کی حیثیت میں، اگر کسی شخص کا ان کے خلاف کوئی دعویٰ ہوتا تھا، تو ان کو بھی قانیوں کے سامنے تھیک اسی طرح جوابدہ کرنی ہوتی تھی جس طرح رعیت کے کسی معمولی فرو کو کرنی ہوتی تھی۔

اس زمانے میں ہم کو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ایک شخص بیک وقت کسی علاقے کا عامل بھی ہو اور قاضی بھی۔ یا کوئی عامل یا گورنر، یا خود صدر ریاست کسی قاضی کے عدالتی فیملوں میں دخل دینے کا مجاز ہو۔ یا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی دیوانی و فوجداری دعوؤں کی جوابدی سے یا عدالتوں کی حاضری سے مستثنی ہو۔

اس نقشے کی تفصیلات میں ہم اپنی موجودہ ضرورتوں کے مطابق ردوبدل کر سکتے ہیں، مگر اس کے اصول جوں کے توں قائم رہنے چاہئیں۔ جس قسم کے جزوی ردوبدل اس میں کئے جاسکتے ہیں وہ اس طرح کے ہیں کہ "مثلاً" ہم صدر ریاست کے انتظامی و عدالتی اختیارات خلافائے راشدین کی بہ نسبت محدود کر سکتے ہیں، کیونکہ اب اس درجے کے قابل اعتماد صدر ریاست ہمیں نہیں مل سکتے جیسے خلفاء راشدین تھے۔ اس لئے ہم اپنے صدر کے انتظامی اختیارات پر بھی پابندیاں عائد کر سکتے ہیں تاکہ وہ ذکیرت نہ بن جائے اور اس کو مقدمات کی براہ راست خود سماحت کرنے اور ان کے فیصلے کرنے سے بھی روک سکتے ہیں تاکہ وہ بے انصافی نہ کرنے لگے۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ کی اس رائے کا مانع کیا ہے؟ مقرر نے اس کے جواب میں کہا کہ اس قول کے لئے میری دلیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ میں انتظامیہ اور عدیلیہ کے شعبے بالکل الگ الگ تھے۔ رہا صدر ریاست تو اس کی ذات میں ان دونوں اختیارات کو کسی حکم شرعی کی بنا پر جمع نہیں رکھا گیا تھا۔ بلکہ اس اعتماد پر جمع کیا گیا تھا کہ وہ جج کی حیثیت سے انصاف کی مند پر بینہ کر اپنی انتظامی مصلحتوں کو دخل نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ خلفائے راشدین کی ذات پر تو لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ خود یہ چاہتے تھے کہ آخری عدالت انصاف وہی ہوں ہا کہ اگر کہیں انصاف نہ ملے تو ان کے پاس ضرور مل جائے۔ اس اعتماد کی مستحق اگر کوئی شخصیت ہم نہ پاسکیں تو اسلامی دستور کے کسی قادرے نے ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کر دیا ہے کہ ہم صدر کی ذات میں چیف جش اور انتظامیہ کے رئیس اعلیٰ کی "حیثیتیں لازماً" جمع رکھیں۔)

ای طرح اس نقشے میں جو تبدیلیاں ہم کر سکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ مثلاً "ہم اہل والعقد کے انتخاب کے طریقے اور ان کی مجلس کے مقابلے حسب ضرورت بنا سکتے ہیں۔ ہم عدالتوں کے مختلف درجے مخصوص اختیارات، حدود سماحت اور حدود عمل کے ساتھ مقرر کر سکتے ہیں وغیرہ الگ۔

یہاں دو سوالات اور پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ آیا اسلام میں اس امر کی مخالفش ہے کہ قضاۓ (عدیلیہ) اہل والعقد کے ملے کئے ہوئے کسی قانونی مسئلے کو خلاف کتاب و سنت ہونے کی بنا پر رد کر دے؟ اس باب میں کوئی حکم میرے علم میں نہیں ہے۔ خلافت راشدہ کا تعامل بے شک یہی تھا کہ قضاۓ کو یہ اختیارات حاصل نہیں تھے۔ کم از کم اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قاضی نے ایسا کیا ہو۔ مگر اس کی وجہ میرے نزدیک یہ تھی کہ اس وقت اہل والعقد خود کتاب و سنت میں گری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے اور سب سے بڑھ کر خود خلفائے راشدین اس معاملے میں پوری طرح قابل اعتماد تھے کہ ان کی

صدرارت میں کوئی مسئلہ خلاف کتاب و سنت طے نہ ہو سکتا تھا۔ آج اگر ہم اپنے دستور میں اس امر کا کوئی قابل اطمینان انظام نہ کر سکیں کہ کسی مجلس قانون ساز سے کوئی قانون خلاف کتاب و سنت پاس نہ ہو سکے تو عدیلہ کو مخففہ کے فیصلوں کا پابند کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا کوئی قابل اطمینان انظام نہ کیا جاسکے تو پھر آخری چارہ کار بھی ہے کہ عدیلہ کو خلاف کتاب و سنت قوانین کے روکرنے کا اختیار ریا جائے۔

دوسرा سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں مخففہ (اہل العمل والعقد) کی صحیحیت کیا ہے؟ کیا وہ محض صدر ریاست کی مشیر ہے جس کے مشوروں کو ردیا تجویز کرنے کا صدر ریاست کو اختیار ہے؟ یا صدر ریاست اس کی اکثریت یا اس کے اجماع کے فیصلوں کا پابند ہے؟ اس باب میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے انجام پانے چاہئیں (و امرهم شوری یعنی) اور نبی اکرم ﷺ کو بحیثیت صدر ریاست کے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

وشاورهم فی الامر فما زاعمت فتوکل علی اللہ۔ (آل عمران: ۱۵۹)

اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو، پھر (مشورے کے بعد) جب تم حکم کرو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔

یہ دونوں آیتیں مشورے کو لازم کرتی ہیں اور صدر ریاست کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ مشورے کے بعد کسی فیصلے پر بھیج جائے تو اللہ کے بھروسے پر اسے نافذ کر دے۔ لیکن یہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتیں جو ہمارے سامنے پیش ہے۔ حدیث میں بھی اس کے متعلق کوئی قطعی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ البتہ خلافت راشدہ کے تعامل سے علماء اسلام نے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قلم ریاست کا اصل ذمہ دار صدر ریاست ہے اور وہ اہل العمل والعقد سے مشورہ کرنے کا پابند ہے مگر اس بات کا پابند نہیں کہ ان کی اکثریت یا ان کی مخففہ رائے پر عی

عمل کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو ”ویٹو“ کے اختیارات حاصل ہیں۔

لیکن یہ رائے اس بھل صورت میں بڑی غلط فہمیوں کی موجب ہے، کیونکہ اسے لوگ موجودہ ماحول میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ماحول ان کے سامنے نہیں ہوتا جس کے تعلامل سے یہ رائے اخذ کی گئی ہے۔ خلافت راشدہ کے ماحول میں جن لوگوں کو اہل العمل والعقد قرار دیا گیا تھا وہ جدا جدا پارٹیوں کی ٹھنڈی میں مغلظ نہ تھے۔ وہ ان پارٹیمنٹری ضابطوں سے بھی کے ہوئے نہ تھے جن سے موجودہ زمانے کی مجلس قانون سازی کسی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ مجلس شوریٰ میں پہلے سے الگ الگ اپنی پکجہ پالیساں وضع کر کے، پروگرام ہنا کر اور پارٹی میٹنگز میں فیصلے کر کے بھی نہیں آتے تھے۔ انہیں جب مخورے کے لئے بلا یا جاتا تو وہ کھلے دل کے ساتھ آ کر بیٹھتے، خلیفہ خود ان کی مجلس میں موجود ہوتا، مسئلہ پیش کیا جاتا، مخالف اور موافق ہر پہلو پر آزادانہ بحث ہوتی، پھر دونوں کے دلائل کا موازنہ کر کے خلیفہ اپنے دلائل کے ساتھ اپنی رائے بیان کرتا۔ یہ رائے بالعموم ایسی ہوتی تھی کہ پوری مجلس اسے تسلیم کر لیتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ چند لوگ اس سے تھنڈ نہ ہوتے تھے مگر اسے بالکل غلط اور باقائل تسلیم نہیں بلکہ صرف مرجوع سمجھتے اور فیصلہ ہو جانے کے بعد کم از کم عمل کے لئے اسی کو مان لیتے تھے۔ پوری خلافت راشدہ کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل العمل والعقد کی مجلس میں ایسی تفرقہ رونما ہوئی ہو کہ رائے شماری کی نوبت آئے۔ اور پوری خلافت راشدہ کی تاریخ میں صرف دو مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ خلیفہ وقت نے اہل العمل والعقد کی قریب قریب متفقہ رائے کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جیش اسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا معاملہ۔ لیکن ان دونوں معاملات میں صحابہ نے جس بناء پر خلیفہ کے فیصلے کو مانا وہ یہ نہیں تھی کہ دستور اسلامی نے خلیفہ کو ویٹو کے اختیارات دے رکھے ہیں اور دستوری طور پر وہ پاول نخواستہ اس کا فیصلہ ماننے کے لئے مجبور ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ صحابہ

کرام کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نہم و فرست اور دینی بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اس رائے کی صحت پر اتنا یقین رکھتے ہیں اور دینی مصالح کے لئے اس کو اتنی زیادہ اہمیت دے رہے ہیں، تو انہوں نے کھلے دل سے ان کی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس لے لی۔ بلکہ بعد میں ان کی اصابت رائے کو حکم مکلا سراہا اور اعتراف کیا کہ اگر ان مواقع پر ابو بکر رضی اللہ عنہ استقامت نہ دکھاتے تو اسلام ہی کا خاتمه ہو گیا تھا۔ چنانچہ مرتدین کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، جو سب سے پڑھ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کر پکے تھے، علی الاعلان کیا کہ اللہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا سینہ اس کام کے لئے کھول دیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ حق وہی ہے جس کا فیصلہ انہوں نے کیا ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام میں ویٹو کا یہ تصور دراصل کس ماحول کی نظریوں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر شوریٰ کا طرز اور اس کی روح اور اہل شوریٰ کی ذاتیت اور سیرت وہی ہو جو خلافت راشدہ کے اس نمونے میں ہم دیکھتے ہیں تو پھر اس سے بہتر کوئی طریق کار نہیں ہے جو وہاں احتیاز کیا گیا۔ اس طریق کار کو اگر ہم اس کے آخری منطقی نتائج تک لے جائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرز کی مجلس شوریٰ میں اگر صدر ریاست اور ارکان مجلس اپنی اپنی رائے پر اڑ جائیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں اپنی رائے واپس نہ لے تو استھواب عام (Referendum) کرالیا جائے، پھر جس کی رائے کو بھی رائے عام روکرے وہ مستحق ہو جائے۔ لیکن جب تک ہمارے لئے اپنے ملک میں اس روح اور اس ذاتیت اور اس طرز کی مجلس شوریٰ بنانا ممکن نہیں ہے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم انتظامیہ کو مقتدر کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند کریں۔

(۲)

## ریاست کا مقصد و جو و

اب اس مسئلے کو لے لجئے کہ اسلام وہ کون سے بنیادی مقاصد (Objectives) پیش کرتا ہے جن کے لئے ایک اسلامی ریاست کو کام کرنا چاہئے۔ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں ان مقاصد کی جو توضیح کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رَسُولًا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومُ النَّاسُ

بِالْفَطْحِ (الحمد ۲۵)

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجیے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اماری ماکہ لوگ الصاف پر قائم ہوں۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

الذين ان مكثهم في الأرض اقاموا الصلوة واتوا الزكوة وامرموا بالمعروف ونهوا عن المنكر۔ (الحج: ۳۱)

(یہ مسلمان جن کو جگ کی اجازت دی جا رہی ہے وہ لوگ ہیں) جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور حدیث میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ لِيَزْعُمُ بِالْسُّلْطَانِ مَا لَا يَزْعُمُ بِالْقُرْآنِ۔ (تفیر ابن کثیر)

اللہ حکومت کے ذریعہ سے ان چیزوں کا سرباب کرتا ہے جن کا سرباب

قرآن کے ذریعہ سے نہیں کرتا۔

یعنی جو برائیاں قرآن کی صحت اور فحاش سے نہ دور ہوں، ان کو مٹانے اور دبائے کے لئے حکومت کی طاقت و رکار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد اس اصلاحی پروگرام کو ملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لئے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام، محض قویٰ ہر حدود کی حفاظت، محض حمام کے معیار زندگی کو بلند کرنا اس کا آخری اور انتہائی مقصد نہیں ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت، ہوا سے فیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ ان بھائیوں کو فروع دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آزاد کرنا چاہتا ہے اور وہ ان برائیوں کو مٹانے اور دبائے میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

(۵)

## حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟

ان بیادی امور کی توضیح کے بعد ہمارے سامنے پانچواں سوال آتا ہے، یہ کہ جو ریاست ان بیادوں پر تغیر ہوا اس کا نظام چلانے کے لئے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائے؟ اس معاملے میں سب سے اہم مسئلہ رئیسِ ملک (Head of the State) کے تقرر کا ہے جس کو اسلام میں امام، امیر اور خلیفہ کی مختلف اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے اور اس باب میں اسلام کے ملک کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف رجوع کریں۔

### صدر ریاست کا انتخاب

جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں، ہمارے موجودہ اسلامی معاشرے کا آغاز کے میں کفر کے ماحول میں ہوا تھا اور اس ماحول سے لٹک کر اسلامی معاشرے کی ابتداء کرنے والے سیدنا محمد ﷺ تھے۔ یہ اسلامی معاشرہ جب اپنے نظم اور سیاسی خود بخاری میں ترقی کر کے ایک ایشیت بننے کی منزل پر پہنچا تو اس کے اولین رئیس بھی آنحضرت ﷺ تھے اور آپ کسی کے منتخب کردہ نہ تھے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے مأمور کئے ہوئے تھے۔

دس سال تک آپ ﷺ اس ریاست کی امارت کا فریضہ انجام دینے کے بعد رفقِ اعلیٰ سے جاتے بغیر اس کے کہ اپنی جائشی کے متعلق کوئی صریح اور قطعی ہدایت دے کر تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ کے اس سکوت سے اور قرآن مجید کے اس ارشاد سے کہ وامرهم شوونَ بینہم (مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے

سے انعام پانے ہیں) صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ نبی کے بعد رئیس ملکت کا تقرر مسلمانوں کے اپنے انتخاب پر چھوڑا گیا ہے، اور یہ انتخاب مسلمانوں کے باہمی مہورے سے ہونا چاہئے۔ ۱۔ چنانچہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر رض کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

پھر جب ان کا آخری وقت آیا تو اگرچہ ان کی رائے میں خلافت کے لئے موزوں ترین شخص حضرت عمر رض تھے، لیکن انہوں نے اپنے جانشین کو نامزد نہ کیا بلکہ اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر ان کی رائے معلوم کی، پھر حضرت عمر رض کے حق میں اپنی وصیت الٹا کرائی، پھر حالت مرض ہی میں اپنے جھرے کے دروازے سے مسلمانوں کے مجمع عام کو خطاب کر کے فرمایا:

اترضون بعن استخلف عليکم؟ فانى والله عالیوت من جهودى الرأى ولا  
ولیت ذا قرابة وان استخلف عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطیعوا  
کیا تم راضی ہو اس شخص سے جس کو میں تم پر اپنا جانشین بناوں؟ خدا کی  
تم میں نے غور و فکر کر کے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں انحصار کی  
تھی، اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب  
کو جانشین بنا�ا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

جمع سے آوازیں آئیں: سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سن اور ماٹا۔

(طبری۔ ج ۲ ص ۶۸۔ مطبع مجمعہ الاستقامۃ مصر)

۱۔ اس میں تک نہیں کہ مسلمانوں میں سے حضرات شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کی طرح امامت کا منصب بھی تو قبیلی ہے، یعنی امام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اب عملاً نبی کی ختم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک بھی ہارہوں امام کی نسبت کے بعد چونکہ منصب امامت ان کے ظہور ہانی تک موقوف ہے، اس نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی سربراہ کاری اب بہر حال کسی غیر مامور من اللہ ہی کے پر ہوتی چاہئے۔

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کا تقریبی نامزدگی سے نہیں ہوا بلکہ خلیفہ وقت نے مشورے سے ایک شخص کو تجویز کیا اور پھر مجمع عام میں اس کو پیش کر کے منظور کرایا۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دنیا سے رخصت ہونے کی باری آئی۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ کے معتقد تین رئیقوں میں سے چھ اصحاب ایسے موجود تھے جن پر خلافت کے لئے مسلمانوں کی نگاہ پر سکتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی چھ اصحاب کی ایک مجلس شوریٰ ہادی اور ان کے پردویہ کام کیا کہ پاہی مشورے سے ایک شخص کو خلیفہ تجویز کریں اور اعلان کر دیا کہ:

من تاجر منكم على غير مشورة من المسلمين فلاضرموا عندك

(الفاروق عز، لموز حسین هبکل۔ ج ۲ ص ۳۱۳)

تم میں سے ہو کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بنے اس کی گردان مار دو۔

اس مجلس نے بالآخر انتخاب کا کام حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ حوف کے پردو کیا اور انہوں نے مدینہ میں جل پھر کر عام لوگوں کی رائے معلوم کی۔ مگر مگر جا کر عورتوں تک سے پوچھا۔ مدرسون میں جا کر طلبہ تک سے دریافت کیا۔ ملکت کے مختلف حصوں کے جو لوگ حج سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جاتے ہوئے مدینے ٹھہرے تھے ان سے استھواب کیا۔ اور اس تحقیقات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امت میں سب سے زیادہ معتقد ذو شخص ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ۔ اور ان دونوں میں سے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف زیادہ لوگوں کا میلان ہے۔ اسی رائے پر آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ ہوا اور مجمع عام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا وقت پیش آیا اور امت میں سخت افراطی بپا ہو گئی۔ اس موقع پر صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان پر جمع ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ آج آپ سے زیادہ امانت کا حق دار کوئی نہیں، آپ اُس بار کو

سبھالیں۔ حضرت علیؓ نے انکار کیا، مگر وہ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ یہی حاجت ہیں تو مسجد میں چلئے۔

**فَإِنْ يَعْتَشْ لَا تَكُونُ خَفِيَاً وَلَا تَكُونُ الْأَعْنَارَ رَضَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ**

(طبری - ج ۳ - ص ۲۵)

کوئی نکھلے طور پر نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انتحاد ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ آپ مسجد نبوی ﷺ میں تعریف لے گئے اور مهاجرین و انصار جمع ہوئے اور سب کی نیسیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکثرت کی مرضی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

پھر جب حضرت علی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قاتلانہ حلہ ہوا اور ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کیا ہم آپ کے سارے ہزارزادے حضرت حسن سے بیعت کر لیں؟ اس پر انہوں نے جواب دیا وہ یہ تھا کہ:

ما أمركم ولا أنتم لكم انتقم ببصره. (طبرى - ج ٢ - ص ١٣٢)

میں نہ تم کو اس کا حکم دتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ تم لوگ خود  
امہمی طرح دیکھ سکتے ہو۔

یہ ہے رئیسِ مملکت کے تقدیر کے محاٹے میں خلافت راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجتماعی طرزِ عمل جس کی بنیاد خلافت کے باب میں نبی اکرم ﷺ کے سکوت اور تمام اجتماعی معاملات کے باب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد و امرِ ہم شوفیں ہم پر رکھی گئی تھی۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود از برداشتی امیر ہونے جانے کا حق نہیں رکھتا۔ اب کسی خاندان یا

۱۔ بعض لوگ یہ شب پیدا کرتے ہیں کہ اگر اسلام کا اصول بھی ہے تو پھر دور بادشاہی کے نامور

طبیعہ کا اس منصب پر اچارہ نہیں ہے۔ اور انتخاب کسی جرکے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کپے معلوم کی جائے، تو اس کے لئے اسلام میں کوئی خاص طریقہ کار مقرر نہیں کر دیا گیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہو کہ جموروں قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔

### باقہ حاشیہ

علماء نے زبردستی سلطنت ہو جانے والے لوگوں کی خلافت و امارت کیسے تسلیم کی؟ لیکن یہ شبہ دراصل دو مختلف مسائل کو خلاط ہٹل کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا امیر کے تقرر کا صحیح و معتبر طریقہ کیا ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کبھی کسی وجہ سے خلاط طریقے پر کوئی شخص سلطنت ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ پہلے مسئلے کا جواب تمام علمائے امت نے بالاتفاق بھی دیا ہے کہ صحیح طریقہ کار انتخاب ہے جو مسلمانوں کی رضامندی سے ہو۔ رہا درہ مسئلہ تو اس میں زیادہ سے زیادہ فرم رویہ جن بزرگوں نے اختیار کیا ہے وہ بھی اس سے آئے نہیں جاتے کہ ایسی امارت صرف نظم اور اجتماع کر کے مسلمین کی خاطر برداشت کر لئی چاہئے۔ بشرطیکہ اس طرح جبرا "سلطنت" ہونے والا امیر نظام دین کو خراب نہ کرے۔ سیالفاظ دیگر یہ لوگ اس شرط کے متعین ہونے کی صورت میں جابرانہ امارت کے خلاف بغاوت کرنا درست نہیں سمجھتے ہاکہ کہیں نظام کی جگہ بد نظمی نہ لے لے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں ان کے نزدیک جری تلا اتفاق خلافت کی کوئی صحیح صورت ہے۔ اس معاملے میں بھی بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ پھر ان احادیث کی کیا توجیہ ہے جن میں خلافت کے لئے قبیلہ زریش کو الحق ثہرا یا گیا ہے مگر اس کا جواب ہم اپنی کتاب "رسائل و سائل" میں دے چکے ہیں۔

## مجلس شوریٰ کی تفہیل

انتخاب امیر کے بعد دوسرا اہم مسئلہ اہل العمل والعقد (یعنی مجلس شوریٰ کے ارکان) کا ہے کہ وہ کیسے پھے جائیں گے اور کون ان کو پھئے گا۔ سرسری مطالعے کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ خلافت راشدہ میں چونکہ عام انتخابات (General Elections) کے ذریعہ سے ارکان شوریٰ منتخب نہیں ہوتے تھے اس لئے اسلام میں مرے سے شورے کا کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بات بالکل خلیفہ وقت کی صوابیدہ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جس سے چاہے شورہ لے۔ لیکن یہ گمان دراصل اس زمانے کی باتوں کو اس زمانے کے ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ ان کو اسی وقت کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہئے اور عملی تفصیلات کے اندر وہ اصول بھئے کی کوشش کرنی چاہئے جو ان میں مطوف رکھے گئے تھے۔

اسلام کہ معظمه میں ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا۔ تحریکوں کے مزاج کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے آگے بڑھ کر ان کو لیکر کہتے ہیں وہ لیڈر کے رفق، دست و پازو اور مشیر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں بھی ہو سابقین اولین تھے وہ بالکل ایک فطری طریقے پر نبی اکرم ﷺ کے رفق اور مشیر قرار پائے جن سے آپ ہر ایسے معاٹے میں شورہ کرتے تھے جس میں خدا کی طرف سے کوئی صریح حکم آیا ہوانہ ہوتا تھا۔ پھر جب اس تحریک میں نئے نئے آدمیوں کا اضافہ ہونے لگا اور مختلف طاقتوں سے اس کی سکھیش بڑھتی گئی تو ایسے لوگ خود بخود نمایاں ہوتے پہلے گئے جو اپنی خدمات، قربانیوں اور بصیرت و فراست کی بنا پر جماعت میں ممتاز تھے۔ ان کا انتخاب و دلوں سے نہیں بلکہ تجربات اور آزمائشوں سے ہوا تھا جو ایکشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور فطری طریق انتخاب ہے۔ اس طرح کہ چھوڑنے سے پہلے دو تم کے لوگ نبی اکرم ﷺ کی مجلس شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ایک سابقین اولین۔ دوسرے وہ آزمودہ کار اصحاب جو بعد میں جماعت کے

اندر نمایاں ہوئے۔ یہ دونوں گروہ ایسے تھے جن کو نبی اکرم ﷺ کی طرح تمام مسلمانوں کا احتماد بھی حاصل تھا۔

اس کے بعد بھرت کا اہم واقعہ پیش آیا اور اس کی ابتدائیوں ہوئی کہ ڈیڑھ دو سال پہلے مدینے کے چھڑا اثر لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کے اثر سے اوس اور خارج کے قبیلوں میں مگر مگر اسلام پہنچ کیا تھا۔ انہی لوگوں کی دعوت پر نبی اکرم ﷺ اور دوسرے مهاجرین اپنے اپنے گمراہ چھوڑ کر مدینے منتقل ہوئے اور وہاں اسلام کی ایک تحریک نے ایک سیاسی نظام اور ایک ریاست کی ٹھنڈی انتیار کی۔ اب یہ بالکل ایک قدرتی بات تھی کہ مدینے میں جن لوگوں کے اثر سے اسلام پھیلا اور پھیلا گیا وہی جدید محاشرے اور سیاسی نظام میں مقامی لیڈروں کی پوزیشن پر فائز ہوئے اور انہی کا یہ مرتبہ و مقام تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی مجلس شوریٰ میں سابقین اولین اور آزمودہ کار مهاجرین کے ساتھ ایک عیرے غفر (النصار) کی حیثیت سے شامل ہوں۔ یہ لوگ بھی فطری طریق انتخاب سے منتخب ہوئے تھے اور مسلمان قبیلوں کے ایسے معتد طبقہ تھے کہ اگر موجودہ زبانے کے طریقے پر انتخابات منعقد ہوتے تب بھی یہی لوگ منتخب ہو کر آتے۔

پھر مدنی محاشرے میں دو حکم کے لوگ اور ابھرنے شروع ہوئے۔ ایک وہ جنہوں نے آٹھو دس برس کی سیاسی، فوجی اور تبلیغی خدمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے کہ ہر اہم محاٹے میں انہی کی طرف لوگوں کی ٹکاہیں اٹھنے لگیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے علم و فہم اور دین میں نکاہت کے اعتبار سے ہاموری حاصل کی تھی کہ خوام الناس نبی اکرم ﷺ کے بعد علم دین میں انہی کو سب سے زیادہ سعیر کرنے لگئے اور خود آنحضرت ﷺ نے بھی یہ فرمایا کہ ان کو سند اعتبار عطا کی کہ قرآن فلاں شخص سے سیکھو، اور فلاں نوعیت کے سائل میں فلاں شخص کی طرف رجوع کرو۔ یہ دونوں عناصر بھی مجلس شوریٰ میں بالکل ایک فطری انتخاب سے شامل ہوتے گئے اور ان میں بھی کسی کے لئے دوٹ لینے کی حاجت

پیش نہ آئی۔ ووٹ اگر لئے بھی جاتے تو اس معاشرے میں ان کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کی لگاد احتساب پڑتی۔

اس طرح نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ میں بھی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی مشیر قرار پائی اور وہ دستوری روایات بھی صحیح ہو بھی تھیں جن کے مطابق آگے جمل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے گئے جنہوں نے اپنی خدمات اور اعلیٰ درجے کی ذہنی ملاحمتوں کے ذریعہ سے قبول عام حاصل کر کے اس مجلس میں اپنی جگہ پیدا کی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اہل الہ و الحقد (باندھنے اور کھولنے والے) کہا جاتا تھا اور جن کے مشورے کے بغیر خلفائے راشدین کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہ کرتے تھے۔ ان کی آئینی حیثیت کا صحیح اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد چد اصحاب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر خلافت قول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:

لَيْسَ ذَالِكَ أَبِيكُمْ إِنَّمَا هُوَ لِأَهْلِ الشُّورِ وَأَهْلِ بَدْرٍ فَمَنْ رَضِيَ بِهِ أَهْلُ  
الشُّورِ وَأَهْلُ بَدْرٍ فَهُوَ الظَّلِيفَةُ فَنَجِمَعُ وَنَنْظُرُ فِي هَذَا الْأَمْرِ۔

(الامامة والسياسة لابن تیمیہ، مطبعة الفتوح، مصر صفحہ ۲۱)

یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے۔ وہی خلیفہ ہو گا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل الہ و الحقد اس وقت کچھ تھیں لوگ تھے، پہلے سے اس پوزیشن پر فائز چلے آ رہے تھے اور وہی ملت کے اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے نجاذب تھے۔ لذا یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفہ وقت من مانے طریقے پر جس وقت جس کو چاہتا تھا مشورے کے لئے بلا یتہ تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقبل اہل شوریٰ یا اہل الہ و الحقد کون ہیں جو قوم کے مسائل

مہمہ کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔

خلافت راشدہ کے اس تعامل، بلکہ خود اسوہ نبوی سے جو قاعدہ کلیہ مستبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو مشورہ ہر کس دنائس سے، یا اپنی مرضی کے پختے ہوئے لوگوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے کرتا چاہئے جو عامہ مسلمین کے معتمد ہوں، جن کے اخلاص و خیر خواہی اور الحیث پر لوگ مطمئن ہوں اور حکومت کے فیصلوں میں جن کی شرکت اس امر کی ضامن ہو کہ ان فیصلوں کے نفاذ میں جمیور قوم کا دل

اے بیان ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اہل حل و عقد صرف مدینے ہی کے لوگ کیوں ہوتے تھے؟ ملک کے دوسرے حصوں سے معتمد علیہ نمائندے کیوں نہیں بلائے جاتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے دونوں انتہاء متعلق وجود و وجود تھے۔

اول یہ کہ اسلامی ریاست ایک قوی ریاست نہ تھی بلکہ اس طرح وجود میں آئی تھی کہ پہلے ایک نظریے کی تبلیغ نے لوگوں میں ذہنی و اخلاقی انقلاب برپا کیا، پھر اس انقلاب کے نتیجے میں ایک اصولی معاشرہ پیدا ہوا اور پھر اس معاشرے نے ایک اصولی ریاست کی شکل اختیار کی۔ اس قسم کی ریاست میں فطرتاً "مرکز اعتماد وہ شخص واحد تھا جس نے اس انقلاب کی بنا ڈالی اور اس کے بعد وہ لوگ اس پوری اخلاقی سوسائٹی کے اندر مرکز اعتماد بننے جو باقی انقلاب کے دست راست تھے۔ ان کی لیڈر شپ ایک فطری لیڈر شپ تھی اور ان کے سوا کوئی بھی اس سوسائٹی میں لوگوں کا معتمد علیہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کی تکمیل آزادی کے باوجود اس دور میں کبھی عرب کے کسی گوشے سے یہ آواز نہ اٹھی کہ صرف مدینے کے لوگ آخر "ہادھے اور کھولنے" کے اجارہ دار کیوں بن بیٹھے ہیں۔

دوم یہ کہ اس زمانے کے تمدنی حالات میں یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ افغانستان سے لے کر شمالی افریقہ تک پہنچی ہوئی مملکت میں عام انتخابات منعقد ہوا کرتے اور پھر مجلس شوریٰ کے معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں مملکت کے ہر حصے سے ارکان مجلس آئے کر شریک ہوا

تعاون شریک ہو گا۔ رہایہ سوال کہ عوام کے معتدلوں کیسے معلوم کئے جائیں؟ تو ظاہر ہے کہ اس چیز کے معلوم ہونے کی جو صورت آغاز اسلام کے خصوصی حالات میں تھی آج وہ صورت نہیں ہے اور اس زمانے کے تبدیلی حالات میں جو موائع موجود تھے وہ بھی آج موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم آج کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے وہ تمام ممکن اور مباح طریقہ اختیار کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ جمہور قوم کا اعتماد کرنے والوں کو حاصل ہے۔ آج کل کے اتفاقات بھی اس کے جائز طریقوں میں سے ایک ہیں، بشرطیکہ ان میں وہ ذلیل چیزوں کے استعمال نہ ہوں جنہوں نے جمہوریت کو ایک مذاق ہنا کر رکھ دیا ہے۔

### حکومت کی شکل اور نوعیت

اس کے بعد تیرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل اور نوعیت کیا ہے۔ اس باب میں جب ہم خلافت راشدہ کے دور پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امیر المؤمنین اصل وہ شخص تھا جس سے سچ و طاعت کی بیعت کی جاتی تھی۔ اور جسے بھروسے کا آدمی سمجھ کر لوگ اپنی اجتماعی زندگی کے اہم ترین معاملے، یعنی حکومت کی بانگ ڈور پردا کرتے تھے۔ اس کی حیثیت انگستان کے پادشاہ، فرانس کے صدر، برطانیہ کے وزیر اعظم، امریکہ کے صدر، اور روس کے اٹالان، سب سے مختلف تھی۔ وہ محض صدر ریاست ہی نہ تھا بلکہ اپنا رئیس الوزراء بھی آپ ہی تھا۔ وہ پارلیمنٹ میں براہ راست خود شریک ہوتا تھا اور آپ پارلیمنٹ کی صدارت بھی کرتا تھا۔ پھر وہ مباحثوں میں بھی پورا حصہ لیتا تھا اور اپنی حکومت کے سارے کاموں کی جواب دی کرتا اور اپنا حساب آپ دیتا تھا۔ اس کی پارلیمنٹ میں نہ کوئی گورنمنٹ تھی نہ اپوزیشن پارٹی۔ ساری پارلیمنٹ اس کی پارٹی تھی اگر وہ حق کے مطابق چلے اور ساری پارلیمنٹ اپوزیشن تھی اگر وہ باطل کی طرف جاتا نظر آئے۔ ہر مجبراً آزاد تھا کہ جس معاملے میں اس سے اتفاق رکھتا ہو اتفاق کرے اور جس میں اس سے اختلاف رکھتا ہو اختلاف کرے۔ خلیفہ کے اپنے

وزراء تک پارلیمنٹ میں اس کے خلاف اتکار رائے کر جاتے تھے اور پھر بھی وزارت اور صدارت میں خوب نہیں تھی۔ کسی کے مستحق ہونے کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ خلیفہ صرف پارلیمنٹ ہی کے سامنے جواب دہنا تھا بلکہ پوری قوم کے سامنے اپنے ہر کام، حتیٰ کہ اپنی شخصی زندگی کے معاملات تک میں جواب دہ تھا۔ وہ پانچوں وقتِ مسجد میں پیلک کا سامنا کرتا، ہر جمعے کو پیلک سے خطاب کرتا اور پیلک اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہر روز چلتے پھرتے اس کو پاسخی تھی اور نوک سکتی تھی۔ ہر شخص ہر وقت اس کا دامن پکڑ کر اپنا حق مانگ سکتا تھا اور ہر شخص مجمع عام میں اس سے باز پرس بھی کر سکتا تھا۔ اس کے ہاں یہ تھا کہ نہ تھا کہ حکومت سے کوئی سوال کرنا ہو تو پارلیمنٹ کا کوئی ممبر یہ نوٹس دے کر لگے بندے کے قواعد کے مطابق پوچھ سکتا ہے۔ اس کا اعلان عام تھا کہ:

لَنْ لَحْسَنْتْ فَاعْيِنُونِي وَانْ لَسَاتْ فَقَوْمُونِي ..... اَطْبِعُونِي مَا اطْعَتْ اللَّهُ  
وَرَسُولُهُ فَإِنْ عَصَيْتَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ فَلَا طَاعَةَ لَكِ عَلَيْكَمْ

(الصدق محمد حسین ہیکل صفحہ ۹۷)

اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر برارویہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو..... جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں میری اطاعت کر اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تمہارے ذمے نہیں ہے۔

یہ مفرز حکومت، جس پر موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے کسی اصطلاح کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا، اسلام کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور ہمارا آئینہ دیل یکی ہے۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں نہیں سکتا ہے جبکہ سوسائٹی اسلام کے انقلابی نظریات کے مطابق پوری طرح تیار ہو جگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو نئی سوسائٹی میں انحطاط رونما ہوا، اس کا نہنا مشکل ہو گیا۔ اب اگر ہم اس آئینہ دیل کی طرف پر پہنچا چاہئے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ابتدائے کار کے لئے اس سے چار

بنیادی اصول لے لئی اور پھر انہیں اپنے حالات و ضروریات کے مطابق عملی جامہ پہنائیں۔

ایک یہ کہ حکومت کی اصل ذمہ داری جس کے بھی پرد کی جائے وہ نہ صرف پلک کے نمائندوں کا بلکہ خود پلک کا بھی سامنا کرے اور اپنا کام نہ صرف مشورے سے انجام دے بلکہ اپنے اعمال کے لئے جواب دہ بھی ہو۔

دوسرے یہ کہ پارٹی سشم سے نجات حاصل کی جائے جو نظام حکومت کو بجا حصیتوں سے آلوہ کرتا ہے اور جس میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک جاہ پسند ٹولابر سر اقتدار آ کر پلک کے خرچ پر اپنے مستقل حماقی پیدا کر لے اور پھر لوگ خواہ کتنا ہی شور چاہیں وہ ان حماقیوں کے مل پر اپنی من مانی کرتا رہے۔

تیسرا یہ کہ نظام حکومت ایسے پیچ دار ضابطوں پر قائم نہ کیا جائے جس سے کام کرنے والے کے لئے کام کرنا اور حساب لینے والوں کے لئے حساب دینا اور خرابی کے اصل ذمہ دار کو مشخص کرنا مشکل ہو جائے۔

اور سب سے آخری مغرب سے اہم اصول یہ ہے کہ صاحب امر اور اہل شوریٰ ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کے اندر اسلام کی ہتائی ہوئی صفات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔

(۶)

## اولی الامر کے اوصاف

یہ اوصاف (Qualifications) کا سوال اسلامی نظر نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، حتیٰ کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دستور کے پلے یا نہ پلے کا سارا انحصاری اس پر ہے۔

امارت اور مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے ایک الیت تو قانونی نوعیت کی ہوتی ہے جس پر ایک عام انتخاب اور ایک صحیح اور پرکھ کر انتخاب کے لئے ایک شخص کے اہل (Eligible) ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور دوسری ایک اور حتم کی الیت بھی ہوتی ہے جس کا لحاظ کر کے اشخاص کو چھانٹنے اور تجویز کرنے اور ووٹ دینے والے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ پہلی حتم کی الیت ایک ملک کے کدوڑوں باشندوں میں سے ہر ایک میں ہوتی ہے، مگر یہ دوسری حتم کی الیت ہی ہے جو عملاً "ان میں سے چند ہی آدمیوں کو ابھار کر اوپر لا تی ہے۔ پہلی حتم کی الیت کے معیارات صرف دستور کی چند عملی و فعات (Operative Clauses) میں درج کرنے کے لئے ہوتے ہیں، لیکن یہ دوسری حتم کی الیت وہ ہے جس کے معیارات پورے دستور کی روح میں موجود ہونے چاہئیں اور ایک دستور کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جمیور کے ذہن کو تربیث دے کر صحیح انتخاب کے لئے تیار کیا جائے تاکہ وہ اپنے ہی لوگوں کو منتخب کریں جو دستور کی روح کے مطابق الیت رکھتے ہوں۔

قرآن اور حدیث ان دونوں حتم کی اہلیتوں سے بحث کرتے ہیں۔ پہلی حتم کی

المیت کے لئے انسوں نے چار معیار تھائے ہیں:

۱۔ مسلم ہونا، چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

يَا إِيَّاهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطْبِعُوا إِلَهَكُمْ وَاتْبِعُوا الرَّسُولَ وَأُولُئُلَّا امْرُكُمْ

(النساء: ۵۹)

اے ایمان لائے والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامروں۔

۲۔ مرد ہونا، چنانچہ قرآن کہتا ہے:

الرِّجَالُ قَوْمٌ عَلَى النِّسَاءِ۔ (النساء: ۳۲)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

اور نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

لَنْ يَفْلُحَ قَوْمٌ وَلَوْلَا أَمْرُهُمْ أَمْرَاهُدْ (بخاری)

وہ قوم ہرگز قلاع نہ پائے گی جس نے اپنی زمام کرا کیا ایک عورت کے سپرد کی ہو۔

۳۔ عاقل و بالغ ہونا، چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ فِيهَا

اور اپنے مال چنپیں اللہ نے تمہارے لئے ہستی کا سماڑا بنا�ا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔

۴۔ دارالاسلام کا باشندہ ہونا۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَهَا جِرَرُوا مَالَكُمْ مِنْ وَلَيْتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ عَلَى هُنَّا يَهَا جِرَرُوا۔

(الأنفال: ۲۷)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہ آگئے، تمہارا ان کی ولایت میں کوئی حصہ نہیں جب تک کہ ہجرت نہ کریں۔

یہ ہیں وہ چار قانونی صفات جن کے لحاظ سے ہر شخص امارت اور رکنیت

شوری کا اہل ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح کے بے شمار قانونی اہل احصاں میں سے کس لوگوں کو ہمیں ان مناصب کے لئے چھنا چاہئے اور کس کو نہ چھنا چاہئے، اس سوال کا واضح جواب ہمیں قرآن اور حدیث میں یہ ملتا ہے:

**انَّ اللَّهَ يَا مِرْكَمْ أَنْ تَؤْذُوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهِنَّ** (النساء: ٥٨)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے پرداز کرو۔

**إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتِقَاكُمْ** (الحجرات: ١٣)

تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

**قَالَ اللَّهُ أَصْطَفَهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بُسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجَسْمِ**

(البقرہ: ٢٣٧)

نبی نے کہا کہ اللہ نے حکمرانی کے لئے اس کو (یعنی طالوت کی) تم پر ترجیح دی ہے اور اس کو علم اور جسم میں فراوانی عطا کی ہے۔

**وَلَا تَنْطَعِ مِنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هُوَ وَكَانَ أَمْرُهُ فَرِطًا**

(الکھف: ٢٨)

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

**مِنْ وَقْرِ صَاحِبِ بَدْعَةٍ فَقَدْ أَعْلَمُ عَلَى هُدُمِ الْاسْلَامِ** (الیسقی)

جس نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی اس نے اسلام کو مہدم کرنے میں مدد دی۔

**إِنَّا وَاللَّهِ لَا نُولِّ عَلَى عَمَلِنَا هَذَا الْحَدَادِ سَالِهُ لَوْ حَرَصَ عَلَيْهِ**

(بخاری و مسلم)

خدایم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرئے

جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حصہ ہو۔

ان لخوان کم عن دنامن طلبہ (ابوداؤد)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس کا طالب ہو۔

ان اوصاف میں سے بعض کو تو ہم پاسانی اپنے دستور کے عملی دفعات میں رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ طالب منصب کو انتخاب کے لئے نا اہل قرار دیا جائے۔ رہے دوسرے اوصاف جن کے لئے کوئی قانونی حد متعین نہیں کی جا سکتی، تو ان کو ہمارے دستور کی اصولی ہدایات میں شامل ہونا چاہئے اور ناقص انتخابات کے فرائض میں یہ بات داخل ہونی چاہئے کہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر عوام کو ان صفات سے باخبر کرنے کی کوشش کرے جو اسلام میں اولی الامر کے لئے مطلوب ہیں۔

(۷)

## شریت اور اس کی بنیادیں

اب شریت کے مسئلے کو لجھئے۔ اسلام چونکہ ایک نظام نظر و عمل ہے اور اسی نظام کی بنیاد پر وہ ایک ریاست قائم کرتا ہے، اس لئے وہ اپنی ریاست میں شریت کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ پھر چونکہ راست بازی و حق کوئی اسلام کی اصل روح ہے، اس لئے وہ بغیر کسی مکروہ فریب کے صاف صاف شریت کی، اس تقسیم کو بیان بھی کر دیتا ہے، دنیا کو دھوکا دینے کے لئے یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکے زبان سے اپنے سب شریوں کو یکساں قرار دے اور محل میں ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرے بلکہ ان کے ایک غضر کو انسانی حقوق تک دینے میں بے انصافی سے کام لے، جیسا کہ امریکہ میں جیشوں کا اور روس میں فیراشٹراکیوں کا اور تھام دنیا کی لادینی جموروں میں قوی اقلیتوں کا حال ہے۔

شریت کی دو قسمیں جو اسلام نے کی ہیں، یہ ہیں:

ایک، مسلم۔

دوسرے، ذمی۔

۱۔ مسلم شریوں کے باب میں قرآن کتاب ہے کہ:

انَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهُدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
وَالَّذِينَ أَوْلَوْا وَنَصَرُوا أَولَئِكَ مَعْضُهُمْ أَوْلَياءُ بَعْضٍ طَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ  
يَهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَيْتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّى يَهَاجِرُوا۔ (الأنفال: ۷۲)

جو لوگ ایمان لائے اور جنوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے راہ

خدا میں جماد کیا اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دل ہیں اور جو لوگ ایمان لائے مگر بھرت کر کے (دارالاسلام میں) نہ آئے، تمہارے لئے ان کی ولایت میں سے کچھ نہیں ہے جب تک کہ وہ بھرت نہ کریں۔

اس آئت میں شریعت کی دو بنیادیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ایمان، دوسرے دارالاسلام کی رعایا ہونا یا بن جانا۔ اگر کوئی شخص ایمان رکھتا ہو، مگر دارا لکفر کی تابیعت ترک کر کے (جسے لفظ بھرت سے تعبیر کیا گیا ہے) دارالاسلام میں نہ آ بے، تو وہ دارالاسلام کا شری نہیں ہے۔ اس کے بر عکس تمام ایسے اہل ایمان جو دارالاسلام کے باشندے ہوں، قطع نظر اس سے کہ وہ دارالاسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں یا کسی دارا لکفر سے بھرت کر کے آئے ہوں۔<sup>۱</sup> دارالاسلام کے یکسان شری اور ایک دوسرے کے دلی (حایی و مددگار) ہیں۔

ان مسلم شریوں پر اسلام نے اپنے پورے نظام کے اٹھانے کی ذمہ داری ڈالی ہے، کیونکہ وہی اصولاً اس نظام کو حق مانتے ہیں۔ ان پر وہ اپنا پورا قانون نافذ کرتا ہے۔ ان کو اپنے تمام مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی احکام کا پابند کرتا ہے۔ ان کے

بھرت کر کے آئنے والوں کے معاملے میں ایک احتیاطی تدبیر قرآن میں یہ تائی گئی ہے کہ ان کو "امتحان" (Examine) کر کے لیا جائے (ملاحظہ ہو سورہ متحہ رکوع ۲) یہ تدبیر اگرچہ صاحبو عورتوں کے معاملے میں بیان کی گئی ہے، لیکن اس سے ایک عام اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آئنے والے ایک مدعا بھرت کو دارالاسلام میں قول کرنے سے پہلے اس کے راقی مسلم اور صاحبو ہونے کا اطمینان کر لیا جائے تاکہ بھرت کے بھائے کچھ دوسرا نیت رکھنے والے لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اگرچہ کسی شخص کے حقیقی ایمان کا حال سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ظاہری تحقیقات سے جماں تک جانشی پڑتاں کی جا سکتی ہو کر لئی چاہئے۔

ذے اپنے سارے واجبات و فرائض غائب کرتا ہے۔ ان سے اپنی ریاست کی دفاعت کے لئے ہر قرآنی کام مطالبہ کرتا ہے۔ اور بھر اُنہی کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ اس ریاست کے اولی الامر کا انتخاب کریں، اس کو چلانے والی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) میں شریک ہوں، اور اس کے کلیدی مناصب پر مقرر کئے جائیں تاکہ اس اصولی ریاست کی پالیسی نجیک اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق چل سکے۔ اس قادرے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ محمد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں ایک مثال بھی اس امر کی نہیں مل سکتی کہ کسی ذمی کو مجلس شوریٰ کا رکن، یا کسی علاقے کا گورنر یا کسی کا قاضی یا کسی شعبہ حکومت کا وزیر یا ناظم یا فوج کا کمانڈر بنا لایا گیا ہو یا خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا ہو۔ حالانکہ ذمی خود نبی اکرم ﷺ کے عہد میں موجود تھے اور خلافت راشدہ کے دور میں تو ان کی آبادی کروڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اگر فی الواقع ان امور میں حصہ لیتا ان کا حق ہوتا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ کا نبی ان کی حق تحقیق کیسے کر سکتا تھا اور نبی کے برادر راست تربیت یافتہ لوگ مسلسل ۳۰ برس اس حق کو ادا کرنے سے کس طرح باز رہ سکتے تھے۔

۲- ذمی شریوں سے مراد وہ تمام غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کے حدود میں رہ کر اس کی اطاعت و وفاداری کا اقرار کریں، قطع نظر اس سے کہ وہ دارالاسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا باہر سے آ کر ذمی بُنے کی درخواست کریں۔ اس طرح کے شریوں کو اسلام ان کے ذہب اور کلگر اور پر عل لاء کے تحفظ اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ان پر صرف اپنے ملکی قوانین نافذ کرتا ہے، ان کو ملکی قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے حقوق دیتا ہے، ان کے لئے کلیدی مناصب کے سوا ہر قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھلے رکھتا ہے، ان کو شری آزادیوں میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک کرتا ہے، ان کے ساتھ معاشی معاملات میں مسلمانوں سے الگ کوئی امتیازی سلوک رد ا نہیں رکھتا اور حملت کے دفاع کی ذمہ داری سے انہیں مستثنی کر کے اس کا پورا بار صرف مسلمانوں پر ڈالنا ہے۔

ان دو قسم کی شریعتوں پر اور ان کی الگ الگ چیزیتوں پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ پہلے اس سلوک پر ایک نگاہ ڈال لے جو دنیا کی دوسری اصولی ریاستیں اپنے اصول کے نہ ماننے والوں سے اور قومی ریاستیں اپنے حدود میں رہنے والی قومی اقیتوں سے کر رہی ہیں درحقیقت یہ بات پورے چینچ کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایک ریاست کے اندر اس کی بنیادوں سے مختلف بنیاد وجود رکھنے والوں کی موجودگی جو پیچیدگی پیدا کرتی ہے اس کو اسلام سے زیادہ انصاف، رواداری اور فیاضی کے ساتھ کسی دوسرے نظام نے حل نہیں کیا ہے۔ دوسروں نے اس پیچیدگی کو زیادہ تر دوسری طریقوں سے حل کیا ہے یا تو انہیں مٹا دینے کی کوشش کی ہے یا شور بنا کر رکھا ہے۔ اسلام اس کے بجائے یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انصاف کے ساتھ اپنے اصول کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک حد قائم کر دیتا ہے۔ جو ماننے والے ہیں ان کو پوری طرح اپنے اصولوں کا پابند کرتا ہے اور جو ان اصولوں کے مطابق ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان پر ڈال دیتا ہے اور جو ان اصولوں کو قبول نہیں کرتے ان کو صرف اسی حد تک پابند کرتا ہے جو ملک کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے اور انہیں ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری سے بے کدوش کرنے کے بعد ان کے تمام تمدنی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

(۸)

## حقوق شریعت۔

اس کے بعد مجھے بتانا ہے کہ اسلام میں شریوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کیا قرار دیئے گئے ہیں۔

شریوں کا اولین حق اسلام میں یہ ہے کہ ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے اور جائز قانونی وجہ کے سوا اور کسی وجہ سے ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ اس چیز کو نبی اکرم ﷺ نے بکثرت احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے جبکہ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنا وہ مشهور خطبہ دیا تھا جس میں اسلامی نظام زندگی کے قواعد بیان فرمائے تھے۔ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

اندادکم و اموالکم و اعراضکم حرام كحرمة يومكم هذل۔

تماری جانیں اور تمارے مال اور تماری آبرو کیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے اس دن کی حرمت ہے۔

اس حرمت میں استثناء صرف ایک ہے اور اسے نبی اکرم ﷺ ایک اور حدیث میں الابحق الاسلام کے الفاظ سے ادا فرماتے ہیں، یعنی اسلام کے قانون کی رو سے اگر کسی شخص پر جان یا مال یا آبرو کا کوئی حق واجب ہوتا ہو تو وہ اس سے قانون کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

دوسرا اہم حق مخصوصی آزادی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقے پر اس کا جرم ثابت کئے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہیں کی جاسکتی۔ ابو داؤد میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ مدینے میں کچھ لوگ

شہر کی بنا پر گرفتار کئے گئے تھے۔ ایک محلی نے عین خطبہ کے دوبار میں اٹھ کر نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ میرے ہمایوں کو کس صورت میں پکڑا گیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ ان کے اس سوال کو سن کر سکوت فرمایا تاکہ کوتوال شر اگر گرفتاری کے لئے کوئی معقول وجہ رکھتا ہے تو اٹھ کر بیان کرے۔ لیکن جب تیری مرتبہ ان صحابی نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ خلوا لله جیرانہ<sup>۱</sup> (اس کے ہمایوں کو رہا کر دو۔) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک کسی شخص پر ایک متعین الزام لگا کہ اس کو ثابت نہ کرو یا جائے اسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ امام خطاوی اپنی معالم السن میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں جس دو ہی قسم کا ہے۔ ایک جس محتوبت، یعنی یہ کہ عدالت سے سزا پا کر کوئی شخص قید کیا جائے، دوسرے جس استظہار، یعنی طوم کو بغرض تفتیش روک رکھنا۔ اس کے سوا جس کی کوئی صورت اسلام میں نہیں ہے۔<sup>۲</sup> میکی بات امام ابو یوسف محدث نے بھی اپنی کتاب الخراج میں لکھی ہے کہ ”کسی شخص کو محض تہمت کی بنا پر قید نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو مجرد الزام پر قید نہیں کرو یا کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ مدعا اور ردعا علیہ عدالت میں حاضر ہوں مدعا اپنا ثبوت پیش کرے اور اگر وہ اپنا الزام ثابت نہ کر سکے تو ردعا علیہ کو چھوڑ دیا جائے۔“<sup>۳</sup> حضرت عمر رضوی نے بھی ایک مقدمے کا نیمہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ لا یوسر رجل فی الاسلام بغير عدل۔<sup>۴</sup> تیرا اہم حق رائے اور ملک کی آزادی کا ہے۔ اس باب میں اسلامی قانون

<sup>۱</sup> ابو داؤد۔ کتاب القضاۃ۔

<sup>۲</sup> معالم السن، کتاب القضاۃ۔

<sup>۳</sup> کتاب الخراج صفحہ ۱۰۔

<sup>۴</sup> موطا، باب شرط الشاہد۔

کی سب سے بہتر وضاحت حضرت علی ہٹھنے کی ہے۔ ان کے زمانے میں خارج کا گروہ پیدا ہوا تھا جو آج کل کے اہار کسٹ اور نہلٹ (Nehilist) گروہوں سے ملتا جلتا تھا۔ حضرت علی ہٹھ کے زمانے میں وہ اعلانیہ ایٹیٹ کے وجود کی نفی کرتے تھے اور بزور ششیر اس کو مٹانے پر تھے ہوئے تھے۔ حضرت علی ہٹھ نے ان کو پیغام بھیجا:

کونواحیث شنتم و بیننا و بینکم ان لا تسفو و اسعا ولا تقطعوا رسیلا ولا  
تظلموا الحدا۔ (مثل الاوطار۔ ج ۷۔ ص ۱۳۹)

تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہنی نہ اختیار کرو۔ اور ظلم سے باز رہو۔  
ایک دوسرے موقع پر حضرت علی ہٹھ نے ان کو پیغام دیا کہ:  
لأنبذاكم بقتال مالم تحد ثوا فسد

(مثل الاوطار۔ ج ۷۔ ص ۱۳۳)

جب تک تم فساد نہ کو گے ہم تمہارے خلاف لاوی کی اہماد نہ کریں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گروہ خیالات جو چاہے رکھے اور پر امن طریقے سے جس طرح چاہے اپنے خیالات کا انکھار کرے، اسلامی علکت اس کو نہ روکے گی، البتہ اگر وہ اپنے خیالات زبردستی (By violent Means) مسلو کرنے اور نظام علکی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ایک اور حق جس پر اسلام میں بہت زور دیا گیا ہے یہ ہے کہ ایٹیٹ اپنے حدود میں کسی شری کو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے دے۔ اسی غرض کے لئے اسلام میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ فرمائے ہیں کہ:

تو خذ من اغنىائهم فتربى على فقراتهم۔ (بخاری و مسلم)  
 ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے عاجوں میں تقسیم کر دی  
 جائے گی۔

پھر ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ یہ اصول میان فرماتے ہیں کہ:  
 السلطان ولی من لا ولی له  
 حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی

اور ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:  
 من ترک کلاغا لینا۔ (بخاری و مسلم)  
 جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً) قرض یا بے سارا  
 کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

اس معاملے میں اسلام نے ذی شریوں اور مسلم شریوں کے درمیان کوئی فرق  
نہیں کیا ہے۔ وہ مسلمان کی طرح ذی کو بھی اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ایشیت  
اس کو بھوکا نہیں اور پے شکانا نہ رہنے دے گا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک  
ذی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپؓ نے فوراً "اس کا جزیہ معاف کر کے اس کا وغیرہ  
مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا:

وَاللَّهُ مَا أَنْصَفَنَا إِنَّا كُلُّنَا شَيْبٌ ثُمَّ نَخْذِلُهُ عَنْ دَارِ الْهُرْمَ

(كتاب المخرج لابن يوسف - ص ٢٧)

خدا کی حتم ہم نے اس سے انصاف نہ کیا اگر جوانی میں اس سے قائدہ  
انٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حضرت خالد بن سعيد نے حیرہ کے فیروز مسلموں کو جو وثیقہ لکھ کر دیا تھا اس میں یہ صراحت تھی کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مجلس ہو جائے گا اس سے جزیرہ وصول کرنے کے بعد مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنپے کی کفالت کی جائے گی۔ (کتاب الخراج۔ ص ۸۵)

(۹)

## شریوں پر حکومت کے حقوق

ان حقوق کے مقابلے میں شریوں پر ریاست کے جو حقوق عامد ہوتے ہیں ان میں سے پہلا حق اطاعت کا ہے جس کے لئے اسلام میں سمع و طاعت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق یہ صراحت فرمائی ہے کہ *السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمحكره* (سننا اور ماننا پڑے گا، ٹھی اور فراغی اور خونگواری اور ناخونگواری میں) یعنی خواہ کوئی حکم آؤ گو اور اہو یا ناگوار اور خواہ کوئی شخص اس کو پاسانی بجا لے سکے یا دشواری سے بہرحال اسے اطاعت کرنی پڑے گی۔

اسلامی حکومت کا دو برا اہم حق اس کے شریوں پر یہ ہے کہ وہ اس کے وفادار اور خیر خواہ رہیں۔ قرآن اور حدیث میں اس کے لئے نص کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں (Loyalty) اور (Allegiance) سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا تفاصیل یہ ہے کہ ایک آدمی پچے دل سے اپنی حکومت کی بھلائی ہٹا ہے۔ اس کو نقصان پہنچانے والی کسی چیز کو گوارانہ کرے اور اس کی فلاج و بہود سے قبھی وابغی رکھے۔

لیکن نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسلام میں شریوں پر یہ فرض عامد کیا جیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں اور اس کے لئے کسی جانی و مالی قریانی میں دریغ نہ کریں۔ حتیٰ کہ اگر دارالاسلام کو کوئی خطرہ پیش آجائے تو قرآن مجید صاف الفاظ میں اس شخص کو متفاق قرار دیتا ہے جو قدرت رکھنے کے باوجود دارالاسلام کی مدافعت میں جان و مال کی قریانی سے دریغ کرے۔

حضرات! یہ ہیں اس حکومت کے خدوخال جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے

ہیں۔ اس طرز کی حکومت کو آپ موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے جس نام سے  
چاہیں یاد کریں۔ آپ کا جی چاہے اسے سیکور کرنے، ذمہ دار کرنے کرنے یا تھیو کر بیک،  
ہمیں کسی اصطلاح پر اصرار نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز پر اصرار ہے وہ صرف یہ ہے  
کہ جس اسلام کے ماننے کا ہم دعویٰ کرتے ہیں ہمارا نظام زندگی اور نظام حکومت  
اسی کے مطابق ہوئے اور مقرر کئے ہوئے اصولوں پر قائم ہو۔

---

## باب ۸

## اسلامی دستور کی بنیادیں

- حاکیت الہی
- مقام رسالت
- تصور خلافت
- اصول مشاورت
- اصول انتخاب
- عورتوں کے مناصب
- حکومت کا مقصد
- اولی الامر اور اصول اطاعت
- بنیادی حقوق اور اجتماعی عدل
- فلاح عامہ

یہ مقابلہ ۱۹۵۲ء کے او اخ میں پرو گلم کیا گیا تھا۔ اس وقت ایک مشور دکیل اور صاحب گلم نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن سے کسی دستور کا غاکہ نہیں ملتا۔ اس پر خاصی بحث رہی۔ مولانا مودودی صاحب نے اس زمانے میں یہ مضمون لکھا تھا جس میں دستور کے ایک ایک مسئلہ کو لے کر قرآن و حدیث میں اس کی بنیادوں کی شامدی فرمائی ہے۔

مرتب

## اسلامی دستور کی نیا دس

اس وقت جب کہ ملک کے دستور کی ترتیب آخری عراحت میں ہے، اہل علم کا فرض ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو ایک مجمع اسلامی دستور مرتباً کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ اس سلطے میں اپنی حد استظامت تک جو کچھ خدمت ہم الجام دے سکتے تھے رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں تمام مسلم فرقوں کے نمائندہ علماء نے بھی اسلامی ریاست کے ۲۲ نیا دی اصول بالاتفاق مرتب کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ مگر کچھ لوگ ہر اس کو علیش میں لگئے ہوئے ہیں کہ ایک طرف مسلم عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اور دوسری طرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ نظم نہیں میں جلا کریں۔ چنانچہ ان کی طرف سے بار بار یہ خیال مختلف الفاظ میں دہرا دیا جا رہا ہے کہ قرآن میں دستور کے لئے کوئی رہنمائی نہیں کی گئی ہے اور اسلام کسی خاص طرز کی حکومت کا تقاضا نہیں کرتا اور "اسلامی دستور" سے سے کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ ان گمراہ کن باقیوں کے پیچے دلائل کچھ بھی نہیں ہیں۔ مگر زوال علم کے اس دور میں ذہنی پراندگی پیدا کرنے کے لئے پیشہ شور و شب اچھا خاصا موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک مختصر مضمون میں کتاب و سنت کی ان تمام تصریحات کو جمع کر دیا جائے جو دستوری احکام پر مشتمل ہیں، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آج تک علماء جن اصولوں کو اسلام کے دستوری اصولوں کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں ان کے اصل مانع کیا ہیں۔

اور اس کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے ارکان پر بھی خدا کی جنت تمام ہو جائے اور وہ یہ عذر بھی پیش نہ کر سکیں کہ ہمیں خدا اور رسول ﷺ کے احکام بتائے نہیں گئے تھے۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ اس میں ہم نہردار ایک ایک دستوری مسئلے کے متعلق آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ درج کریں گے اور پھر ساتھ یہ بھی بتاتے جائیں گے کہ ان سے کیا احکام نکلتے ہیں۔

---

(۱)

## حاکیت الٰہی

لَنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ طَوْ اَمْرُ الْاَتِّيَاهُ طَوْ ذَاكُ الدِّينُ الْقِيمُ۔

(یوسف: ۳۰)

حکم نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لئے، اس کا فرمان ہے کہ تم نہ بندگی کرو  
مگر صرف اس کی، نبی صحیح دین ہے۔

یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرمانروائی کا حق،  
(بالغاظ دیگر "حاکیت") اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ یہاں کوئی لفظ یا قرینة ایسا  
موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس حاکیت کو محض "کائناتی حاکیت"  
(Universal Sovereignty) کے مفہوم میں مقید کر دیا جائے۔ اللہ کی یہ  
حاکیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی و قانونی بھی ہے اور اخلاقی و اعتقادی  
بھی۔ اور خود قرآن مجید میں ان تمام اقسام کی حاکیتوں کے اللہ تعالیٰ کے لئے  
مخصوص ہونے کی واضح دلیلیں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
صرف رب الناس اور الہ الناس ہی نہیں ہے بلکہ ملک الناس بھی ہے:  
**قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ طَمَلْكُ النَّاسِ إِلَهُ النَّاسِ۔**

(النّاس: ۱-۳)

کو اے محمد ﷺ کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے  
پادشاہ اور انسانوں کے معبود کی۔

وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ملک کا مالک ہے اور پادشاہی میں کوئی اس کا شریک

نہیں ہے۔

قُلْ اللَّهُمَّ مَا لَكَ الْمُلْكُ تَوْقِي الْمُلْكَ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزَعُ الْمُلْكُ مِنْ تَشَاءُ۔

(آل عمران: ۲۶)

کو، خدا یا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے  
چھین لے۔

لَمْ يَكُنْ لِهِ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ۔ (بُنی اسرائیل: ۳۳)

باوشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

پھر وہ صاف صاف کہتا ہے کہ امر کا حق صرف اللہ کو ہے اس لئے کہ پیدا  
کرنے والا وہی ہے۔

إِلَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ۔ (الاعراف: ۵۳)

خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ محض کائناتی حاکیت نہیں بلکہ صریحاً "سیاسی حاکیت" ہے اور اسی  
نام پر قرآن قانونی حاکیت کو بھی اللہ کے لئے مخصوص کرتا ہے۔

اتَّبِعُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِيْكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أُولَيَّاءُ۔ (اعراف: ۳)

پیروی کرو اس جیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل  
کی گئی ہے اور نہ پیروی کرو اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا نَزَّلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (المائدہ: ۳۳)

اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے  
وہی کافر ہیں۔

اللہ کی سیاسی اور قانونی حاکیت کا یہ تصور اسلام کے اولین بنیادی اصولوں میں  
سے ہے اور شروع سے آج تک تمام فقہائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ حکم دینے کا  
حق اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ چنانچہ علامہ آمدی اصول فقہ کی مشورہ کتاب  
الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله ولا حكم الا مل حكم به  
 جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور حکم بس وہ ہے جو اللہ نے  
 دیا ہے۔

اور شیخ محمد خضری اپنی اصول القوۃ میں اس کو جمیع اہل اسلام کا متفق عقیدہ  
 قرار دیتے ہیں۔

لَنْ يَحْكُمْ هُوَ بِخُطُبِ اللَّهِ فَلَا حُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ وَهَذِهِ قُضْيَةٌ أَتَفَقَ عَلَيْهَا  
 الْمُسْلِمُونَ قَاطِعَةً

در حقیقت "حکم" اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں۔ پس حکم دینے کا حق اللہ کے  
 سوا کسی کو نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق  
 ہیں۔

پس کوئی اسلامی دستور اس کے بغیر نہیں بن سکتا کہ اس میں سب سے پہلے اللہ  
 تعالیٰ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اور بالفاظ صريح یہ لکھا جائے کہ  
 یہ رہاست اللہ کی مطیع ہے، اس کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتی ہے اور اس کے احکام کو  
 واجب العمل مانتی ہے۔

(۲)

## مقام رسالت

انہیاء علیم السلام بالعوم نور محمد ﷺ بالخصوص اللہ تعالیٰ کی اس سیاسی اور قانونی حاکیت کے مظہر ہیں۔ یعنی اللہ کی اس حاکیت کا نفاذ انسانوں میں جس واسطے سے ہوتا ہے وہ واسطہ اللہ کے غیر ہیں۔ اس لئے ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے طریقے کی بحروں اور ان کے فیصلوں کو بے چون و چڑا مانتا ہر اس فرد اور گروہ اور قوم کے لئے لازم ہے جو اللہ کی اس حاکیت کو تسلیم کرے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں ہار پار پوری صراحت کے ساتھ عیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

من يطع الرسول فقد اطاع الله (الناء: ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

و ما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بهذن الله (الناء: ۶۳)

ہم نے جو رسول بھی بھجا ہے اسی لئے بھجا ہے کہ اللہ کے اذن کی ہنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

إِنَّا نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا لَدُكَ اللَّهُ

(الناء: ۱۰۵)

اے محمد ﷺ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو جو اللہ نے خمیں دکھائی ہے۔

وَمَا تِكْمِلُ الرَّسُولُ فَخَلَوْهُ وَمَا نَهَمُ عَنْهُ فَلَمْ تَهُوا - (الْحُشْرُ: ٧)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يَوْمَنُ حَتَّىٰ يَحْكُمُوكُ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي  
أَنفُسِهِمْ حِرْجًا مَا قَضَيْتُ وَيَسِّلُمُوا تَسْلِيمًا - (النَّاسَاءُ: ٦٥)

ہیں نہیں، تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اختلاف میں تجوہ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں کوئی ٹھنگی تک نہ محسوس کریں اور سربر تعلیم کر لیں۔

یہ ایک اسلامی ریاست کے دستور کی دوسری بنیاد ہے۔ اس میں اللہ کی حاکیت کے اقرار کے بعد دوسرا اقرار یہ ہونا چاہئے کہ اس ریاست میں کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت ثابتہ کو بھی مأخذ قانون کی حیثیت حاصل ہو گی اور اس کی انظامیت، مقتضیہ اور عدالتیہ میں کسی کو بھی سنت کے خلاف احکام دینے، قانون بنانے اور فیصلے کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔

(۳)

## تصویر خلافت

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ أَمْنَوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيُسْتَخْلَفُوهُمْ كَمَا سَخَّفُ  
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں (مومنین صالحین) کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت دو اہم دستوری نکات کی تصریح کرتی ہے اول یہ کہ ایک اسلامی ریاست کا صحیح مقام "خلافت" ہے نہ کہ "حاکیت"۔ دوم یہ کہ ایک اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری امت مسلمہ اس کی حامل ہوتی ہے جسے اللہ نے آزاد ریاست عطا کی ہو۔

پہلے نکتے کی تصریح یہ ہے کہ حاکیت اپنی عین حقیت ہی کے اعتبار سے اس امر کی متفاضی ہے کہ صاحب حاکیت کی اپنی ذات سے خارج کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے اختیارات کو محدود کرتی ہو اور اس کو خود اس کے اپنے بناۓ ہوئے قوانین و ضوابط کے سوا کچھ اور پر سے مسلط کئے ہوئے قوانین و ضوابط کا پابند بناتی ہو۔ اب اگر ایک ریاست پہلے ہی قدم پر یہ مان لے کہ خدا اور رسول ﷺ کا

---

اس کی تصریح حصہ اول کے مضامین میں گزر چکی ہے۔

حکم اس کے لئے بالآخر قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف نہ اس کی منتظریہ کام کر سکتی ہے، نہ اس کی مقتضیہ کوئی قانون بنا سکتی ہے اور نہ اس کی عدیلیہ کوئی فحیلہ کر سکتی ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دہ خدا اور رسول ﷺ کے مقابلے میں حاکیت کے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہے اور اس نے حکمرانی میں دراصل خدا اور رسول ﷺ کے ایکجٹ (خلیفہ) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس صورت میں اس کے لئے صحیح اصطلاح "حاکیت" نہیں بلکہ "خلاف" ہی ہو سکتی ہے، ورنہ اس حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے لئے حاکیت کا لفظ استعمال کرنا محسن ایک تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔ البتہ اگر وہ اپنی خود عماری کو خدا کے حکم اور رسول ﷺ کی سنت کے اتباع سے متعینہ کرے تو بلاشبہ اس کی صحیح پوزیشن "حاکیت" ہی کی ہو گی، مگر اس صورت میں اس کے لئے "اسلامی ریاست" کی اصطلاح استعمال کرنا تناقض فی الاصطلاح ہو گا۔

دوسرے کہتے کی تعریف یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا بھیت مجموعی حال خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جموریت کی بنارکمی گئی ہے۔ جس طرح غیر اسلامی جموریت کی بنیاد اجتماعی حاکیت (Popular Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، تھیک اسی طرح اسلامی جموریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (Popular Vicegerency) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس قام میں حاکیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہاں اقدار خدا کا عطیہ ہے اور اس عطیے کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خلافت کا یہ محدود اقدار، قرآن کی مذکورہ بالآخر تعریف کی رو سے، کسی ایک مغض یا طبقے کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من جیٹ الجماعت سونپا گیا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے، ان کے مشورے سے کام کرے اور اسی وقت تک حکمران رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔ اسی بناء پر

حضرت ابو بکر رضوی نے "خلیفۃ اللہ" کمالانے سے انکار کیا تھا کیونکہ خلافت دراصل امت مسلمہ کو سونپی گئی تھی نہ کہ براد راست ان کو ان کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیارات خلافت ان کے پرد کر دیئے تھے۔

ان دونوں نکات کو طوڑ رکھ کر اسلامی ریاست کا دستور ایسا بنایا جانا چاہئے کہ جو حاکیت کے دعوے ہے خالی ہو اور جس میں صریح طور پر ریاست کی حیثیت خلافت نمایاں نظر آتی ہو۔

---

(۳)

## اصول مشاورت

اجتمائی خلافت کے نہ کورہ پالا تقاضے کو قرآن ان الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:

وامرهم شوریٰ بینہم۔ (الشوری: ۳۸)

اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔

اس آیت میں اسلامی نظام زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیان خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحواۓ کلام کے لفاظ سے حکم بھی ہے اور اسی بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا منوع ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے حضرت علی رضوی سے یہ روایت لقل کی ہے کہ:

قلت يا رسول الله الامر ينزل بنا بعدك لم ينزل فيه قرآن ولم يسمع  
منك فيه شىء قال اجمعوا العابد من اهلى واجعلوه بينكم شوري ولا  
تقضوا برأ واحد۔ (روح المعانی)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آ جائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اتراء ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو۔

یعنی ایسے لوگوں کو جو اللہ کی بندگی کرنے والے ہوں، اس کے مقابلے میں خود عماری و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے والے نہ ہوں۔

اور اسے آپس کے مشورے کیلئے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

بہر اس شوری کی اصل روح کو نبی اکرم ﷺ ان الفاظ میں میان فرماتے ہیں:

من اشار علی الْخَيْرِ بِاَمْرِ يَعْلَمُ اَنَّ الرِّشْدَ فِي غَيْرِهِ فَقَدْ خَانَهُ (ابوداؤ)

جس نے اپنے بھائی کو کسی الحکم ساری دنیا کے متعلق وہ خود جانتا ہوا کہ صحیح بات دوسری ہے، تو اس نے دراصل اس کے ساتھ خیانت کی۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ نہیں ہے اور اس میں شوری کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لئے ہیں اور بیشہ کے لئے ہیں۔ اگر شوری کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوری براہ راست تمام لوگوں سے ہو یا لوگوں کے نمائندوں سے؟ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مجلست کیا ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب ایکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لئے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوری ایک ایوان ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سماں اور ہر تدوں کے لئے کیساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لئے ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو منوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً "اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں:

۱۔ مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہئے۔ یہ چنگ ملوکیت کی جذبات دینتی ہے۔ اس لئے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے

تو رئیس حکومت کا ذریعہ مسلح ہو چانا کیسے چاہیز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز دیکھنے  
شپ کو بھی منوع الحرامتی ہے، کیونکہ دیکھنے شہر کے معنی استبداد کے ہیں اور  
استبداد شوریٰ کی خدمت ہے۔ اسی طرح دستور کو ہماری خلیل یا مستقل طور پر محظوظ کرنے  
کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس حکومت کو نہیں دیئے جاسکتے،  
کیونکہ فعل کے دور میں لا عالہ وہ استبداد سے کام کرے گا اور استبداد منوع  
ہے۔

۲۔ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں  
شریک ہونا چاہئے، خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمائندوں کے  
واسطے سے شریک ہوں۔

۳۔ مشورہ آزادانہ اور بے لائگ اور مغلصانہ ہونا چاہئے۔ دیباو اور لائج کے  
تحت دوست یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

یہ دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں، اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول  
بہر حال ملحوظ رہنے چاہئے۔ اس میں الی کوئی مخالفت نہ رکھی جانی چاہئے کہ کسی  
وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں سے مشورہ لئے بغیر حکومت کی  
جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہئے جس سے پوری قوم  
شریک مشورہ ہو سکے اور اس میں ان اسباب کا سد باب ہونا چاہئے جن کے زیر اثر  
عوام سے یا ان کے نمائندوں سے خوف یا لائج یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن

(۶)

## اصول انتخاب

رئیس حکومت، وزراء، اہل شوریٰ اور حاکم کے انتخاب میں کیا امور مخوذ رہنے چاہیں، اس باب میں قرآن و حدیث کی ہدایات یہ ہیں:

لَنِ اللَّهِ يَا مَرْكُمْ لَنْ تُوْدُوا الْأَمَانَاتِ إِلَيْهَا  
اللَّهُ أَعْلَمُ بِحُكْمِ دِينِكُمْ (النساء: ۵۸)

اللہ جسیں حکم دیتا ہے کہ امامتی (یعنی اعتماد کی ذمہ داریاں) اہل امامت (یعنی امین لوگوں) کے پرداز کرو۔

لَنِ اكْرَمْكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقُوكُمْ (الجِرَاتِ: ۱۳)

در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ حقی ہو۔

خَيَارُ ائمَّتِكُمُ الَّذِينَ تَبَهُونُهُمْ وَيَبْهُونُكُمْ وَتَصْلُونَ عَلَيْهِمْ وَيَصْلُونَ عَلَيْكُمْ  
وَشَرَارُ ائمَّتِكُمُ الَّذِينَ تَبْغِضُونَهُمْ وَيَبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ  
(رواہ مسلم)

تمہارے بھتری سردار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کو تم دعا و دعاؤں اور وہ جسیں دعا دیں اور تمہارے بدتریں سردار وہ ہیں۔ جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت کیجیو اور وہ تم پر لعنت کیجیں۔

إِنَّا وَاللَّهِ لَا نُولِي عَلَى عَلِيهِنَا هَذَا الْعِدَادُ لَوْلَا حَرَصَ عَلَيْهِ (حقیق طیب)  
خدا کی حتم ہم اپنی اس حکومت کے کسی کام پر کسی ایسے شخص کو مقرر

نہیں کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کا حیص ہو۔

ان اخونکم عفدنامن طلبہ (ابوراؤ)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو۔

حدیث سے گزر کر یہ بات تاریخ کے صفات پر بھی ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام میں عمدوں کی طلب سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ چنانچہ تلقشندی اپنی کتاب صحیح الاعشی میں بیان کرتا ہے:

وقد اثر عن ابی بکر انہ قال سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن هذا الامر فقال لى یا ابا بکر هو لمن یرحب عنه لا لمن یجاھش علیه ولمن یتضائل عنه لا لمن یتنفج الیہ هو لمن یقال هولک لا لمن یقول هولی۔ (صحیح الاعشی للقلقشندی۔ ج ۱۔ ص ۲۳۰)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ما ثور ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے امارت کے پارے میں دریافت کیا تو حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا اے ابو بکر وہ اس کے لئے ہے جو اس سے بے رغبت ہونہ کہ اس کے لئے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو۔ وہ اس کے لئے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے نہ کہ اس کے لئے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اس کے لئے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تمرا حق ہے نہ کہ اس کے لئے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے۔

یہ اثر اگرچہ کسی حدیث کی کتاب میں نہیں ان الفاظ میں نہیں لایا ہے، بلکہ یہ ایک سوراخ کا بیان ہے، لیکن ہم نے اس بنا پر اسے نقل کر دیا ہے کہ حدیث کی دو مستند روایتیں اسی معنی میں اور پر نقل کی جا چکی ہیں۔ اس طرح کی کمزور روایتیں معنی کے اعتبار سے قوی ہو جاتی ہیں جب کہ ان کی تائید میں صحیح روایات موجود ہوں۔

یہ ہدایات اگرچہ محض اصولی ہدایات ہیں، ان میں یہ نہیں تھا کیا ہے کہ مطلوبہ صفات کے سرداروں اور فتح مددوں کو فتح کرنے اور ناپسندیدہ لوگوں کو روکنے کے لئے مشیفری کیا ہو، لیکن بہر حال یہ وقت کے دستور سازوں کا کام ہے کہ ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب عملی تذکیرہ تجویز کریں۔ انہیں انتخاب کا ایسا نظام سوچنا چاہئے جس سے امین اور متین اور عوام کے محبوب اور خیر خواہ لوگ منتخب ہوں اور وہ لوگ نہ ابھر سکیں جو عوام کے ووٹ لے کر بھی عوام کے مہنوض ہوتے ہیں، جن پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوتی ہے، جن کے حق میں لوگ بد دعا کرتے ہیں اور جنہیں عمدے پیش نہیں کئے جاتے بلکہ وہ خود عمدوں پر جھستے ہیں۔

---

(۶)

## عورتوں کے مناصب

الرجال قوامون علی النساء۔ (الناء: ۳۲)

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

لن يفلح قوم ولو اصرهم أمراء۔ (بخاري)

وہ قوم کبھی نلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملات ایک عورت کے پرداز کرے۔

یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب (خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا مختلف مکھوں کی ادارت) عورتوں کے پرداز نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا، یا اس کے لئے مختواں رکھنا نصوص صریح کے خلاف ہے اور اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی مرے سے مجازی نہیں ہے۔<sup>۱</sup>

<sup>۱</sup> اس مسئلے کی تشرع کے لئے ملاحظہ ہو باب ॥

(۷)

## حکومت کا مقصد

الذین لَنْ مَكَنُوهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاتَّوَالَّزْكُورَةَ وَأَمْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الجُّمَعَ: ۲۱)

(یہ مسلمان وہ لوگ ہیں) جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں گے، نبی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصد وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کافر حکومتوں کی طرح اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے اندر رونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کرے اور ملک کی ماڈی خوشحالی کے لئے ساعی ہو، بلکہ ایک اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے اس کا اولین فریضہ یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول بھلائی قرار دیتے ہیں اور ان برائیوں کو روکے جسے خدا اور رسول برائی کرتے ہیں۔ کوئی ایسی حکومت اسلامی حکومت کملانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جو اس پات سے بے پرواہ ہو کہ نماز قائم ہو رہی ہے یا نہیں، زکوٰۃ دی جا رہی ہے یا نہیں، بھلائیاں بھیل رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں اور برائیاں دب رہی ہیں یا ابھر رہی ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس کے حدود میں زنا اور شراب اور تمار بازی اور نوش لڑپچر اور نوش تماشوں اور نوش گانوں اور حکومت تعلیم اور تحریج جاہلیت اور اختلاط مردوں زن کا عام روایج ہو اور ان مربع منکرات پر کوئی

قدیم نہ ہو۔ لہس ایک اصلاحی و مخمور تھی لا زما" رہاسht کو ان فرائض کا باہمہ بودا  
چاہئے جنہیں قرآن اس کے خواصی فرائض میں گرفتار کر گا ہے۔

---

(۸)

## اولی الامر اور اصول اطاعت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطْبِعُوا اللَّهَ وَاطْبِعُوا الرَّسُولَ وَلَا يُلَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَلَن  
تَنَازَعُنَّمُ فِي شَيْءٍ فَرِدٌ وَهُوَ اللَّهُ وَالرَّسُولُ إِنْ كُنْتُمْ تَوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ ذَلِكُ خَيْرٌ وَالصَّحْنَ فَلَا يَلِدُ - (النساء: ۵۹)

اے لوگو! ہو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھردا اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پڑے یہ بہتر ہے اور بحاظ انجام بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں تین نہایت اہم بنیادی ثابت ہیں کے جسے ہم میں سے ایک کامرا تعقی دستوری مسائل ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت وہ اصل اطاعت ہے جس کا ہر مسلمان فرد کو بھیت فرد اور مسلمان قوم کو بھیت قوم پابند ہونا چاہئے۔ یہ اطاعت ہر دوسری اطاعت پر مقدم ہے۔ اولی الامر کی اطاعت اس کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے، اور اس کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس نکتے کی مزید وضاحت حسب ذیل آیات اور احادیث میں ہم کو ملتی ہے:

مَا كَانَ لِمَوْمَنٍ وَلَا مُؤْمِنٍ إِذَا قُضِيَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا إِنْ يَكُونُ لِهِمُ الْخَيْرُ  
مِنْ لِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهُ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا -

(آل حمزا: ۳۶)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لئے خود اپنے اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ..... فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ..... فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (المائدہ: ۳۷-۳۵-۳۴)

اور جو فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں ..... وہی ظالم ہیں ..... وہی فاسق ہیں۔

السمع والطاعة على المرعى المسلم فى ما احب وكره ما لم يأمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاري و مسلم)

ایک مسلمان پر سچی و طاعت لازم ہے خواہ برخدا و رغبت کرے یا براہت، تاویثیہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سچ ہے نہ طاعت۔

إِنَّ أَعْرَاعَكُمْ عَبْدٌ مَجْدُعٌ يَقُولُ كُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ فَاسْمَعُوهَا وَاطِّبِعُوهَا۔

(مسلم)

اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

لَا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف۔ (بخاري و مسلم)

معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔

لَا طاعة لِمَنْ عَصَى اللَّهَ۔ (طبرانی)

کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔

لَا طاعة لِمَخْلوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالقِ۔ (شرح النبی)

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔

کتاب و سنت کے یہ تمام محدثات اس باب میں ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز کوئی ایسا قانون بنانے کا حق نہیں رکھتی جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ہو اور اگر وہ ایسا کوئی قانون بنادے تو وہ رد کر دیئے جانے کا لائق ہے نہ کہ نافذ ہونے کے لائق۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتوں میں اللہ اور رسول کا قانون لازماً نافذ ہونا چاہئے اور جو بات کتاب و سنت کی دلیل سے حق ثابت کر دی جائے اسے کوئی حق اس بنا پر رد نہیں کر سکتا کہ لیجسٹیچر کا بنا یا ہوا قانون اس کے خلاف ہے۔ تصادم کی صورت میں اللہ اور رسول ﷺ کا قانون نہیں بلکہ لیجسٹیچر کا قانون حدود دستور سے خارج قرار پانا چاہئے۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کو ایسا کوئی حکم دینے یا ضابطہ بنانے کا حق نہیں ہے جس سے خدا اور رسول کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر وہ ایسا کوئی حکم دے اور لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو وہ مجرم نہیں ہوں گے، بلکہ اس کے بر عکس، خود حکومت زیادتی کی مرکب ہو گی۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اولی الامر مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی دو دلیلیں تو خود اس آیت ہی میں موجود ہیں۔ اول یہ کہ یا ایها الذین امنوا کہ کراولی الامر منکم فرمانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہ مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ دوم یہ کہ نزاع کی صورت میں متنازعہ یہ معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ رعایا اور حکومت کی نزاع میں اللہ اور رسول کو حکم صرف مسلمان اولی الامر ہی مان سکتے ہیں نہ کہ کافر اولی الامر۔ مزید برآں مستدر احادیث کی تصریحات بھی اسی کی تائید بلکہ تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ بھی اور نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات نقل ہو چکے ہیں کہ ”اگر ایک نکٹا غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری تیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت

کرو۔" اور یہ کہ "کوئی اطاعت اس شخص کے لئے نہیں ہے جو اللہ کا نام فرمان ہو۔" ایک اور حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت روایات کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ۔

لَنْ لَا نَنْزَعُ الْأَمْرَ إِلَّا إِنْ تَرْوَى كُفَّارًا بِوَاحِدٍ عِنْ دُكْمَكْمَنَ اللَّهُ فِيهِ بِرْهَانٌ

(بخاری و مسلم)

ہم اپنے عکراں سے بھکڑا نہ کریں گے الایہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جو ہمارے پاس ان کے خلاف اللہ کی طرف سے ایک دلیل ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے برسے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

لَا مَا قَالُوا فِيهِ كُمُ الْصَّلُوةُ (مسلم)

نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نہماں نہماں قائم کرتے رہیں۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحب امر بخشنے کی کوئی محاجاش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں مغربین اشتراکیت اور ایک جموروی ریاست میں مختلفین جمورویت کے لئے اولی الامر بخشنے کا نہ عقلاء کوئی موقع ہے نہ عمل۔

تمیرا نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نہماں کا حق رکھتے ہیں اور نہماں کی صورت میں فیصلہ جس چیز پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہو گی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ اس حکم کا تھاضا پورا کرنے کے لئے کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہئے جس کے پاس نہماں لے جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول

اللہ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علیم ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تھین کی کسی خاص عمل پر شریعت نے ہمیں محروم نہیں کروتا ہے۔ مگر بھرپور ایسا کوئی ادارہ حکومت میں ہونا چاہیے اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہونی چاہئے کہ انتظامیہ اور مقتدرہ اور عدالت کے احکام اور فیصلوں کے خلاف اس کے پاس مراقبہ کیا جاسکے اور اس کا بخداوی اصول یہ ہونا چاہئے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور بالطل کا فیصلہ کرے۔

---

(۹)

## بیادی حقوق اور اجتماعی عدل

ان الله يأمركم ان توقوا لامانات الى اهلها و اذا حكمتم بين الناس ان تحکموا بالعدل۔ (النساء: ۵۸)

الله تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے پرداز کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم (یا فیصلہ) کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

ولا یجر منکم شناس قوم علی الاتعدلو العدلوا هوا قرب للتفوی۔

(المائدہ: ۸)

اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

یہ آیات اگرچہ وسیع ترین مضموم میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عدل کا پابند بناتی ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ان کے اس تقاضے سے اسلامی ریاست آزاد نہیں ہو سکتی۔ لاحالہ اس کو بھی عدل ہی کا پابند ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے تو پدر جہ اویں ہونا چاہئے، کیونکہ حکم بین الناس کا سب سے زیادہ طاقت ور ادارہ وہی ہے اور اگر اس کے حکم میں عدل نہ ہو تو پھر معاشرے میں اور کہیں عدل نہیں ہو سکا۔

اب دیکھئے کہ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے، نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت سے حکم بین الناس میں عدل برتنے کا کیا طریقہ ثابت ہوتا ہے۔

- جستہ الوداع کے مشہور خطبے میں نبی اکرم ﷺ نے اسلامی ریاست کے نئے بیادی اصولوں کا اعلان فرمایا تھا ان میں ایک اہم اصول یہ بھی تھا۔

فَلَنْ دِمَائِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَأَعْرَاضِكُمْ حِرَامٌ كَحُرْمَةٍ يَوْمَكُمْ هُذَا۔

یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں دیسی عی محترم  
ہیں جیسا آج حج کا یہ دن محترم ہے۔

اس اعلان میں مملکت اسلامیہ کے تمام شریوں کو جان، مال اور آبرو کی حرمت  
کا بیادی حق عطا کیا گیا ہے جس کا بہر حال ہر اس ریاست کو الزام کرنا ہو گا جو ”  
اسلامی ریاست“ کے نام سے موسم ہو۔

۲۔ یہ حرمت کس حال میں کس طرح ثبوت سکتی ہے؟ اس کا تعین نبی اکرم  
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فَإِذَا فَعَلُوا ذَالِكَ عَصَمُوا مِنْ دِمَائِهِمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابِهِمْ عَلَى  
اللَّهِ۔ (بخاری و مسلم)

پھر جب لوگ یہ کام (یعنی شہادت توحید و رسالت اور اقامت صلوٰۃ و  
ایمان زکوٰۃ) کر دیں تو وہ اپنی جانیں مجھ سے بچائیں گے، الایہ کہ اسلام  
کے کسی حق کی بنا پر وہ مجرم ہوں اور ان کی نیتوں کا حساب لینا اللہ کے  
ذمے ہے۔

فَقَدْ حَرَمَتْ عَلَيْنَا نِعَمَّاهُمْ وَأَمْوَالِهِمْ إِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابِهِمْ عَلَى اللَّهِ۔  
(بخاری و مسلم)

پس ان کی جان و مال ہم پر حرام ہیں الایہ کہ جان و مال ہی کا کوئی حق ان  
پر قائم ہو۔ اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

۱۔ اگرچہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کے بیادی حقوق کا ذکر ہے لیکن اسلامی شریعت کا پر  
مسلم اصول ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنا قبول کر لیں ان کو دیوانی اور  
福德اری قانون کی نگاہ میں وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

فَمَنْ قَاتَلَهُ فَقَدْ عَصَمَ مِنْ مَالِهِ وَنَفْسِهِ الْأَبْعَدُهُ وَحَسَابُهُ عَلَى اللَّهِ

(بخاری)

پھر جو اس کا (یعنی گلہ توحید کا) ٹکڑی ہو جائے اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنا قرض بچا لیا الایہ کہ اللہ کا کوئی حق اس پر ہم کم ہو اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

یہ احادیث اس باب میں ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شری کی آزادی نفس اور خرمت جان و مال و آمدورپور کوئی دست درازی نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اسلامی قانون کی رو سے اس پر (یا اس کے خلاف) کوئی حق ثابت نہ کر دیا جائے۔  
۳۔ کسی پر (یا کسی کے خلاف) حق کا اثبات کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کو نبی اکرم ﷺ یوں بیان فرماتے ہیں:

إذ أجلس الْيَكَ الطَّعْمَانَ فَلَا تَقْضِي بِيَنْهُ مَا حَشَّ تَسْمِعُ مِنَ الْآخِرِ كَمَا سَمِعْتَ مِنَ الْأَوَّلِ۔ (ابوداؤد، ترمذی۔ احمد)

جب تمہرے سامنے دو فرق اپنا معاملہ لے کر پہیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ من لے جس طرح پہلے کی سن ہے۔  
اور حضرت عمر رض ایک مقدمے کے فیصلے میں تصریح کرتے ہیں:

لَا يُوْسِرُ رَجُلٌ فِي الْإِسْلَامِ بِغَيْرِ الْعَدْلِ۔ (موطا)

اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔

اس مقدمے کی جو تفصیل موظا میں دی گئی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے نومنتوح علاقے میں جموں ہنگیاں کھا کھا کر لوگ دوسروں کو پکڑوا رہے تھے۔ اس کی ثابت جب حضرت عمر رض کے پاس لائی گئی تو آپ نے اس کے فیصلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عدل سے مراد "معروف عدالتی کارروائی" (Due Process of Law) ہے یعنی ایک آدمی کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیا جائے اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔

اس کے بغیر اسلام میں کوئی نہیں تھا جس کیا جائے سکتا۔

۴۔ حضرت ملی ہو کے راتے ہیں جب ہماری گاہ قبور نواز ہو، وہ صریحے سے ریاستی کو مانتے کے لئے تیار رہتے ہیں، وہ آپ نے انہیں لکھا کہ:

کولوا بحیث شتم و بیننا و بینکم الا نصیکواد ما ولا تظلموا سیلا ولا  
تظلموا الصداقان فصلتم فبدلت الیکم الحربہ۔ (ملل الاول طار)

تم جماں ہا ہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہر طبقہ ہے کہ تم خون  
نہ بھاؤ اور بد امنی نہ بھیلاو اور کسی پر قلم نہ کرو۔ اگر ان کاموں میں سے  
کوئی کام تم نے کیا تو میں تمہارے خلاف جگ کروں گا۔

یعنی خیالات تھم ہو چاہو رکھو۔ تمہارے خیال اور فیض پر گرفتہ کی جائے  
گی۔ البته اگر تم اپنے خیالات کے مخالف حکومت کا تختہ زبردستی اللہ دینے کی  
کوشش کرے گے تو یہی "تمہارے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی لکھ بھی نہیں رہتا کہ اسلامی تصور  
عدل کسی حال میں بھی انظامیہ کو یہ اختیارات دیجئے گا رواوار نہیں ہے کہ وہ  
معروف عدالتی کارروائی کے بغیر ہوں ہی جس کو چاہیں کہیں، ہے چاہیں قید کر دیں،  
جسے چاہیں خارج البلد کریں، جس کی چاہیں زبان بھڑکی کریں اور ہے چاہیں افکار  
رائے کے وسائل سے ہر دم کر دیں۔ اس طرح کے اختیارات جو ریاست اپنی  
انظامیہ کو دیتی ہو وہ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہو سکتی۔

پھر حکم بین الناس میں عدل برستے کا ایک دوسرا مضموم بھی ہم کو اسلام کی  
مشترک روایات سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں صدر ریاست اور  
گورنرزوں اور اعلیٰ حکام اور عامۃ الراس، سب کے لئے ایک یعنی ہنون اور ایک یعنی  
نظام عدالت ہے۔ کسی کے لئے کوئی ہنونی اختیاز نہیں ہے، کسی کے لئے غاص  
عدالتی نہیں ہیں اور کوئی ہنون کی پکڑ سے مستحق نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے آخر  
وقت میں خود اپنے آپ کو ہیں کیا کہ جس کو ہیرے خلاف کوئی دعویٰ ہو وہ لائے

اور اپنا حق وصول کرے۔ حضرت عمرؓ نے ایک والی ریاست، جبلہ بن احمد غسافی سے ایک بد دی کو قصاص دلوایا۔ حضرت عمر و بن العاصؓ نے گورنروں کے لئے قانونی تحفظ کا مقابلہ کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور عام لوگوں کو یہ حق دیا کہ جس حاکم کے خلاف انسیں شکایت ہو اسے کھلی عدالت میں لائیں۔

---

(۱۰)

## فلح عامہ

و فی اموالہم حُقْلَ السائلِ وَ الْمُحْرُومِ (الذاريات: ۱۹)  
 ان کے مالوں میں حق تھامد زمگنے والے کے لئے اور رزق بے محروم رو  
 جانے والے کے لئے۔

خَذْمَنَ اهْمَالَهُمْ صَدَقَةً تَطْهِيرَهُمْ وَ تَزْكِيَّهُمْ بِهَا وَ صَلَّى عَلَيْهِمْ  
 (التوبہ: ۱۰۳)

ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے ان کو (بری صفات سے) پاک  
 کرو اور ان کو (اچھی صفات میں) بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے خیر  
 کرو۔

لَنَّ اللَّهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تَوْخِزُ مِنْ أَغْنِيَاتِهِمْ فَتَرَدَّدُ عَلَى فَقَرَانِهِمْ  
 (مخاری و مسلم)

اللہ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے  
 لیا جائے گا اور ان کے حاجت مندوں پر لوٹا دیا جائے گا۔  
 السُّلْطَانُ وَلِيٌّ مِنْ لَا ولِيٌّ لَهُ

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ مسند احمد۔ ابن ماجہ۔ داری)

حکومت اس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔  
 هُنْ مَاتُ وَ عَلَيْهِ دِينٌ وَ لَمْ يَتَرَكْ وَفَاءَ فَعَلَى قَضَائِهِ وَ مَنْ تَرَكَ حَالًا  
 فَلَهُ شَهَادَةٌ

جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے  
قابل مال نہ پھوڑے تو اس کا ادا کرنا بھرپے ذمے ہے اور جو مال  
پھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

وفی روایۃ من ترک دینا الوصیا عما فلیبا نقش فنانا مولاد

ایک دوسری روایت میں ہے جو شخص قرض پھوڑے یا ایسے پس ماند گا ان  
پھوڑ جائے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئیں، میں  
ان کا سرپرست ہوں۔

وفی روایۃ من ترک مالا فلور شہ و من ترک کلا فالینا۔

(بخاری وسلم)

ایک اور روایت میں ہے جو مال پھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق  
ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار پھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے  
ذمے) ہے۔

انا ولوث من لا ولوث له اعقل عنده وارثه۔ (ابوداؤر)

جس کا کوئی دارث نہ ہو اس کا میں دارث ہوں۔ اس کی طرف سے دست  
ادا کروں گا اور اس کی میراث لوں گا۔

یہ آیات اور احادیث تصریح کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے  
ایک اہم فرض ذکوٰۃ کی تحقیم ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ  
داری یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر تمام ان لوگوں کی کفیل بنے جو حدود کے علاج  
ہوں اور وسائل رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے دستوری احکام جو ہم کو کتاب و سنت میں ملتے ہیں۔

اگرچہ دستوری مسائل کے حق قرآن اور حدیث میں اور بھی بہت سی ہدایات  
 موجود ہیں، مگرچہ ان کا تعلق دستور سے کم اور دستوری قانون سے زیادہ ہے،  
اس لئے ہم نے ان کو بہاں بیان نہیں کیا ہے۔

اب، ہر شخص جو دستور کے متعلق کچھ بھی واقعیت رکھتا ہو، ہماری پیش کردہ ان آیات اور احادیث کو دیکھ کر خود رائے قائم کرے کہ آیا ان میں ایک اسلامی ریاست کی اصولی بنیادیں صاف صاف بیان کردی گئی ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی صاحب کھوکھے دعوؤں کے بجائے علمی استدلال سے یہ ثابت کر دیں کہ ان احکام کا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمیں ہمایں کہ دستور کے وہ کون سے بنیادی مسائل (تفصیلات نہیں بلکہ بنیادی مسائل) ہیں جن میں کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی، تو ہم ضرور اس کے شہرگزار ہوں گے لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسائل جن پر ہم نے اپر بحث کی ہے دستوری مسائل نہیں ہیں اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل پر قرآن و حدیث کی ان تعلیمات سے کوئی روشنی نہیں پڑتی، تو اس کے بعد غیر منافق شرفاء کے لئے دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ سید ہمی طرح ان احکام کو تسلیم کریں اور ملک کے دستور میں ان کو ثبت کر کے باقی تفصیلات جس طرح مناسب سمجھیں مرتب کرتے رہیں۔ یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ ہم نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ سنت کو، ہمارا ایمان اس ذیموکری پر ہے جس کا اسوہ حسنہ ہم کو امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان کے دستور سلطنت میں ملتا ہے۔ ان دو راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کریں گے، بہرحال وہ راست باز انسانوں کے شایان شان ہو گا۔ رہایہ طریقہ کہ سامنے آنکاب نصف الثوار پر چک رہا ہو اور آدمی کے جائے کہ روشنی کہیں موجود نہیں ہے تو اس سے لوگ فریب کھائیں یا نہ کھائیں، کہنے والا اپنی عزت ضرور کھو دیتا ہے۔

---

باب ۹

## اسلامی ریاست کا مشائی دور

دور نبوی ملیحہم اور خلافت راشدہ پر ایک نظر

□ دور نبوی ملیحہم

□ خلافت راشدہ

چھپلے ابواب میں اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے بحث ہو چکی ہے۔ اب اس مثالی دور کا ایک نظری اور تاریخی جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے فرمایا تھا اور جس میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی از سر نو تکمیل کی گئی ہے۔ یہ دور روشنی کا مینار ہے اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں مسلمان اسی فتح نور سے فیض حاصل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے کہ اس نے ریاست کا ایک نیا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ گوشت پوست کی اس دنیا میں اپنے تصور کی ریاست قائم بھی کی اور وہ ریاست ایک مدت تک اپنی معیاری محل میں کام کرتی رہی۔ دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تصور کی معیاری ریاست کبھی ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لئے بھی عمل کی دنیا میں قائم ہوئی ہو۔ یہ صرف اسلام ہی کا اعجاز ہے اور اس باب میں وہ منفرد ہے۔

مرتب

# دور نبوی مطہریم اور خلافت راشدہ پر ایک نظر

(۱)

## دور نبوی مطہریم

ظهور اسلام کے ساتھ جو مسلم معاشرہ وجود میں آیا اور پھر بھرت کے بعد سیاسی طاقت حاصل کر کے جس ریاست کی محل اس نے اختیار کی، اس کی بنیاد چند واضح اصولوں پر تھی۔ ان میں سے اہم تر، جن کا تعلق ہماری بحث سے ہے، یہ ہیں۔

### - قانون خداوندی کی بالاتری

اس ریاست کا اولین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہل ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق الحقیقت کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اس کو لازماً اس قانون خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہئے جس کا مأخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ قرآن مجید میں اس قاعدے کو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ النساء: ۵۹، ۶۳، ۶۵، ۸۰، ۱۰۵۔ المائدہ: ۲۲، ۲۵، ۲۷۔ الاعراف: ۳۔ یوسف: ۳۰۔ النور: ۵۳، ۵۵۔ الاحزاب: ۳۶۔ الحشر: ۷۔ نبی اکرم مطہریم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں اس اصل الاصول کو پوری صراحة کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

عَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ أَحْلُوا حَلَالَةٍ وَ حَرَمٌ مَا حَرَمَ اللَّهُ

۱- کنز العمال، بحوالہ طبرانی و مسند احمد، جلد اول، حدیث نمبر ۹۰، ۹۶۶ (طبع دائرۃ المعارف)

”تم پر لازم ہے کتاب اللہ کی حیروی۔ جس چیز کو اس نے طال کیا ہے اسے طال کرو اور جسے اس نے حرام کیا ہے اسے حرام کرو۔

ان اللہ فرض فرائض فلا تضييعوها و حرم حرمات فلا تنتري كوها وحد حدودا فلا تعنت وها و سكت عن اشياء من غير نسيان فلا تبھثوا عنها۔<sup>۱</sup>

”اللہ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں، انہیں خالع نہ کرو۔ کچھ حرمین مقرر کی ہیں، انہیں نہ توڑو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے بغیر اس کے کہ اسے نیان لاحق ہوا ہو، ان کی کھوج میں نہ پڑو۔

من اقتدى بكتاب الله لا يضل في الدنيا ولا يشقى في الآخرة<sup>۲</sup>

”جس نے کتاب اللہ کی حیروی کی وہ نہ دنیا میں گمراہ ہو گانہ آخرت میں بد بخت۔

تركت فيكم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما، كتاب الله و سنة رسوله<sup>۳</sup>

”میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں جنہیں اگر تم تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

ما امرتكم به فخذوه وما نهيتكم عنه فانتهوا۔<sup>۴</sup>

”جس چیز کا میں نے تم کو حکم دیا ہے اسے اختیار کرو اور جس چیز سے

<sup>۱</sup>- مخلوکے بحوالہ دار ”قطنی“، باب الاعظام بالکتاب والسنۃ۔ کنز العمال، ج ۱، ح ۹۸۱، ۹۸۲۔

<sup>۲</sup>- مخلوکہ بحوالہ رزین، باب مذکور۔

<sup>۳</sup>- مخلوکہ بحوالہ موطا، باب مذکور۔ کنز العمال، ج ۱، ح ۹۳۹، ۹۵۵۔

<sup>۴</sup>- کنز العمال، ج ۱، ح ۸۸۶۔

روکا ہے اس سے رک جاؤ۔“

## ۲۔ عدل بین الناس

دوسرًا قاعدہ جس پر اس ریاست کی ہماری کمی می تھی، یہ تھا کہ قرآن و سنت کا دیبا ہوا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہئے۔ کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی محفوظ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے کہ۔

وامرۃ لاعدل بینکم۔<sup>۱</sup>

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کرو۔

یعنی میں بے لاگ انصاف پسندی کرنے پر مامور ہوں۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ کسی کے حق میں اول کل کے خلاف تعصّب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور وہ ہے عدل و انصاف کا تعلق۔ حق جس کے ساتھ ہو میں اس کا ساتھی ہوں اور حق جس کے خلاف ہو میں اس کا مقابلہ ہوں۔ میرے دین میں کسی کے لئے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، شریف اور کمین کے لئے الگ الگ حقوق نہیں ہیں۔ جو کچھ حق ہے وہ سب کے لئے حق ہے۔ جو گناہ ہے وہ سب کے لئے گناہ ہے۔ جو حرام ہے وہ سب کے لئے حرام ہے۔ جو حلال ہے وہ سب کے لئے حلال ہے۔ اور جو فرض ہے وہ سب کے لئے فرض ہے۔ میری اپنی ذات بھی قانون خداوندی کی اس ہدھ گیری سے مستثنی نہیں۔ نبی اکرم ﷺ خود اس قاعدے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

انما هلک من کان قبلکم انہم کانوا یقیمون الحد على الوضیع و یترکون

**الشريف، والذى نفس محمد بيده لوان فاطمة (بنت محمد) فعلت  
ذلك لقطعت يدها۔<sup>۱</sup>**

"تم سے پلے جو اتنی گز رہی ہیں وہ اسی لئے تو جاہ ہو سکیں کہ وہ لوگ کمتر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ حتم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقيده من نفسه<sup>۲</sup>  
”میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات سے بدله دیتے دیکھا ہے۔“

### ۳۔ مساوات بین المسلمين

اسی قاعدے کی فرع یہ تیرا قاعدہ ہے جو اس ریاست کے مسلمات میں سے تھا کہ تمام مسلمانوں کے حقوق بلا لحاظ رنگ و نسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں فرود ترقیار پا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انما المؤمنون أخوة (الحجرات۔ آیت: ۱۰)

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

<sup>۱</sup> بخاری، کتاب الحدود، ابواب نمبر ۱۱ - ۱۲

<sup>۲</sup> کتاب المحراج، امام ابو یوسف۔ ص ۱۱۶، المبدع للغیر، مصر، طبع ثالث ۱۳۵۲ھ۔ مدد ابو داؤد الیه ولی، حدیث نمبر ۵۵، طبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۲۱ھ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذِكْرٍ وَأَنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شَعوبًا وَقَبَائلٌ  
لِتَعَاوْنَفُوا طَلَانٌ أَكْرَمُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَاءُكُمْ (الْجَرَاتُ: ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں  
اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ  
کے نزدیک تم میں سب سے محظوظ ہے جو سب سے زیادہ متین ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے حسب ذیل ارشادات اس قاعدے کی صراحت کرتے ہیں:  
إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظَرُ إِلَيْكُمْ صُورَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَلَكُنْ يَنْظَرُ إِلَيْكُمْ  
وَاعْمَالُكُمْ<sup>۱</sup>

”اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دل اور  
تمہارے اعمال دیکھتا ہے۔“

الْمُسْلِمُونَ أَخْوَةٌ لَا فَضْلَ لَأَحَدٍ عَلَىٰ أَحَدٍ إِلَّا بِالْتَّقْوَىٰ<sup>۲</sup>

”مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں گرفتاری کی بنا پر۔  
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِلَّا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِينَ عَلَىٰ عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجمِيٍّ  
عَلَىٰ عَرَبِينَ وَلَا لِأَسْوَدِ عَلَىٰ أَحْمَرٍ وَلَا لِأَحْمَرٍ عَلَىٰ أَسْوَدِ إِلَّا بِالْتَّقْوَىٰ<sup>۳</sup>

”لوگو، من لو، تمہارا رب ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی  
فضیلت نہیں، نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے،  
گرفتاری کے لحاظ سے۔“

<sup>۱</sup> تفسیر ابن کثیر، بحوالہ مسلم و ابن ماجہ، ج ۲، ص ۲۱۷، مطبوع مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۳۷ء

<sup>۲</sup> ابن کثیر، بحوالہ طبرانی، ج ۲، ص ۲۱۷

<sup>۳</sup> تفسیر روح المعانی، بحوالہ یحییٰ و ابن مردویہ، ج ۲۶، ص ۱۳۸۔ ادارے الہیات  
المنیریہ، مصر۔

من شهدان لا إله إلا الله واستقبل قبلتنا وصلى صلواتنا وأكل زبيحتنا فهو  
ال المسلم له مال المسلم وعليه ما على المسلم<sup>۱</sup>

”جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے۔ اس کے حقوق وہی ہیں جو مسلمان کے حقوق ہیں اور اس پر فرائض وہی ہیں جو مسلمان کے فرائض ہیں۔

المومنون تتكا فاد ماؤهم وهم يد علی من سواهم ويسعى بذمتهم  
ادناهم<sup>۲</sup>

”مومنوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں“ وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک ہیں، اور ان کا ایک ادنی آدمی بھی ان کی طرف سے ذمہ لے سکتا ہے۔

لیس على المسلم جزية<sup>۳</sup>

”مسلمان پر جزیہ عامد نہیں کیا جاسکتا۔“

### ۴۔ حکومت کی ذمہ داری

چوتھا اہم قابلہ جس پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی، یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خدا ترس، ایمان دار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہئے اور اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر، یا نفسانی اغراض کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن مجید

۱۔ بخاری، ”کتاب الصلوة“، باب ۲۸۔

۲۔ ابو داؤد، ”کتاب الدیات“، باب ۱۱۔ زای، ”کتاب القاسم“، باب ۱۰، ۱۳۔

۳۔ ابو داؤد، ”کتاب الامارۃ“، باب ۳۳۔

میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُودِعُوا الْإِيمَانَ إِلَيْهِ إِذَا حُكِّمَتْ بَيْنَ النَّاسِ  
تَحْكِمُوا بِالْعُدْلِ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ نَعَمَا يَعْظِمُ بَهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا  
بصیرا۔<sup>۱</sup>

”اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ اہانتیں اہل امانت کے پرداز کرو اور جب لوگوں  
کے درمیان نیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تمیں اچھی فضیحت کرتا  
ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الْأَكْلُكُمْ رَاعٌ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ فَالْأَمَامُ الْأَعْظَمُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ  
رَاعٌ وَهُوَ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ<sup>۲</sup>

”خبردار رہو، تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے  
بارے میں جواب دہ ہے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر  
حکراں ہو، وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ۔  
مَا مِنْ وَالِيٌّ رَعِيَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌ لَهُمُ الْأَحْرَمُ اللَّهُ  
عَلَيْهِ الْجَنَّةُ<sup>۳</sup>

”کوئی حکراں، جو مسلمانوں میں سے کسی رعیت کے معاملات کا سربراہ ہو،  
اگر اس حالت میں مرے کہ وہ ان کے ساتھ وہو کا اور خیانت کرنے والا  
تھا، تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

هَا مِنْ أَمْيَرِ رِسْلِي امْرُ الْمُسْلِمِينَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَلَا يُنْصَحُ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ  
مَعْهُمْ فِي الْجَنَّةِ<sup>۱</sup>

”کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنہالے پھر اس کی ذمہ  
داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ  
کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً نہ داخل ہو گا۔

يَا أَبَا زَرَّ انْكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمٌ الْقِيمَةُ خَزِيٌّ وَنَدَامَةُ الْأَمْنِ أَخْذٌ  
. بِحَقِّهَا وَلَدَى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا<sup>۲</sup>

(نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر ؓ سے فرمایا) اے ابوذر، تم کمزور  
آدمی ہو اور حکومت کا منصب ایک امانت ہے، اور قیامت کے روز وہ  
رسوائی اور ندامت کا موجب ہو گا سوائے اس شخص کے جو اس کے حق  
کا پورا پورا الحافظ کرے اور جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اسے تھیک  
ٹھیک ادا کرے۔

مِنْ أَخْوَنَ الْخِيَانَةِ تِجَارَةُ الْوَالِيِّ فِي رَعِيَّةٍ<sup>۳</sup>

”کسی حاکم کا اپنی رعیت میں تجارت کرنا بدترین خیانت ہے۔

مِنْ وَلِيٍ لَنَا عَمَلاً وَلَمْ تَكُنْ لَهُ زَوْجَةٌ فَلْيَتَخَذْ زَوْجَةً وَمَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ خَادِمٌ  
فَلْيَتَخَذْ خَادِمًا اولیس لَهُ مَسْكُنٌ فَلْيَتَخَذْ مَسْكِنًا اولیس لَهُ دَابَّةٌ فَلْيَتَخَذْ  
دَابَّةً فَمِنْ أَصَابَ سُوَى ذَالِكَ فَهُوَ غَالٌ أَوْ سَارِقٌ۔

”جو شخص ہماری حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو وہ اگر یوں نہ رہتا

<sup>۱</sup>- مسلم، کتاب الامارہ، باب ۵

<sup>۲</sup>- کنز العمال، ج ۶، ح ۶۸ - ۶۹

<sup>۳</sup>- کنز العمال، ج ۶، ح ۷۸

<sup>۴</sup>- کنز العمال، ج ۶، ح ۳۲۶

ہو تو شادی کر لے، اگر خادم نہ رکھتا ہو تو ایک خادم حاصل کر لے، اگر مکر نہ رکھتا ہو تو ایک مکر لے لے، اگر سواری نہ رکھتا ہو تو ایک سواری لے لے۔ اس سے آگے جو شخص قدم بڑھاتا ہے وہ خائن ہے یا چور۔

حضرت ابو بکر صدیق رض فرماتے ہیں:

من يَكْنُ أَمِيرًا فَانْهُ مِنْ أَطْوَلِ النَّاسِ حِسَابًا وَأَغْلَظُهُ عَذَابًا وَمَنْ لَا يَكُونُ  
أَمِيرًا فَانْهُ مِنْ أَيْسَرِ النَّاسِ حِسَابًا وَأَهْوَنُهُ عَذَابًا لَآنِ الْأَمْرَاءِ أَقْرَبُ النَّاسِ  
مِنْ ظُلْمِ الْعَوْمَيْنِ وَمَنْ يَظْلِمُ الْمَرْمَنِينَ فَإِنَّمَا يَخْفِرُ اللَّهُ<sup>۱</sup>

”جو شخص حکمران ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہو گا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں جلا ہو گا“ اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلاکا حساب دینا ہو گا اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے، کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے موقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے۔

حضرت عمر رض کہتے ہیں:

لَوْ هَلَكَ حَمْلٌ مِنْ وَلَدِ الْعَصَانِ ضَيَّاعًا بِشَاطِئِ الْفَرَاتِ خَشِيتَ أَنْ سَيْلًا نَّى  
اللَّهُ<sup>۲</sup>

”دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا پچھہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ذرگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔

## ۵۔ شوریٰ

اس ریاست کا پانچواں اہم قاعدہ یہ تھا کہ سربراہ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہئے اور اسے حکومت کا نظام بھی مشورے سے چلانا چاہئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وامرهم شوریٰ بینہم۔<sup>۱</sup>

”اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔

وشاورهم فی الامر۔ (آل عمران: ۱۵۹)

”اور اے نبی ﷺ ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔

حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ہو اور نہ آپ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ فرمایا:

اجمعوا العابدین من امتی واجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقتضوا براہی واحد۔<sup>۲</sup>

”میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورے کے لئے پیش کر دو۔ کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں:

من دعا الی امامۃ نفسه او غيره من غير مشورة من المسلمين فلا يحل

لکم ان لا تقتلوه۔<sup>۳</sup>

<sup>۱</sup> الشوری، ۳۸

<sup>۲</sup> تفسیر روح المانی، ج ۲۵، ص ۳۲

<sup>۳</sup> سکریوالی، ج ۵، ص ۲۵۷۷

”جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور شخص کی امانت کے لئے دعوت دے تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ اسے تحلیل نہ کرو۔ ایک اور روایت میں حضرت عمر بن الخطاب کا یہ قول نقل ہوا ہے:

الخلافة الا عن مشورة<sup>۱</sup>

”مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔“

## ۶۔ اطاعت فی المعرف

چنان قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی، یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے، معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحت ہوں اور رعیت کے لئے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انسیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ قرآن مجید میں خود رسول اللہ ﷺ کی بیعت کو بھی اطاعت فی المعرف کے ساتھ مشرد ط کیا گیا ہے، حالانکہ آپ کی طرف سے کسی معصیت کا حکم صدر ہونے کا کوئی سوال عی پیدا نہیں ہوتا۔

ولَا يعصينك فی معرف<sup>۲</sup>

”اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی تافرمانی نہ کریں گی۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب أو كره مالم يأمر

**بِمُعْصِيَةِ فَلَذَا الصُّرْبِعْصِيَةِ فَلَأَصْمَعْ وَلَا طَاعَةٌ۔<sup>۱</sup>**

ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سخ و طاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اے پسند ہو یا ناپسند، تو فیکر اے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سخ و طاعت نہیں۔

**لَا طَاعَةٌ فِي مُعْصِيَةِ اللَّهِ، لِنَمَا الظِّلْعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ۔<sup>۲</sup>**

اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔

چہ مضمون نبی اکرم ﷺ کے بکھرت ارشادات میں مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ کہیں آپ نے فرمایا لا طاعة لمن عصى الله (جو اللہ کی نافرمانی کرے، اس کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا لا طاعة للمخلوق فی مُعْصِيَةِ الْخَالقِ (خالق کی نافرمانی میں کسی حقوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا لا طاعة لمن لم يطع الله (جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کے لئے کوئی اطاعت نہیں) کہیں فرمایا من امرکم من الولاة بِمُعْصِيَةِ فَلَأَتْبِعِيهِوْهُ (حکام میں سے جو کوئی تمہیں کسی معصیت کا حکم دے اس کی اطاعت نہ کرو۔)<sup>۳</sup>

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

مَنْ وَلَى امْرَأَهُمْ مُحَمَّدَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَلَمْ يَقْمِ فِيمَا بَرَكَتْ بِكِتابٍ

<sup>۱</sup>- بخاری، کتاب الاحکام، باب ۲۔ مسلم، کتاب الامارة، باب ۸۔ ابو داؤد، کتاب الجماد، باب ۹۵۔ نبأ، کتاب البيعة، باب ۳۳۔ ابن حجر، ابواب الجماد، باب ۴۰۔

<sup>۲</sup>- مسلم، کتاب الامارة، باب ۸۔ ابو داؤد، کتاب الجماد، باب ۹۵۔ نبأ، کتاب البيعة، باب ۳۳۔

<sup>۳</sup>- سہر العمال، ج ۶، احادیث نمبر ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۱، ۳۰۲۔

اللَّهُمَّ فَعْلِيهِ بِرَبِّكَ اللَّهَمَّ

جو شخص محمد ﷺ کی امت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ذمہ دار بنا یا  
گیا اور پھر اس نے لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق کام نہ کیا  
اس پر اللہ کی لعنت۔

اسی بناء پر خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ اعلان کر دیا  
تھا کہ:

اطیعو نی ما اطع نت اللہ و رسوله فاذا عصیت اللہ و رسوله فلا طاعۃ لی  
ع لیکم ۱۲

میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور  
جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی کوئی اطاعت تم  
پر نہیں ہے۔

حضرت علی ہدھ فرماتے ہیں:

حق علی الامام ان يحکم بما انزل اللہ وان یوئی الامانة فاذا فعل ذلك  
فحق علی الناس ان یسمعوا له وان یطیعوا وان یجیبو وادادعوا۔ ۳۱

مسلمانوں کے فرمازدا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے  
مطابق فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے۔ پھر جب وہ اس طرح کام کر  
رہا ہو تو لوگوں پر یہ فرض ہے کہ اس کی سنیں اور مانیں اور جب انہیں

۱- کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۰۵

۲- کنز العمال، ج ۵، حدیث ۲۲۸۲۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابو بکر صدیق ہدھ کے  
الفاظ یہ ہیں وان عصیت اللہ فاعصو نی (اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم میری نافرمانی  
کرو۔) کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۳۰۔

۳- کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۳۱۔

پکارا جائے تولیک کہیں۔

انی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنے ایک خطبے میں یہ اعلان فرمایا:

ما امرتکم بہ من طاعۃ اللہ فحق علیکم طاعتی فیما احیبتم و ما کرہتم  
و ما امرتکم بہ من معصیۃ اللہ فلَا طاعۃ لاحد فی المعنیۃ الطاعۃ فی  
المعروف الطاعۃ فی المعروف الطاعۃ فی المعروف<sup>۱</sup>

میں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر  
فرض ہے، خواہ وہ حکم تحسین پسند ہو یا ناپسند۔ اور جو حکم میں تحسین اللہ  
کی نافرمانی کرتے ہوئے دوں تو معصیت میں کسی کے لئے اطاعت نہیں۔  
اطاعت صرف معروف میں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے، اطاعت  
صرف معروف میں ہے۔

### ۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا

یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد میں سے تھا کہ حکومت کے ذمہ  
دارانہ مناصب کے لئے عموماً اور خلافت کے لئے خصوصاً وہ لوگ سب  
سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عمدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور  
اس کے لئے کوشش کریں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تَلَكَ الدُّلُوْلُ الْآخِرَةَ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يَرِيدُونَ عَلَوَافِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔

(القصص: ۸۳)

وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے  
طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَنَا وَاللّٰهُ لَا نُولِي عَلٰى عَمَلِنَا هٰذَا اَحْدَادِنَا لَهُ اُوْحَدَ حُرْصٌ عَلٰيْهِ۔<sup>۱</sup>

بِخَدَاوِهِمْ اِنَّمٰی اس حُكْمَتْ كَامِنْصَبْ كَسِي اِيْسَيْهِ شُخْصُ كُوْنِسْ كُونِسْ دِيْنَسْ جُواَسْ كَا طَالِبْ هُوْ يَا اس كَا حَرِيصْ هُوْ۔

اَن اَخْوَنْكُمْ عَنْدَنَا مِنْ طَلَبْهِ۔<sup>۲</sup>

ثُمَّ مِنْ سِے سِبْ سِے بِرْدَهْ كَرْ خَائِنْ هَمَارَے نَزُدِيْكِ وَهُوْ هُوْ جُواَسْ سِے خُودْ طَلَبْ كَرَے۔

اَن لَا نَسْتَعْمِلْ عَلٰى عَمَلِنَا مِنْ اِرَادَهِ۔<sup>۳</sup>

هُمْ اِنَّمٰی حُكْمَتْ مِنْ كَسِي اِيْسَيْهِ شُخْصُ كُوْنِسْ كُونِسْ بِهَاتَنَسْ جُواَسْ بِهَشْ كَرَے۔

يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ سَمْرَةَ لَاتْسَأْلُ الْأَمَارَةَ فَإِنْكَ أَذَا أَوْتَيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةِ

وَكْلَتِ الْيَهُوا وَلَا أَوْتَيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةِ أَعْنَتِهَا عَلٰيْهِ۔<sup>۴</sup>

۱۔ بخاری کتاب الاحکام، باب ۷۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب ۲

۲۔ ابو داؤد، کتاب الامارۃ، باب ۲

۳۔ کنز العمال، ج ۶، ح ۲۰۶

۴۔ کنز العمال، ج ۶، ح ۶۹۔ اس مقام پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اگر یہ اسلام کا اصول ہے تو پھر حضرت پوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ سے حکومت کا منصب کیوں مانگا تھا۔ دراصل حضرت پوسف علیہ السلام کسی مسلمان ملک اور اسلامی حکومت میں نہیں بلکہ ایک کافر ملک اور کافر حکومت میں تھے۔ وہاں ایک خاص نفیاتی موقع پر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت اگر میں بادشاہ سے حکومت کا بلند ترین منصب طلب کروں تو وہ مجھے مل سکتا ہے اور اس کے ذریعے سے میں اس ملک میں خدا کا دین پھیلانے کے لئے راستہ نکال سکتا ہوں، لیکن اگر میں طلب اقتدار سے باز رہوں تو اس کافر قوم کی ہدایت کے لئے جو نادر موقع مجھے مل رہا ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ ایک خاص صورت حال تھی جس پر اسلام کا عام قاعدہ چپاں نہیں ہوتا۔

(عبدالرحمن بن سره رضي الله عنه سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا) اے عبد الرحمن بن سرہ امارت کی درخواست نہ کرو، کیونکہ اگر وہ تمہیں مانگنے پر دی گئی تو خدا کی طرف سے تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا اور اگر وہ تمہیں بے مانگے ملی تو خدا کی طرف سے تم کو اس کا حق ادا کرنے میں مددی جائے گی۔

#### -۸- ریاست کا مقصد وجود

اس ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی ردوبدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیار اخلاق کے مطابق بھائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔ قرآن مجید میں اس ریاست کا مقصد وجود یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

الذین ان مکثهم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتوا الزکوة وامرُوا بالمعروف  
ونهوا عن المنکر۔<sup>۱</sup>

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے اور یہی قرآن کی رو سے امت مسلمہ کا مقصد وجود بھی ہے۔

وَكَذَ الَّذِي جعلناكم أمة وسطًا لتكونوا شهداء على الناس ويكون  
الرسول عليكم شریدا۔ (البقرہ: ۱۳۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیج کی امت (یا راہ اعدال پر قائم رہنے والی امت) بنا دیا گا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ الْمَّةِ اخْرَجْتَ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ  
تَوْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: آیت ۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لئے نکالا گیا  
ہے۔ تم نبکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے  
ہو۔

علاوہ یہیں جس کام پر محمد ﷺ اور آپ ﷺ سے پہلے کے تمام انبیاء مامور تھے  
وہ قرآن مجید کی رو سے یہ تھا کہ انْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔<sup>۱</sup> (دین کو قائم  
کرو اور اس میں متفق نہ ہو جاؤ) غیر مسلم دنیا کے مقابلے میں آپ کی ساری  
جدوجہد صرف اس غرض کے لئے تھی کہ يَكُونُ الدِّينُ كَلَمَ اللَّهِ۔<sup>۲</sup> (دین پورا کا پورا  
صرف اللہ کے لئے ہو جائے) اور تمام انبیاء کی امتوں کی طرح آپ کی امت کے  
لئے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ لِيَعْبُدَ اللَّهُ مُخْلَصِينَ لِهِ الدِّينُ حنفاء۔<sup>۳</sup> (یکسو ہو  
کر اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے) اس لئے آپ  
کی قائم کردہ ریاست کا اصل کام یہ تھا کہ دین کے پورے قوم کو قائم کرے اور  
اس کے اندر کوئی ایسی آمیزش نہ ہونے دے جو مسلم معاشرے میں دو رنگی پیدا  
کرنے والی ہو۔ اس آخری نکتے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب اور  
جانشینوں کو سختی کے ساتھ متنبه فرمادیا کہ:

مِنْ أَحَدِثِ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَطْلُبٌ مِنْهُ فَهُوَ دَرْدٌ۔<sup>۴</sup>

جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جس سے نہ  
ہو اس کی بات مردود ہے۔

<sup>۱</sup> الشوری: ۱۳

<sup>۲</sup> الأفغَال: ۳۹

<sup>۳</sup> مَكْلُوَةٌ، بَابُ الْاعْصَامِ بِالْكِتابِ وَالنَّهُ

ایکم و محدثات الامور فان کل محدثۃ بنتہ و کل بدعة ضلالۃ۔<sup>۱</sup>

خربدار! نرالی باتوں سے بچتا، کیونکہ ہر نرالی بات بدعت ہے اور ہر بدعت  
گمراہی۔<sup>۲</sup>

من و قریب بدعۃ ف قد اعلن علی مقدم الاسلام<sup>۳</sup>

جس نے کسی بدعت ثابتے والے کی توقیر کی اس نے اسلام کو مقدم  
کرنے میں مدد وی۔<sup>۴</sup>

اسی سلسلے میں آپ کا نیا ارشاد بھی ہمیں لتا ہے کہ تمن آدمی خدا کو سے  
زیادہ ناپسند ہیں اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو:

مبتغ فی الاسلام سنۃ الجاملیۃ<sup>۵</sup>

اسلام میں جاہنیت کا کوئی طریقہ چلانا ہا ہے۔<sup>۶</sup>

## ۹۔ امر بالمعروف و نهى عن المنكر کا حق اور فرض

اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدة، جو اس کو صحیح راستہ پر قائم  
رکھنے کا ضامن تھا، یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ  
اس کا فرض بھی ہے کہ کلہ حق کے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا  
ملکت میں جماں بھی خلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی امکانی  
حد تک پوری کوشش صرف کروے۔ قرآن مجید کی ہدایات اس باب میں ہیں:

تعاونوا علی البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان۔<sup>۷</sup>

۱۔ مکلوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

۲۔ مکلوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

۳۔ مکلوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ

۴۔ (المائدہ: ۲)

نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَقُولُونَ لِلَّهِ وَقُولُوا قُلْوَاقُ لَهُ سَدِيدٌ۔ (الْأَحْزَاب: ۷۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈردا اور درست بات کرو۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَامِينَ بِالْقُسْطِ شَهِدُوا لِلَّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوْ  
أَوْالَدِينِ وَالْقَرِيبِينَ۔ (التساء: ۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے  
گواہی دینے والے بنو، خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے اپنے خلاف یا  
تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف پڑے۔

الْمُنْفَقُونَ وَالْمُنْفَقِتُ بِعِصْمِهِمْ مِنْ مِنْ بَعْضِهِمْ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَا عَنِ  
الْمَعْرُوفِ ..... وَالْمُوْمِنُونَ وَالْمُوْمِنَتُ بِعِصْمِهِمْ أَوْ لِيَاوَ بِعِصْمِهِمْ يَأْمُرُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبہ: ۶۱ - ۶۷)

منافق مرد اور عورتیں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، وہ براہی کا حکم دیتے  
اور بھلائی سے روکتے ہیں ..... اور مومن مرد اور مومن عورتیں  
ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے اور براہی سے روکتے  
ہیں۔

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ  
الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفْظُونَ لِحَدُودِ اللَّهِ۔  
نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کے حدود کی  
حفاظت کرنے والے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اس معاملہ میں حسب ذیل ہیں:  
عَنْ رَأْيِكُمْ مُنْكَرٌ فَلَيَغْيِرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يُسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ

يُسْتَطِعُ فِي قَلْبِهِ وَذَالِكَ الْمُضْعُفُ الْإِيمَانُ۔<sup>۱</sup>

تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہئے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایمانہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے (برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے) اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِ هُمْ خَلْوَفٍ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُوْمَرُونَ فَمِنْ جَاهِدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَالِكَ حَبَّةً خَرَدَلٌ مِنَ الْإِيمَانِ۔<sup>۲</sup>

پھر ان کے بعد تلاقوں لوگ ان کی جگہ آئیں گے۔ کہیں گے وہ پاتیں جو کریں گے نہیں اور کریں گے وہ کام جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ سے جدو جمد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس سے کم تر ایمان کا ذرہ برابر بھی کوئی درجہ نہیں ہے۔

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلْمَةُ عَدْلٍ (أَوْ حَقٍّ) عِنْدَ سُلْطَانِ جَاهِرٍ۔<sup>۳</sup>

”سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی (یا حق کی)

<sup>۱</sup> مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۰۔ ترمذی۔ ابواب الشن، باب ۱۲۔ ابو داؤد، کتاب الماجم، باب ۷۱، ابن ماجہ، ابواب الشن، باب ۲۰۔

<sup>۲</sup> مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۰

<sup>۳</sup> ابو داؤد، کتاب الماجم، باب ۷۱۔ ترمذی، کتاب الشن، باب ۱۲۔ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ۳۶۔ ابن ماجہ، ابواب الشن، باب ۲۰۔

بات کھٹا ہے۔

لَنِ النَّاسُ إِنَّا رَأَوْا الظُّلَامَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَىٰ يَدِيهِ اُو شَكَ لَنْ يَعْمَلُ اللَّهُ بَعْقَابًا مِّنْهُ<sup>۱</sup>

لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ کڈیں تو بعد نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام بھج دے۔

إِنَّهُ سَتَكُونُ بَعْدَىٰ أَمْرَاءُ مِنْ صَدَقَتْهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَاعْفَافِهِمْ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ فَلَيُسْعَىٰ مِنْهُ وَلَسْتُ مِنْهُ<sup>۲</sup>

میرے بعد کچھ لوگ حکران ہونے والے ہیں۔ جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔

سِيَكُونُ عَلَيْكُمْ أَثْمَةٌ يَعْلَكُونَ أَرْزَاقَكُمْ يَعْدِلُونَكُمْ فِي كَذِبِهِمْ وَيَعْمَلُونَ فِي سِيَقَنِ الْعَدْلِ لَا يَرْضُونَ مِنْكُمْ حَتَّىٰ تَحْسِنُوا قِبَحَهُمْ وَتَصْدِقُوا كَذِبَهُمْ فَاعْطِرُهُمْ الْحَقَّ مَا رَضْوَابِهِ فَإِذَا تَجَازَ دَافِعُهُمْ قُتْلٌ عَلَى ذَالِكَ فَهُوَ شَرِيدٌ<sup>۳</sup>

غتریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تماری روزی ہو گی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بے کام کریں گے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی برائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پھر تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔

<sup>۱</sup> ابو داؤد، کتاب الملام، باب ۷۱۔ ترمذی، کتاب النَّقْن، باب ۱۲

<sup>۲</sup> نبی، کتاب البیان، باب ۳۵-۳۶

<sup>۳</sup> سہرا العمال، ج ۶، ح ۲۹۷

پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔

هُن لِرْضِ سَلَطَانَا بِهَا يَسْخَطُ رَبَّهُ خَرَجَ مِن دِينِ اللَّهِ  
جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لئے وہ بات کی جو اس کے رب کو  
ناراض کر دے وہ اللہ کے دین سے کھل گیا۔

---

(۲)

## خلافت راشدہ

یہ ہیں وہ اصول حکمرانی جن پر دور رسالت ماب ﷺ میں حکومت کا نظام قائم ہوا اور چلا، نبی اکرم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت انہی اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی براہ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کس قسم کا نظام حکومت بننا چاہئے۔ اگرچہ آنحضرت ﷺ نے اپنی جائشی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تھا کرتا ہے۔ اس لئے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے پر اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لئے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافت راشدہ (راست رو خلافت) تواریخ دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز ہے۔

## انتحالی خلافت

نبی اکرم ﷺ کی جائشی کے لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نماں نہ رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لامع کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں

پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابو بکر رض نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمر رض کے حق میں دعیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے کہا:

”کیا تم اس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جائشیں ہمارا رہا ہوں؟ خدا کی حم میں نے رائے قائم کرنے کے لئے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمر بن الخطاب کو جائشیں مقرر کیا ہے، لہذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔“

اس پر لوگوں نے کہا ”ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔“<sup>۱۷</sup>

حضرت عمر رض کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ ”اگر عمر رض کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا، کیونکہ ابو بکر رض کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی اور آخر وہ کامیاب ہو گئی۔“<sup>۱۸</sup> حضرت عمر رض کو اس کی اطلاع ہوئی تو انسوں نے کہا کہ میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور ”عوام کو ان لوگوں سے خبردار کر دوں گا جو ان کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں۔“ چنانچہ مدینے پہنچ کر انسوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصے کا ذکر کیا اور بڑی تفصیل کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ کی سرگزشت بیان کر کے یہ بتلیا کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابو بکر رض کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس سلسلے میں انسوں نے فرمایا: اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو

<sup>۱۷</sup> الطبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۲، ص ۶۱۸، المہیعے الاستقامة، قاهرہ، ۱۹۳۹ء

<sup>۱۸</sup> اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمر رض نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اٹھ کر حضرت ابو بکر رض کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ”ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔“

اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیشیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بد لانا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہو تو اسے آنکھ دہ کرنے نظری نہیں ہایا جا سکتا۔ تم میں ابو بکر جیسی بلند دہ بالا اور مقبول شخصیت کا آدمی اور کون ہے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی، دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے۔<sup>۱</sup>

اپنے تصریح کردہ اسی قاعدے کے مطابق حضرت عمر رض نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک اتحادی مجلس مقرر کی اور فرمایا "جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ذہروتی امیر بنتے کی کوشش کرے اسے قتل کر دو۔" اس کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹے کو خلافت کے اتحاق سے صاف الفاظ میں مستثنی کر دیا تاکہ خلافت ایک موروثی منصب نہ بن جائے۔<sup>۲</sup> یہ اتحادی مجلس ان چھ اشخاص پر مشتمل تھی جو حضرت عمر رض کے نزدیک قوم میں سب سے زیادہ بالاثر اور مقبول عام تھے۔

۱۔ بخاری، "کتاب الحاربین" باب ۱۶۔ مسند احمد، ج ۱، حدیث نمبر ۳۹۱، طبع ۱۰، دارالعارف، مصر، ۱۹۷۹ء۔ مسند احمد کی اس روایت میں حضرت عمر رض کے الفاظ یہ ہیں: "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی۔" ایک اور روایت میں حضرت عمر رض کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ "جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لئے ان کا قول کرنا حلال نہیں ہے۔" (ابن حجر، "فتح الباری" ج ۲، مس ۲۵، المطبعة الحنفیہ، قاهرہ، ۱۳۲۵ھ)

۲۔ ابیری، ج ۲، ص ۲۹۲۔ ابن الاشیر، ج ۳، ص ۳۵، ۳۲، ادارے لطباعة المنیری، مصر، ۱۳۵۶ھ۔

اس مجلس نے آخر کار اپنے ایک رکن، عبدالرحمن بن عوف رض کو خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار دے دیا۔ انہوں نے عام لوگوں میں چل پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ تر کس شخص کی طرف ہے۔ حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا۔ اور اس استھواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمان رض کے حق میں ہیں۔<sup>۱</sup> اسی بنیاد پر حضرت عثمان رض خلافت کے لئے منتخب کئے گئے اور مجمع عام میں ان کی بیعت ہوئی۔

حضرت عثمان رض کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علی رض کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے کہا ”تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے وہی خلیفہ ہو گا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔“<sup>۲</sup> طبری کی روایت میں حضرت علی رض کے الفاظ یہ ہیں: ”میری بیعت خوبیہ طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہونی چاہئے۔“<sup>۳</sup>

حضرت علی رض کی وفات کے وقت لوگوں نے پوچھا کہ ہم آپ کے صاحزادے حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ آپ نے جواب میں کہا ”میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔“<sup>۴</sup> ایک شخص نے میں اس وقت جب کہ آپ اپنے صاحزادوں کو آخری وصیت کر رہے تھے، عرض کیا کہ امیر المؤمنین آپ اپنا ولی عہد کیوں نہیں مقرر کر دیتے۔

<sup>۱</sup> حوالہ مذکور، نیز ابن تیمیہ، الامامة والسياسة، ج ۱، ص ۲۳، مطبعة الفتوح، مصر، ۱۳۲۱ھ

<sup>۲</sup> ابن تیمیہ، ج ۱، ص ۲۱

<sup>۳</sup> الطبری، ج ۳، ص ۲۵

<sup>۴</sup> الطبری، ج ۳، ص ۱۱۲۔ المسعودی، مردوی الذهب، ج ۲، ص ۳۲، المطبعہ الابیہ، مصر، ۱۳۲۶ھ۔

جواب میں فرمایا "میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا تھا۔"<sup>۱</sup>

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحاب رسول اللہ ﷺ کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہئے۔ موروثی یا طاقت سے بر سر اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں صحیح نہ تھی۔

### شوریٰ حکومت

یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کئے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ سنن الداری میں حضرت میمون بن عمران کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملے میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے معاملے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور اگر سخت رسول اللہ ﷺ میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے مرکرده اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے، پھر جو رائے بھی سب کے مشورے سے قرار پاتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔<sup>۲</sup> یہی طرز عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔<sup>۳</sup>

مشورے کے معاملے میں خلفائے راشدین کا تصور یہ تھا کہ اہل شوریٰ کو پوری آزادی کے ساتھ انعامار رائے کرنے کا حق ہے۔ اس معاملے میں

<sup>۱</sup> المسعودی، ج ۲، ص ۲۲

<sup>۲</sup> سنن الداری، باب الفیاد ما فیه من اثارة۔

<sup>۳</sup> کنز العمال، ج ۵، ح ۲۲۸۱

خلافت کی پالیسی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس مشاورت کی انتہائی تقریب میں یوں بیان فرمایا ہے:

”میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لئے تکلیف دی ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو پار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی ہیدری کریں۔“<sup>۱</sup>

### بیت المال کے امانت ہونے کا تصور

بیت المال کو وہ خدا اور خلق (Public) کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے کو اور اس میں سے کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے۔ فرماندوں کی ذاتی اغراض کے لئے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جس روز خلیفہ ہوئے اس کے دوسرے دن کندھے پر کپڑے کے تھان رکھ کر بینچے کے لئے لگئے (خلافت سے پہلے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا) راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے اور انہوں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جواب دیا، ”اپنے بال بچوں کو کھاؤں سے کھاؤں انہوں نے کہا، اب آپ کے اوپر مسلمانوں کی سربراہ کاری کا پار آپڑا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ نہیں نہ ہو سکتا۔ چلے، ابو عبیدہ (ناائم بیت المال) سے مل کر بات کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ سے گفتگو کی گئی۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے مهاجرین میں سے ایک عام آدمی کی آمدی کا معيار سامنے رکھ کر ایک وظیفہ مقرر کئے دیتے ہیں جو نہ ان کے سب سے زیادہ دولت مند

کے برابر ہو گا نہ سب سے غریب کے برابر۔ اس طرح ان کے لئے ایک خلیفہ مقرر کر دیا گیا جو تقریباً "چار ہزار درہم سالانہ" تھا مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے ۸ ہزار درہم بیت المال کو واپس کر دیئے جائیں۔ یہ مال جب حضرت عمر رض کے پاس لا یا گیا تو انہوں نے کہا، "خدا ابو بکر رض پر رحمت فرمائے، اپنے بعد آنے والوں کو انہوں نے مشکل میں ڈال دیا۔"

حضرت عمر رض اپنی ایک تقریب میں بیان کرتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا کیا حق ہے:

"میرے لئے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ طال نہیں ہے کہ ایک جو زاد کپڑا گری کے لئے اور ایک جاڑے کے لئے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لئے لے لوں۔ پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے۔"

ایک اور تقریب میں وہ فرماتے ہیں:

"میں اس مال کے معاملہ میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ لیا جائے۔ حق کے مخالف دیا جائے اور باطل سے اس کو روکا جائے۔ میرا تعلق تمہارے اس مال کے ساتھ وہی ہے جو تم کے ولی کا تعلق ہے۔ اس مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔"

حضرت علی عليہ السلام کا جس زمانے میں حضرت معاویہ عليہ السلام سے مقابلہ درپیش تھا، لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ عليہ السلام لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطییے دے دے کر انہا ساتھی ہمارے ہیں آپ بھی بیت المال کامنہ کھولیں اور روپیہ بھاکر اپنے حای پیدا کریں۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ «کیا تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں؟»<sup>۱</sup>۔ ان سے خود ان کے بھائی حضرت عقیل عليہ السلام نے چاہا کہ وہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جنم میں جائے؟<sup>۲</sup>

### حکومت کا تصور

ان لوگوں کا تصور حکومت کیا تھا، فرمائزدا ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مقام اور اپنے فرائض کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے اور اپنی حکومت میں کس پالیسی پر عامل تھے، ان چیزوں کو انہوں نے خود خلافت کے نبرے تقریبیں کرتے ہوئے بر سر عام بیان کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکر عليہ السلام کی پہلی تقریب جو انہوں نے مسجد بنیوی میں عام بیعت کے بعد کی، اس میں وہ کہتے ہیں:

”میں آپ لوگوں پر حکمران بنا لایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بڑا آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے۔ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کے سجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے ان کے لئے دعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرکت پیدا

<sup>۱</sup> ابن الہبید، شرح نجح البلاعہ، ج ۱، ص ۱۸۲، دارالكتب العربیہ، مصر، ۱۴۲۹ھ

<sup>۲</sup> ابن حبیب، الامامة والسياسة، ج ۱، ص ۱۷۔

ہوئی۔ میں نے تو اسے پاول نخواستہ اس لئے قبول کیا ہے کہ مجھے  
مسلمانوں میں فتنہ اختلاف اور عرب میں فتنہ ارتاد برپا ہو جانے کا انذیریہ  
تھا۔ میرے لئے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بار  
عظیم ہے جو مجھے پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھے میں نہیں  
ہے، الایہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے  
کوئی اور یہ بار اٹھائے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحاب رسول  
اللہ میں سے کسی اور کو اس کام کے لئے جن لیں، میری بیعت آپ کے  
راستے میں حاکل نہ ہو گی۔ آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہ ﷺ کے معیار  
پر جانچیں گے اور مجھے سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضور اکرم ﷺ سے  
آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ شیطان سے  
محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں صحیک کام  
کروں تو میری مدد کجھے، اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجھے۔ سچائی  
امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے  
نزویک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے  
اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزویک کمزور ہے یہاں تک کہ  
میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے۔ کبھی ایسا نہیں ہو تاکہ کوئی  
قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر  
دے اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں جتلنا  
نہ کر دے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کا مطبع رہوں  
اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر

نہیں ہے۔ میں چیزوی کرنے والا ہوں، ”نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔“<sup>۱</sup>

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

”لوگو، کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی محیثت میں اس کی اطاعت کی جائے..... لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کئے دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج یا اللہ کے عطا کردہ میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے ان میں سے کچھ نہ لکھے مگر حق کے مطابق۔“<sup>۲</sup>

حضرت ابو بکرؓ جب شام و فلسطین کی حملہ پر حضرت عمرو بن العاص کو روانہ کر رہے تھے، اس وقت انہوں نے جو ہدایات ان کو دیں ان میں وہ فرماتے ہیں:

”اے عمرو، اپنے کھلے اور چھپے ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو اور اس سے حیا کرو، کیونکہ وہ تمہیں اور تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے..... آخرت کے لئے کام کرو اور اپنے ہر عمل میں خدا کی رضا کو پیش نظر رکھو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹوٹو اور ان کے ظاہر پر عی ان سے معاملہ کرو..... اپنے آپ کو درست رکھو۔ تمہاری رعیت بھی درست رہے گی۔“<sup>۳</sup>

<sup>۱</sup> الہبری، ج ۲، ص ۲۵۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۲، ص ۱۱۳۔ مطبعة مصطفی البالی، مصر، ۱۹۳۶ء۔ کنز العمال، ج ۵، احادیث نمبر ۲۲۶۲، ۲۲۶۸، ۲۲۷۸، ۲۲۹۱، ۲۲۹۹۔

<sup>۲</sup> ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۷۱۔

<sup>۳</sup> کنز العمال، ج ۵، ح ۵، ص ۲۳۱۳۔

حضرت عمرؓ جن لوگوں کو عامل بنا کر کمیں بھیجئے تھے ان کو خطاب کر کے کہتے: "میں تم لوگوں کو امت محمد ﷺ پر اس لئے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ یہاں میں اس لئے نہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو، لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تعقیب کرو۔" ۱۴

ایک مرتبہ انہوں نے برس رعایت اعلان کیا کہ ”میں نے اپنے عاملوں کو اس لئے  
شہیں بھیجا ہے کہ وہ تم لوگوں کو پہنچیں اور تمہارے مال چینیں، بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ  
تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے  
خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس ٹھائیت لائے، خدا کی حتم میں اس سے بدلہ لوں گا۔“  
اس پر حضرت عمر بن العاص (مصر کے گورنر) نے اٹھ کر کہا ”اگر کوئی شخص مسلمانوں  
کا دالی ہو اور تاویب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟“  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ”ہاں، خدا کی حتم میں اس سے بدلہ لوں گا۔ میں نے خود  
رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔“

ایک اور موقع پر حضرت عمر رضوی نے اپنے تمام گورنزوں کو جج میں طلب کیا اور  
جمع عام میں کہرے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی عالم کی شکایت  
ہو وہ پیش کرے۔ پورے جمع میں سے صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے عمر رضوی  
بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر بھے سو کوڑے گلوائے تھے۔  
حضرت عمر رضوی نے کہا اٹھو اور ان سے اپنا بدله لے لوب ہمرو رضوی بن العاص نے  
احتیاج کیا کہ آپ گورنزوں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ

۱۷۳، ج ۲، سال امیری

ابو يوسف، كتاب المراج، ص ١١٥ - مسند ابو داود، البهائى، حدیث نمبر ٥٥، ابن الاشترج ٣،  
ص ٣٠ - البریج ٣، ص ٢٧٣ -

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو خود اپنے آپ سے بدلہ دیتے دیکھا ہے، اے عصی اللہ اور اپنا بدلہ لے لے۔“ آخر کار عمرو بن العاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پینچھی بچانی پڑی۔<sup>۱</sup>

### قانون کی بالاتری

یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شری (مسلمان ہو یا ذی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔ قانیوں کو اگرچہ رئیس مملکت ہونے کی حیثیت سے وہی مقرر کرتے تھے، مگر ایک عصی قاضی ہو جانے کے بعد خود ان کے خلاف فیصلہ دینے میں بھی دیباںی آزاد تھا جیسا کسی عام شری کے معاملہ میں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن علی اور حضرت ابی ذہب بن کعب کا ایک معاملے میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زید بن علی کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا، مگر حضرت عمر بن علی کے ساتھ بیٹھے۔ پھر حضرت ابی ذہب نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمر بن علی نے دعوے سے انکار کیا۔ قاعدے کے مطابق حضرت زید بن علی کو حضرت عمر بن علی سے قسم لینی چاہئے تھی، مگر انہوں نے ان سے قسم لینے میں ناکام رکا۔ حضرت عمر بن علی نے خود قسم کھائی، اور اس مجلس کے خاتمہ پر کہا ”زید قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمر بن علی اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔“<sup>۲</sup>

ایسا ہی معاملہ حضرت علی بن علی کا ایک عیماں کے ساتھ پیش آیا جس کو انہوں نے کوفہ کے بازار میں اپنی گم شدہ زردہ بیچتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے امیر المؤمنین

<sup>۱</sup> ابو یوسف، کتاب المخراج، ص ۱۶

<sup>۲</sup> بیهقی، السن، الکبری، ج ۱۰، ص ۱۳۶، دائرة المعارف، حیدر آباد، طبع اول ۱۳۵۵ھ

ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی اس سے چھین نہیں لی۔ بلکہ قاضی کے پاس استغاثہ کیا اور چونکہ وہ کوئی شادت پیش نہ کر سکے۔ اس لئے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔<sup>۱</sup>

ابن خلکان کی روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں حضرت علیؓ اور ایک ذمی فریقین کی حیثیت سے قاضی شرع کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی نے انہوں کو حضرت علیؓ کا استقبال کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا ”یہ تمہاری پہلی بے انصاف ہے۔<sup>۲</sup>“

## عصبیتوں سے پاک حکومت

اسلام کے ابتدائی دور کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں تحریک اسلام کے اصول اور اس کی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ایک طوفان کی طرح انہوں کی ہوئی تھیں۔ مدعاوی نبوت کے ظہور اور ارتکاد کی تحریک میں یہی عامل سب سے زیادہ موثر تھا۔ سیبلہ کے ایک پیر کا قول تھا کہ ”میں جانتا ہوں کہ مسلمہ جھوٹا ہے، مگر ربیعہ کا جھوٹا مفتر کے پچھے سے اچھا ہے۔“<sup>۳</sup> ایک دوسرے مدعاوی نبوت ملیحہ کی حمایت میں نبی خلیفہ کے ایک سردار نے کہا تھا کہ ”خدا کی قسم، اپنے حلیف قبیلوں کے ایک نبی کی پیروی کرنا قریش کے نبی کی پیروی سے مجھ کو زیادہ

<sup>۱</sup> حوالہ مذکور

<sup>۲</sup> دیفات الاعیان، ج ۲، ص ۱۶۸، مکتبۃ النہجۃ المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۲۸ء

<sup>۳</sup> البری، ج ۲، ص ۵۰۸

محبوب ہے۔“<sup>۱۰</sup> اگر اس ماحول میں جب حضرت ابو بکر رض (۶۳۲-۶۳۳ء) اور ان کے بعد حضرت عمر رض (۶۳۴-۶۳۵ء) نے بے لائی اور غیر متصدیانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل، بلکہ غیر عرب نو مسلمانوں کے ساتھ بھی منصافانہ بر تاؤ کیا اور خود اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے سے قطعی مجتہب رہے۔ تو ساری عصبیتیں دب گئیں اور مسلمانوں میں وہ بین الاقوی روح ابھر آئی جس کا اسلام تقاضا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ان دونوں خلفاء کا طرز عمل درحقیقت مثالی تھا۔

حضرت عمر رض کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب کی یہ قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھرندہ جائیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر نکلنے بپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق مفہتمکو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے حضرت عثمان رض کے متعلق کہا ”اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ نبی ابی معیط (نبی امیر) کو لوگوں کی گردنوں پر سلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کر دیں گے۔ خدا کی نسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمان رض یہی کر دیں گے، اور اگر عثمان رض نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور مصیتوں کا ارتکاب کر دیں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمان رض کو قتل کر دیں گے۔“<sup>۱۱</sup> اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔ چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علی رض، حضرت عثمان رض اور حضرت سعد رض بن ابی وقاص کو بلا کر ہر ایک سے کہا کہ ”اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے

<sup>۱۰</sup> اینہا، ج ۲، ص ۲۸۷

<sup>۱۱</sup> ابن عبد البر، الاستیحاب، ج ۲، ص ۲۶۷، دائرۃ المعارف حیدر آباد، طبع دوم

کے لوگوں کو عوام کی گرفتوں پر سوار نہ کر دی۔<sup>۱</sup> مزید برآں چند آدمیوں کی اجتماعی شوری کے لئے انہوں نے جو بداعیات چھوڑ دیں ان میں دوسری شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی شامل کی کہ فتح ظیفہ سے عمد لیا جائے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برداشت نہ کرے گے۔<sup>۲</sup> مگر بدشی سے ظیفہ ہالٹ حضرت علیؓ (۶۵۵-۳۵ھ، ۶۵۵-۲۳۵ء) اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عمد میں نبی امیر کو کثرت سے بڑے بڑے عمدے اوزیبیت المال سے دلیفے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اے تجھی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ ان کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ”عمر خدا کی خاطر اپنے اقریاء کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقریاء کو رکھتا ہوں۔“<sup>۳</sup> ابو بکر و عمر بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خشنہ حال رہیں اور اپنے اقریاء کو بھی اسی حالت میں رکھیں۔ مگر میں اس میں صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں۔<sup>۴</sup> اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندریثہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف بھی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے، بلکہ قبائلیت کی دلی چنگاریاں پھر سلک اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام ہی کو پھوک کر رہا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علیؓ (۶۵۵-۳۵ھ، ۶۵۵-۲۳۰ء) نے پھر اسی معیار پر کام کرنے کی کوشش کی جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا۔ وہ قبائلی تعصب سے بالکل پاک تھے۔ حضرت معاویہ کے والد حضرت ابو سفیان نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت ان کے اندر اس تعصب کی روح کو آبھارنے

<sup>۱</sup> الہبری، ج ۳، ص ۲۶۳

<sup>۲</sup> ابن تیمیہ، الامانۃ والیاسۃ، ج ۱، ص ۲۵

<sup>۳</sup> الہبری ج ۳، ص ۲۹۱

<sup>۴</sup> کنز العمال، ج ۵، ج ۲۲۲

کی کوشش کی تھی، مگر انہوں نے یہ را انتیار کرنے بے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا تھا کہ ”قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی (ابو بکر رض) کیسے خلیفہ بن گیا، تم اُنھنے کے لئے تیار ہو تو میں وادی رض کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں۔“ مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ”تمہاری یہ بات اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور ہیادہ بے لاو۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں، خواہ ان کے دیار اور ان کے اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابو بکر رض کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس پر مأمور نہ ہونے دیتے۔“ اسی حضرت علی رض کا نقطہ نظر خلیفہ ہونے کے بعد بھی رہا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے تھیک اسلامی اصول کے مطابق عربی اور عجمی، شریف اور وضعی، ہاشمی اور غیر ہاشمی، سب کے ساتھ یکساں انصاف کا معاملہ کرنا شروع کیا اور کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ کے مقابلے میں ایسے ترجیحی سلوک سے نوازا پسند نہ کیا جو دوسرے گروہوں میں رشک در مقابلہ کے جذبات ایجاد کرنے والا ہو۔

### روح جمہوریت

اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہار رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے وہ خود اپنے اہل شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کی

۱- کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۷۔ ۲- الطبری، ج ۲، ص ۳۴۹ اہن عبد البر، الاستیعاب، ج ۲،

کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ ان کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔ آزادانہ فنا میں ہر شرک مجلس اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ تمام معاملات اہل حل و عقد کے سامنے بے کم و کاست رکھ دینے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا۔ فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رعب و اثر، یا کسی کے مفاد کی پاسداری، یا کسی جتہ بندی کی بنیاد پر۔ پھر، یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوری کے واسطے ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ براہ راست، ہر روز پانچ مرتبہ نماز پا جماعت میں، ہر ہفتے ایک دفعہ جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے اور ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انسیں نہ کرنے، ان پر تنقید کرنے اور ان سے محابہ کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اس آزادی کے استعمال کی وہ شخص اجازت ہی نہ دینے تھے، بلکہ اس کی نہت افراطی کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی پہلی ہی تقریر میں، جیسا کہ پہلے مذکور چکا ہے، علی الاعلان کہ دیا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو، اگر شیز ہا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ کسی شخص کو نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مربا نہیں کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک عورت نے انسیں دیکھ لیا کہ آپ کو ایسا حکم دینے کا حق نہیں ہے۔ قرآن، ذمیر سامال (قططار) صر میں دینے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً "اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔" ایک اور موقع پر بھرے مجمع میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ان سے محابہ کیا کہ

سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے، آپ نے دو چادریں کیسے لے لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے بیٹے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شادت پیش کر دی کہ دوسری چادر انہوں نے اپنے والد کو مستعار دی ہے۔<sup>۱</sup> ایک دفعہ اپنی مجلس میں انہوں نے لوگوں سے پوچھا، اگر میں بعض معاملات میں ڈھمل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے۔ حضرت بشر بن سعد نے کہا اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تب تو تم کام کے لوگ ہو۔<sup>۲</sup> سب سے زیادہ سخت تقدیروں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سابقہ پیش آیا اور انہوں نے کبھی کسی کا بندہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تقدیروں کے جواب میں بر سر عام اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں خوارج کی انتہائی بدزبانیوں کو بڑے فحشی کے دل سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک بر سر عام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دوں گا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بدزبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک وہ عملاء کو کی با غیانہ کارروائی نہیں کرتے، محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔<sup>۳</sup>

۱۔ اریاض النفرہ فی مناقب العترة، للمحب البری، جلد ۲، ص ۵۶، طبع مصر، بیرون الخطاب، لابن الجوزی، ص ۷۲۔

۲۔ سخن الشمال، ج ۵، ح ۲۲۱۳۔

۳۔ المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۱۲۵۔

خلافت راشدہ کا یہ دور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک روشنی کا پیغام تھا جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقیاء و محدثین اور عام دین دار مسلمان یہیں ریکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار رکھتے رہے۔

---

باب ۱۰

## اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد

- اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس میں اجتہاد کا مقام
- چند اعتراضات اور ان کا جواب
- قانون سازی، شوریٰ اور اجماع
- نظام اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں بین الاقوامی اسلامی مجلس نہاکہ کا اجتماع منعقد ہوا تھا جس میں مغربی مستشرقین اور اسلامی دنیا کے مفکرین نے شرکت کی تھی۔ اس اجتماع کی ایک نشست میں (منعقدہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۸ء) میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قانون سازی اور اجتہاد کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ چونکہ یہ مقالہ بھی اسلامی ریاست کے ایک اہم پہلو ۔۔۔۔۔ یعنی اس میں قانون سازی کے دائرہ عمل ۔۔۔۔۔ سے بحث کرتا ہے، اس لئے اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ مقالے کے اخیر میں وہ جوابات بھی شامل کئے جا رہے ہیں جو اس پر ایک "تجدد پسند" بزرگ کے اعتراضات کے سلسلہ میں مولانا مودودی نے دیے تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری بحثیں بھی پیش کی جاری ہیں جو تغیر قانون کے مسئلے سے ترمیٰ تعلق رکھتی ہیں۔

(۱)

## اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل

اور

## اس میں اجتہاد کا مقام

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل کیا ہے اور اس میں اجتہاد کا کیا مقام ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے دو باتیں واضح طور پر ہماری نگاہ میں رہیں۔

اول یہ کہ اسلام میں حاکیت خالصہ "اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے۔ قرآن عقیدہ توحید کی جو تشریع کرتا ہے اس کی رو سے خداۓ وحدہ لا شریک صرف مذہبی معنوں میں معبودی نہیں ہے بلکہ سیاسی اور قانونی مفہوم کے لحاظ سے حاکم، مطاع، امر و نهى کا بخوار اور واضح قانون بھی ہے۔ خدا کی اس قانونی حاکیت (Legal Sovereignty) کو قرآن اتنی ہی وضاحت اور اتنے ہی زور سے پیش کرتا ہے جس کے ساتھ اس نے خدا کی مذہبی معبودیت کا عقیدہ پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی یہ دونوں چیزیں اس کی الوہیت کے لازمی قابلے ہیں جن کو ایک دوسرے سے منفك نہیں کیا جاسکتا اور ان میں سے جس کا بھی انکار کیا جائے وہ لازماً خدا کی الوہیت کا انکار ہے۔ پھر وہ اس شبہ کے لئے بھی کوئی مجنوں نہیں چھوڑتا کہ شاید قانون خداوندی سے مراد قانون فطرت ہو۔ اس کے پر عکس وہ اپنی

ساری دعوت ہی اس بنیاد پر انجات ہے کہ انسان کو اپنی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے اس قانون شرعی کو تسلیم کرنا چاہئے جو اس نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اسی قانون شرعی کو مانتے اور اس کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانے کا ہم وہ "اسلام" (Surrender) رکھتا ہے اور صاف صاف الفاظ میں انسان کے اس حق کا اٹکار کرتا ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول نے کر دیا ہو ان میں وہ خود اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کرے:

وَمَا كَانَ لِمُوْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنٍ إِذَا قُضِيَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا إِنْ يَكُونَ لِرَبِّ الْخَيْرِ  
مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِي اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا۔

(الاذاب: ۳۶)

دوسری بات، جو اسلام میں اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ توحید اللہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کے آخری نبی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ حیز ہے جس کی بدولت توحید اللہ کا عقیدہ مجرد شخص سے ایک عمل نظام کی شکل اختیار کرتا ہے اور اسی پر اسلام کے پورے نظام زندگی کی عمارت تغیر ہوتی ہے۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ تعالیٰ کے تمام سابق انبیاء علیمِ السلام کی لاکی ہوئی تعلیمات، بہت سے اہم اشاؤں کے ساتھ، اس تعلیم میں جمع ہو گئی ہیں جو محمد ﷺ نے دی ہے، اس لئے خدا کی ہدایت اور تشریع کا مستحکم ماذک اب صرف یہی ایک ہے، اور آئندہ کوئی مزید ہدایت اور تشریع آنے والی نہیں ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ یہی محمدی تعلیم وہ بالآخر قانون (Supreme Law) ہے جو حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ قانون محمد ﷺ سے ہم کو ہوشکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن جو لفظ بلطف خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد ﷺ کا اسوہ حسنة، یا آپ ﷺ کی سنت، جو قرآن کے فتحاء کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد ﷺ خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ

اس کے مقرر کئے ہوئے رہنا، حاکم اور مسلم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریع کریں، اس کا صحیح نشانہ سمجھائیں، اس کے خلاف کے مطابق افراد کی تربیت کریں، پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک مسلم جماعت کی شکل وے کر معاشرے کی اصلاح کے لئے چد و چد کریں، پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صاف و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھلادیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ پورا کام جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ﷺ نے انجام دیا، وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تکمیل و تعمیل کرتی ہے اور اسی قانون برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے۔

### قانون سازی کا رو عمل

پاری انھر میں ایک آدمی ان بیوادی حقیقوں کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس صورت میں تو ایک اسلامی ریاست میں اسلامی قانون سازی کی سرے سے کوئی محجاشی نہیں ہے، کیونکہ یہاں تو قانون ساز صرف خدا ہے اور مسلمانوں کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس پیغمبر کے دینے ہوئے قانون خداوندی کی پیروی کریں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام قانون سازی کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے خدائی قانون کی پلاتری سے محدود کرتا ہے۔ اس پلاتر قانون کے تحت اور اس کے قائم کئے ہوئے حدود کے اندر، انسانی قانون ساز کا دائرہ عمل کیا ہے، اس کو میں یہاں مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

### تعیر احکام

انسانی زندگی کے معاملات میں سے ایک قسم کے معاملات وہ ہیں جن میں قرآن اور سنت نے کوئی واضح اور قطعی حکم دوا ہے، یا کوئی خاص قاعدة مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کوئی فقیہ، کوئی قاضی، کوئی قانون ساز ادارہ، شریعت کے

دیئے ہوئے حکم یا اس کے مقرر کئے ہوئے قاعدے کو نہیں بدل سکا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں قانون سازی کے لئے کوئی مجال کارہے ہی نہیں۔ انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل ان معاملات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے نجیک نجیک معلوم کیا جائے کہ حکم فی الواقع ہے کیا، پھر اس کا فشا اور مفہوم متعین کیا جائے اور یہ تحقیق کیا جائے کہ یہ حکم کن حالات اور واقعات کے لئے ہے۔ پھر عملاً "پیش آنے والے سائل پر ان کے انتباہ کی صورتیں اور بجمل احکام کی جزای تفصیلات ملے کی جائیں اور ان سب امور کے ساتھ یہ بھی شخص کیا جائے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام و قواعد سے ہٹ کر کام کرنے کی محفوظ کماں کس حد تک ہے۔

## قياس

دوسری حُکم کے معاملات وہ ہیں جن کے بارے میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے، مگر ان سے متعلق جلتے معاملات کے متعلق وہ ایک حکم دیتی ہے۔ اس دائرے میں قانون سازی کا عمل اس طرح ہو گا کہ احکام کی علتوں کو نجیک نجیک سمجھ کر ان تمام معاملات میں ان کو جاری کیا جائے گا جن میں وہ علتبیں فی الواقع پائی جاتی ہوں اور ان تمام معاملات کو ان سے مستثنی نہ کرایا جائے گا جن میں درحقیقت وہ علتبیں نہ پائی جاتی ہوں۔

## استنباط

ایک اور حُکم ان معاملات کی ہے جن میں شریعت نے متعین احکام نہیں بلکہ کچھ جامع اصول دیئے ہیں یا شارع کا یہ فٹا نکاہر کیا ہے کہ کیا چیز پسندیدہ ہے جسے فروع دینا مطلوب ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ ہے جسے مٹانا مطلوب ہے۔ ایسے معاملات میں قانون سازی کا کام یہ ہے کہ شریعت کے ان اصولوں کو اور شارع کے اس فٹاہ کو سمجھا جائے اور عملی سائل میں ایسے قوانین بنائے جائیں جو ان اصولوں پر

جنی ہوں اور شارع کے غشا کو پورا کرتے ہوں۔

### آزادانہ قانون سازی کا دائرہ

ان کے علاوہ ایک بہت بڑی قسم ان معاملات کی ہے جن کے بارے میں شریعت بالکل خاموش ہے، نہ براہ راست ان کے متعلق کوئی حکم دیتی ہے اور نہ ان سے ملتے جلتے معاملات ہی کے متعلق کوئی ہدایت اس میں ملتی ہے کہ ان کو اس پر قیاس کیا جاسکے۔ یہ خاموشی خود اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم اعلیٰ ان میں انسان کو خود اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق دے رہا ہے۔ اس لئے ان میں آزادانہ قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ قانون سازی ایسی ہونی چاہئے جو اسلام کی روح اور اس کے اصول عامہ سے مطابقت رکھتی ہو، جس کا مزاج اسلام کے مجموعی مزاج سے مختلف نہ ہو، جو اسلامی زندگی کے نظام میں صحیح صحیح نصب ہو سکتی ہو۔

### اجتہاد

قانون سازی کا یہ سارا عمل، جو اسلام کے قانونی نظام کو متحرک پاتا اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کو نشوونما دینا چلا جاتا ہے، ایک خالص علمی تحقیق اور عقلی کاوش ہی کے ذریعے سے انجام پاسکتا ہے اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں اجتہاد ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی تو ہیں "کسی کام کی انجام دہی میں انتہائی کوشش صرف کرنا۔" مگر اصطلاحاً اس سے مراد ہے "یہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کہ ایک مسئلہ زیر بحث میں اسلام کا حکم یا اس کا فشا کیا ہے۔" بعض لوگ غلطی سے اجتہاد کو بالکل آزادانہ استعمال رائے کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص جو اسلامی قانون کی نوعیت سے واقف ہے، اس غلط فہمی میں پسکتا کہ اس طرح کہ ایک قانونی نظام میں کسی آزاد اجتہاد کی بھی کوئی محدودیت ہو سکتی ہے۔ یہاں تو اصل قانون قرآن و سنت ہے۔ انسان جو قانون سازی کر سکتے ہیں وہ لازماً" یا تو اس اصل قانون سے ماغذہ ہونی چاہئے، یا پھر ان حدود کے اندر

ہوئی چاہئے جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دعا ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر جو اجتہاد کیا جائے وہ نہ اسلامی اجتہاد ہے اور نہ اسلام کے قانونی نظام میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے۔

## اجتہاد کے لئے ضروری اوصاف

اجتہاد کا مقصد چونکہ خدا کی قانون کو انسانی قانون سے بدلا نہیں بلکہ اس کو شیکھ سمجھنا اور اس کی رہنمائی میں اسلام کے قانونی نظام کو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ تحریک کرنا ہے، اس لئے کوئی صحت منداہ اجتہاد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے قانون سازوں میں حسب ذیل اوصاف موجود ہوں۔

- ۱- شریعت الٰہ پر ایمان، اس کے برحق ہونے کا یقین، اس کے اتباع کا ملخصانہ ارادہ، اس سے آزاد ہونے کی خواہش کا معدوم ہونا اور مقاصد، اصول اور اقدار کی دوسرے ماذن سے لینے کے بجائے صرف خدا کی شریعت سے لینا۔

- ۲- عربی زبان اور اس کے قواعد اور ادب سے اچھی واقفیت، کیونکہ قرآن اسی زبان میں نازل ہوا ہے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع بھی اسی زبان میں ہیں۔

- ۳- قرآن اور سنت کا علم جس سے آدمی نہ صرف جزوی احکام اور ان کے مواقع سے واقف ہو، بلکہ شریعت کے کلیات اور اس کے مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ اس کو ایک طرف یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انسان زندگی کی اصلاح کے لئے شریعت کی مجموعی اسکیم کیا ہے اور دوسری طرف یہ جانتا چاہئے کہ اس مجموعی اسکیم میں زندگی کے ہر شعبے کا کیا مقام ہے، شریعت اس کی تکمیل کن خطوط پر کرنا چاہتی ہے اور اس تکمیل میں اس کے پیش نظر کیا مصالح ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اجتہاد کے لئے قرآن و سنت کا وہ علم درکار ہے جو مفتر شریعت تک پہنچتا ہو۔

-۴۔ پہلے مجتہدین امت کے کام سے واقفیت، جس کی ضرورت صرف اجتہاد کی تربیت ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ قانونی ارتقاء کے تسلیم (Continuity) کے لئے بھی ہے۔ اجتہاد کا مقصود بہرحال یہ نہیں ہے اور نہیں ہونا چاہئے کہ ہر فلسفی مصلحتی نسلوں کی چھوڑی ہوئی تغیر کو ذھاکریا متردک قرار دے کرنے سے شروع کرے۔

-۵۔ عملی زندگی کے حالات و مسائل سے واقفیت، کیونکہ انہی پر شریعت کے احکام اور اصول و قواعد کو منطبق کرنا مطلوب ہے۔

-۶۔ اسلامی معیار اخلاق کے لحاظ سے عمدہ سیرت و کردار، کیونکہ اس کے بغیر کسی اجتہاد پر لوگوں کا اعتماد نہیں ہو سکتا اور نہ اس قانون کے لئے عوام میں کوئی جذبہ احترام پیدا ہو سکتا ہے جو غیر صالح لوگوں کے اجتہاد سے معاہدہ ہو۔

ان اوصاف کے بیان سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والے کو پہلے یہ ثبوت پیش کرنا چاہئے کہ اس میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی قانون کا نشوونما اگر صحیح خطوط پر ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ قانونی تعلیم و تربیت کا نظام ایسے اوصاف کے اہل علم تیار کرنے لگے۔ اس کے بغیر جو قانون سازی کی جائے گی وہ نہ اسلامی قانون کے نظام میں جذب ہو سکے گی اور نہ مسلم سوسائٹی اس کو ایک خوش گوارغذا کی طرح ہضم کر سکے گی۔

### اجتہاد کا صحیح طریقہ

اجتہاد، اور اس کی بنا پر ہونے والی قانون سازی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ اجتہاد کرنے والوں میں اس کی الیت ہو، اس طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ اجتہاد صحیح طریقے سے کیا جائے۔ مجتہد خواہ تغیر احکام کر رہا ہو یا قیاس و استنباط، بہرحال اسے اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور سنت ہی پر رکھنی

چاہئے۔ بلکہ مباحثات کے دائرے میں آزادانہ قانون سازی کرتے ہوئے بھی اسے اس بات پر دلیل لانی چاہئے کہ قرآن و سنت نے واقعی فلاں مخالفے میں کوئی حرم یا قاعدہ مقرر نہیں کیا ہے اور نہ قیاس ہی کے لئے کوئی بنیاد فراہم کی ہے۔ پھر قرآن و سنت سے جو استدلال کیا جائے وہ لازماً ”ان طریقوں پر ہونا چاہئے جو اہل علم میں مسلم ہیں۔ قرآن سے استدلال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک آیت کے وہ معنی لئے جائیں جن کے لئے عربی زبان کی لفت، قواعد اور معروف استعمالات میں مبنجاش ہو، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سبق سے لگتے ہوئے ہوں، جو اسی موضوع کے متعلق قرآن کے دوسرے بیانات سے متناقض نہ ہوں اور جن کی تائید سنت کی قولی اور عملی تشریحات سے بھی ملتی ہو، یا کم از کم یہ کہ سنت ان معنوں کے خلاف نہ ہو۔ سنت سے استدلال کرنے میں زبان اور اس کے قواعد اور سیاق و سبق کی رعایت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن روایات سے کسی مسئلے میں سند لائی جارہی ہو وہ قواعد علم روایت کے لحاظ سے معتبر ہوں۔ اس موضوع سے متعلق دوسری معتبر روایات کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہو، اور کسی ایک روایت سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکال لیا گیا ہو جو مستند ذرائع سے ثابت شدہ سنت کے خلاف پڑتا ہو۔ ان اختیاطوں کو ملاحظہ رکھے بغیر من مانی تاویلات سے جو اجتہاد کیا جائے اسے اگر سیاسی قوت کے مل پر قانون کا مرتبہ دے بھی دیا جائے تو نہ مسلمانوں کا اجتماعی ضریر اس کو قبول کر سکتا ہے اور نہ وہ حقیقتاً اسلامی نظام قانون کا جزو بن سکتا ہے۔ جو سیاسی قوت اسے نافذ کرے گی اس کے بہت ہی اس کا قانون بھی ردی کی نوکری میں پھینک دیا جائے گا۔

### اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے

کسی اجتہاد کو قانون کا مرتبہ حاصل ہونے کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس

کی بڑی شروع کر دیں، جس طرح مثلاً "قدح خنی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے قانون کے طور پر مان لیا۔ تیری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے، جیسے مثلاً عثمانی سلطنت نے قدح خنی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ سیاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا عجائز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے۔ ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں ہے۔ رہے گانیوں کے فعلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نالز ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کئے ہوں اور انہیں نظائر (Precedent) کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے، حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے بھی وہ فعلے اسلام میں قانون نہیں قرار پائے جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے۔ اسلامی نظام قانون میں قضاۃ کے بناۓ ہوئے قانون (Judge Made Law) کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے۔

---

(۲)

## چند اعتراضات اور ان کا جواب

اسلام میں قانون سازی اور اجتماعی کے موضوع پر میرے مقالے کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے گئے ہیں، میں یہاں ان کا جواب زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ دینے کی کوشش کروں گا۔

پہلا اعتراض اس پوزیشن پر ہے جو قرآن کے ساتھ سنت کو دیگنی ہے۔ اس کے جواب میں چند باتیں میں ترتیب وار عرض کروں گا مگر مسئلہ پوری طرح آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

۱۔ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد ﷺ نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اتفاق نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہدہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی، ایک نیا نظام تہذیب و تہدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوایہ دوسرے کام جو حضرت محمد ﷺ نے کئے، یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنانے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح محل ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجاۓ خود کوئی قانونی سند و جدت نہیں رکھتا۔ پہلی بات تعلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و جدت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے

قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد ﷺ صرف نامہ برخیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کئے ہوئے رہبر، حاکم اور مسلم بھی تھے جن کی ہیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام الٰی ایمان کے لئے نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنادینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ شخص ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتھا ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد ﷺ کو نمونہ واجب الایتاع اور ان کے امر و نبی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں، حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی بھی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ خداوند ﷺ کی تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے جعل کر سکتا ہے۔ جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد ﷺ صرف خلاوت قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ان کی حیثیت نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے ہانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت ﷺ کو بطور خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضور اکرم ﷺ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔

۳۔ سنت کو بجائے خداوند ﷺ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس مسئلے سے سابقہ نہیں پیش آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس قبل جو نبوت مبوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت پھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابل انکار ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور

محمد ﷺ کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے، اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے اور اس کے تمام اوارے اس ساری مدت میں ہیم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ لفڑ، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات، نظریہ حیات اور طریق حیات کے اعتبار سے جو گھری مہاذیت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا غیر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے ٹلاش کرنے کے لئے ہمیں اندر ہمارے میں ٹھوٹنا پڑ رہا ہو۔ دوسری تاریخی حقیقت، جو اتنی عی روشن ہے، یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی ہیم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنت ثابتہ کیا ہے اور کیا انی چیزان کے نظام حیات میں کسی جعلی طریقے سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ ان کے لئے سنت قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں فضیلے ہونے تھے اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں تک کے معاملات پلئے تھے، اس لئے وہ اس تحقیق سے بے پروا اور لا اپالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نہیں۔ بعد نسل میراث میں ملے ہیں اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔ ان دو حقیقوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی معالude کرے تو اسے کبھی یہ شہزادی نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لایخل معنہ ہے جس سے وہ دوچار ہو گیا ہے۔

۲۔ بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام

اور ارشادات کے معنی تھیں کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لئے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لئے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے مانتے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہو گا تو امت کے اہل علم سے یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوالے گا، اور جو بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہو گی وہ بہر حال نہ چل سکے گی۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی تفسیر اور سنن ثابتہ کے کسی مجموعے پر اپنے اجتماعی نظام کو قائم کیا ہے۔

دوسرा اعتراض میرے مقالے پر یہ کیا گیا ہے کہ میرے کلام میں تناقض ہے، یعنی میرا یہ قول کہ قرآن و سنت کے واضح اور قطعی احکام میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں ہے، مفترض کے نزدیک میرے اس قول سے تناقض ہے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام سے ہٹ کر کام کرنے کی محاجات اور اس کے موقع اجتہاد سے متعین کئے جاسکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس میں کیا تناقض محسوس کیا گیا ہے۔ اضطرار اور مجبوری کی حالت میں عام قاعدے سے استثناء دنیا کے ہر قانون میں ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی ایسی رخصتوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان مثالوں سے فقہاء نے وہ اصول متعین کئے ہیں جن کو رخصت کی حد اور اس کے موقع متعین کرنے میں ملحوظ رکھا جانا چاہئے۔ مثلاً "الضرورات تبيغ المحظوظات او الرعشة تجلب التيسير۔"

تیسرا اعتراض ان سب لوگوں پر کیا گیا ہے جنہوں نے یہاں اپنے مقالات میں اجتہاد کی کچھ شرائط بیان کی ہیں۔ چونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں اس لئے اس کا جواب میرے ذمہ بھی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ براہ کرم ایک دفعہ پر ان

شرطوں پر لگہ ڈال لجھے جو میں نے بیان کی ہیں اور بھرتائیے کہ آپ ان میں سے کس شرط کو ساقط کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ شرط کہ اجتہاد کرنے والوں میں شریعت کی عبودی کا خصانہ ارادہ پایا جاتا ہو اور وہ اس کے حدود کو توڑنے کے خواہش مند نہ ہوں؟ یا یہ شرط کہ وہ قرآن و سنت کی زبان، یعنی عربی سے واقف ہوں؟ یا یہ کہ انہوں نے قرآن و سنت کا کم از کم اس حد تک گمراہ ممالک کیا ہو کہ وہ شریعت کے نظام کو اچھی طرح سمجھے چکے ہوں؟ یا یہ کہ چھپلے مجتہدین کے کئے ہوئے کام پر بھی ان کی نظر ہو؟ یا یہ کہ وہ دنیا کے معاملات اور مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں؟ یا یہ کہ وہ بد کردار اور اسلامی معیار اخلاقی سے گرے ہوئے نہ ہوں؟ ان میں سے جس شرط کو بھی آپ غیر ضروری سمجھتے ہیں اس کی نشان دہی کرویں۔ یہ کہنا کہ ساری اسلامی دنیا میں دس بارہ آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں مل سکتے جو ان شرائط پر پورے اترتے ہوں۔ میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کے متعلق بہت ہی بری رائے ہے۔ غالباً ”ابھی تک ہمارے مخالفوں نے بھی ہم کو اتنا گرا ہوا نہیں سمجھا ہے کہ چالیس بچاں کروڑ مسلمانوں میں ان صفات کے اشخاص کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہو۔“ تاہم اگر آپ اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے کھونا چاہیں تو شوق سے کھول دیجئے؛ لیکن مجھے یہ بتائیے کہ جو اجتہاد بد کردار، بے علم اور مشتبہ نیت و اخلاص کے لوگ کریں گے اسے مسلمان پلک کے حق سے آپ کس طرح اڑوائیں گے؟

(۳)

## قانون سازی، شوریٰ اور اجماع

پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبے سے اسلامی قانون سازی کے متعلق مختلف خیالات کا انکھار کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوست اپنی الجھنوں کے لئے رقم طراز ہیں:

"اسلام میں قانون سازی کی حقیقت و ماهیت اور اس کے دائرہ عمل کے تین" میں بہت افراط و تغیریط سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کی سرے سے مجنباً نہیں نہیں ہے۔ قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بنادیا ہے۔ مسلمانوں کا کام اس پر عمل کرنا اور اسے نافذ کرنا ہے۔ دوسری طرف اپ کچھ لوگوں کے نزدیک قانون سازی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا بھی حق دے دیا گیا ہے کہ وہ عبادات سے متعلق نبی اکرم ﷺ کی مقرر کردہ تفصیلات تک میں ترمیم و تثنیخ کر سکتے ہیں۔ مثلاً "وہ نماز اور روزہ کی عملی شکلوں میں بھی حذف و اضافہ کر سکتے ہیں۔"

براه کرم اس کی وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں قانون سازی کے حدود اور اس کی مختلف نوعیتیں کیا کیا ہیں۔ نیز اسے بھی صاف کریں کہ خلفاء کے انفرادی اور شورائی فیصلوں اور آئمہ فقہاء و مجتهدین کی آراء کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلے میں اگر شوریٰ اور اجماع کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے تو مناسب ہے۔"

## جواب : (۱) قانون سازی کا اصول

اسلام میں دائرہ عبادات کے اندر قانون سازی کی قطعاً "کوئی مخالفت نہیں ہے۔ البتہ عبادات کے علاوہ معاملات کے اس دائرے میں قانون سازی کی مخالفت موجود ہے جس میں کتاب و سنت خاموش ہے۔ اسلام میں قانون سازی کی بنیاد یہ اصول ہے کہ عبادات میں صرف وہی عمل کرو جو ہتا دیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا طریقہ عبادت ایجاد نہ کرو اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کے پابند رہو، جس چیز سے روک دیا گیا ہے اس سے رک جاؤ اور جس چیز کے بارے میں شارع (اللہ اور اس کے رسول ﷺ) نے سکوت اختیار کیا ہے اس میں تم اپنی صواب دید کے مطابق کرنے کے لئے آزاد ہو۔" امام شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

"عبادات کا حکم عادات کے حکم سے مختلف ہے۔ عادات میں قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں گویا اپنی صواب دید پر کام کرنے کا اذن دے دیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے عبادات میں کوئی ایسی بات استنباط سے نہیں نکالی جاسکتی جس کی اصل شرع میں موجود نہ ہو، کیونکہ عادات کے بر عکس عبادات کا سر رشتہ حکم صریح اور اذن صریح سے بندھا ہوا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عادات میں فی الجملہ ہماری عقليں را صواب معلوم کر سکتی ہیں اور عبادات میں ہم خود عقل ہے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اللہ سے تقرب کا راستہ کون ہے۔" (جلد دوم، صفحہ ۱۱۵)

## (۲) قانون سازی کے چار شعبے

معاملات میں قانون سازی کے چار شعبے ہیں:-

الف۔ تعبیر، یعنی جن معاملات میں شارع نے امریا نہی کی تصریح کی ہے ان

کے پارے میں نص کے معنی یا ان کا فنا تعمین کرنا۔

ب۔ قیاس، یعنی جن معاملات میں شارع کا کوئی براہ راست حکم نہیں ہے، مگر جن سے لئے جلتے معاملات میں حکم موجود ہے، ان میں علت حکم مشخص کر کے اس حکم کو اس بنیاد پر جاری کرنا کہ یہاں بھی وہی علت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر یہ حکم اس سے مماثل واقعہ میں دیا گیا تھا۔

ج۔ استنباط و اجتہاد، یعنی شریعت کے بیان کردہ و سبع اصولوں کو جزوی مسائل و معاملات پر منتقل کرنا اور نصوص کے اشارات، دلالتوں اور اقتداءات کو سمجھ کر یہ معلوم کرنا کہ شارع ہمارے زندگی کے معاملات کو کس شکل میں ڈھالتا ہے۔

د۔ جن معاملات میں شارع نے کوئی ہدایت نہیں دی ہے ان میں اسلام کے وسیع مقاصد اور مصالح کو محوظ رکھ کر ایسے قوانین بنا جو ضرورت کو بھی پورا کریں اور ساتھ ساتھ اسلام کے مجموعی نظام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف بھی نہ ہوں۔ اس چیز کے فقهاء نے "مصالحہ مرسلہ" اور "التحسان" وغیرہ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مصالحہ مرسلہ کے معنی ہیں "وہ عمومی مصلحتیں جن کو ہماری صوابید پر چھوڑا گیا ہے اور احسان سے مراد یہ ہے کہ ایک معاملے میں بظاہر قیاس تو ایک حکم لگاتا ہے مگر عظیم تر دینی مصلحتیں ایک دوسرے حکم کا تقاضا کرتی ہیں، اس لئے پہلے حکم کے بجائے دوسرے حکم کو ترجیح دے کر جاری کیا جائے۔"

### (۳) مصالحہ مرسلہ اور احسان

تعیر، قیاس اور استنباط کے لئے تو کسی مزید تشريع کی ضرورت نہیں ہے، البتہ مصالحہ مرسلہ اور احسان پر ہم کچھ مزید روشنی ڈالیں گے۔ امام شاطی نے اپنی کتاب "الاعظام" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب لکھا ہے اور اس کی ایسی نہیں تشريع کی ہے جس سے بہتر اصول فقہ کی کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ اس میں وہ مفصل دلائل دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مصالحہ مرسلہ سے مراد قانون سازی کی بالکل کھلی چھوٹ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ

اس کے لئے تین شرطیں لازم ہیں:

- اول یہ کہ جو قانون اس طریقہ پر بنا�ا جائے وہ متعارف شریعت کے مطابق ہونہ کہ ان کے خلاف۔

دوم یہ کہ جب وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اس کو قبول کریں۔

تیسرا یہ کہ وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے، یا کسی حقیقی شکل کو رفع کرنے کے لئے ہو۔

(الاعظام جلد دوم صفحہ ۱۰۳)

پھر وہ احسان پر بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اگر ظاہر کسی دلیل کی بنا پر قیاس یہ چاہتا ہو کہ ایک معاملہ میں ایک خاص حکم لگایا جائے، مگر فقیرہ کی نگاہ میں وہ حکم مصلحت کے خلاف ہو یا اس سے کوئی ایسا نقصان یا حرج لازم آتا ہو جو اسلامی نقطہ نظر سے رفع کرنے کے لائق ہے پا وہ عرف کے خلاف ہو تو اسے چھوڑ کر دوسرا مناسب حکم لگا دینا احسان ہے۔ بہر حال احسان کے لئے شرط یہ ہے کہ ظاہر قیاس کو چھوڑ کر خلاف قیاس حکم لگانے کے لئے کوئی قوی تردید ہونی چاہئے جسے معقول دلائل کے ساتھ قابل لحاظ ثابت کیا جاسکے۔ (جلد دوم، صفحہ ۱۸۹)

### (۲) عدالتی فیصلوں اور ملکی قانون کا فرق

ان چار شعبوں کے متعلق کسی مجتهد یا امام کی انفرادی رائے اور تحقیق ایک ماہر انہ رائے اور تحقیق تو ہو سکتی ہے، جس کا وزن رائے دینے والے کی علمی شخصیت کے وزن کے مطابق ہو گا، مگر بہر حال وہ "قانون" نہیں بن سکتی۔ قانون بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مملکت اسلامیہ کے ارباب حل و عقد کی شوریٰ ہو، اور وہ اپنے اجماع سے یا جموروی فیصلے (یعنی اکثریت کے فیصلے) سے ایک تجیر، ایک قیاس، ایک استنباط و اجتہاد یا ایک احسان و مصلحت مرسلہ کو اختیار کر کے قانون کی شکل دے دیں۔ خلافت راشدہ میں قانون سازی کی بھی شکل تھی۔ ایمان میں چند

میں پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو گا کہ خلافت راشدہ میں قوی و ملی ضرورتیں پیش آنے پر قانون سازی کس طرح ہوتی تھی اور اس دور میں "قانون" اور عدالتی فیصلوں کے درمیان کیا فرق تھا۔

الف۔ شراب کے متعلق قرآن میں صرف حرمت کا حکم دیا گیا ہے، اس کے لئے سزا کی کوئی "حد" مقرر نہیں کی گئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اس کے لئے کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی گئی تھی، بلکہ آپ جس کو جیسی سزا مناسب سمجھتے تھے ویسے تھے۔ حضرت ابو بکر رض و عمر رض نے اپنے زمانے میں ۲۰ کوڑوں کی سزادی، لیکن اس کے لئے کوئی باقاعدہ قانون نہیں بنایا۔ حضرت عثمان رض کے زمانہ میں جب شراب نوشی کی شکایات زیادہ بڑھیں تو انہوں نے صحابہ کی مجلس شوریٰ میں معاملہ پیش کیا۔ حضرت علی رض نے ایک مختصر تقریر میں تجویز پیش کی کہ اس کے لئے ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کروی جائے۔ شوریٰ نے اس سے اتفاق کیا اور آئندہ کے لئے یہی قانون "اجماع" کے ساتھ بنا دیا گیا۔ (الاعتصام، جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۱)

ب۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قانون بھی بنایا گیا کہ کارگروں کو اگر کوئی چیز بنانے کے لئے دی جائے (مثلاً کپڑا بینے کے لئے یا سونا زیور بنانے کے لئے) اور وہ ضائع ہو جائے تو انہیں اس کی قیمت کا تاؤن دینا ہو گا۔ یہ فیصلہ بھی حضرت علی رض کی اس تقریر پر ہوا کہ اگرچہ کارگر کو اسی صورت میں بظاہر قابل الزام قرار نہیں دیا جاسکتا جب کہ چیز کے ضائع ہونے میں اس کی غفلت کا دخل نہ ہو، لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ کارگر لوگوں کی چیزوں کی حفاظت کرنے میں غفلت پرستے لگیں گے۔ اس لئے مصلحت کا تفاضل یہ ہے کہ انہیں ضامن قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ بھی اجماع سے ہوا۔

(ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۰۲)

نے حضرت عمر بن الخطاب نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ اگر ایک آدمی کے قتل میں چند آدمیوں نے شرکت کی تو وہ سب سے قصاص لیا جائے۔ امام مالک بن مسیح اور شافعی بن عیاش نے اس فیصلے کو قبول کیا ہے مگر اس کو "قانون" کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ ایک عدالتی فیصلہ تھا، شوریٰ میں اجماع سے یا جموروی رائے سے قانون نہیں بنایا گیا تھا۔ (ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۱۰)

و۔ معمود الخیر کی بیوی اگر عدالت کی اجازت سے نکاح ہاتھی کر چکی ہو اور پھر اس کا سابق شوہر آجائے تو آیا وہ پہلے شوہر کو ملے گی یا دوسرے شوہر کے پاس رہے گی؟ اس مسئلے میں خلافائے راشدین نے مختلف فیصلے کئے ہیں، مگر کسی فیصلے کو بھی "قانون" کی حیثیت حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس مسئلے کو شوریٰ میں پیش کر کے اجماع سے یا جموروی رائے سے کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ (ایضاً ج ۲ - ص ۱۳۶)

۳۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عدالتی فیصلوں کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انگریزی قانون میں ہے۔ انگریزی قانون میں جوں کے فیصلوں کی نظریں "قانون" کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں، مگر اسلام میں اگرچہ ایک نج کا وہ فیصلہ نافذ ضرور ہو گا جو اس نے کسی مقدمے میں نص کی ایک تعبیر اختیار کر کے، یا اپنے قیاس یا اجتہاد سے کیا ہو، لیکن اس کو ایک مستقل "قانون" کی حیثیت حاصل نہ ہو گی۔ بلکہ ایک یعنی نج ایک مقدمہ میں ایک فیصلہ دینے کے بعد یہ پھر کے لئے اپنے اس فیصلے کا پابند نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد اسی سے ملتے جلتے دوسرے مقدمے میں وہ دوسرا فیصلہ دے سکتا ہے اگر اس پر اپنی بھلی رائے کی غلطی واضح ہو چکی ہو۔

۴۔ خلافت راشدہ کے بعد جب شوریٰ کا نظام درہم برہم ہو گیا تو انہیں محمد بن عوف کے مختلف نظام مرتب کئے ان کو شرم قانونی حیثیت اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ ایک علاقے کے باشندوں کی عظیم اکثریت نے کسی ایک امام کی فقہ کو قبول کر لیا۔ مثلاً عراق میں امام ابو حیفہ بن علیہ کی فقہ، یا اندلس میں امام مالک بن مسیح کی فقہ،

یا مصر میں امام شافعی مطہر کی فتحہ وغیرہ۔ لیکن اس تعلیمیت عام نے کہیں بھی کسی فتحہ کو صحیح معنوں میں "قانون" نہیں بنایا۔ وہ قانون جہاں بھی نہیں ہے اس بنایا پر منی ہے کہ ملک کی حکومت نے اسے بطور قانون تسلیم کر لیا۔

### اجماع

اجماع کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعی مطہر کے نزدیک اجماع اس چیز کا نام ہے کہ "ایک مسئلے میں تمام اہل علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو۔" ابن جریر طبری اور ابو بکر راذی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی "اجماع" ہے۔ امام احمد مطہر جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ "ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے" تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلے میں اجماع ہے۔

یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ "اجماع" جماعت ہے۔ یعنی نص کی جس تعبیر پر، یا جس قیاس و اجتہاد پر، یا جس قانون مصلحت پر اجماع امت ہو گیا ہو اس کی پیروی لازم ہے لیکن اختلاف جس امر میں ہے وہ اجماع کا وقوع و ثبوت ہے نہ کہ بجائے خود اجماع کا جماعت ہونا۔ جہاں تک خلافت راشدہ کے دور کا تعلق ہے، چونکہ اس زمانے میں اسلامی نظام جماعت باقاعدہ قائم تھا اور شوریٰ پر نظام چل رہا تھا، اس لئے اس وقت کے اجتماعی اور جسموری فعلے تو معلوم اور معتبر روایات سے ثابت ہیں۔ لیکن بعد کے دور میں جب نظام جماعت درہم برہم اور شوریٰ کا طریقہ ختم ہو گیا تو یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا کہ کس چیز پر فی الحقیقت اجماع ہے اور کس چیز پر نہیں ہے۔ اسی بنایا پر خلافت راشدہ کے دور کا اجماع تو ناقابل انکار مانا جاتا ہے، مگر بعد کے دور میں جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں مسئلے پر اجماع ہے تو محققین اس کے اس دعوے کو رد کر دیتے ہیں اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس بات پر اجماع ہے اور کس بات پر نہیں ہے اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے۔

عام طور پر جو یہ مشور ہے کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ یا امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے اجماع کے وجود ہی کے مکرر تھے یا کسی دوسرے امام نے اس کا انکار کیا ہے، یہ سب کچھ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو اور پر بیان کی گئی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر اجماع ہے، در آنحال یہ کہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہ ہوتا، تو یہ لوگ اس کے اس دعوے کو مانتے سے انکار کرتے تھے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "جماع العلم" میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے یہ بتایا ہے کہ دنیا نے اسلام کے پہلی جانے اور جگہ جگہ اہل علم کے منتشر ہو جانے اور نظام جماعت درہم برہم ہو جانے کے بعد اب کسی جزوی مسئلے کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس میں تمام علماء کے اقوال کیا ہیں۔ اس لئے جزئیات میں اب اجماع کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ البتہ اسلام کے اصولوں اور اس کے ارکان اور بڑے بڑے مسائل کے بارے میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان پر اجماع ہے، مثلاً یہ کہ نماز کے اوقات پانچ ہیں، یا روزے کے حدود یہ ہیں وغیرہ۔ اسی بات کو امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"اجماع کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم پر تمام علماء مسلمین متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر تمام امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کو اس سے نکلنے کا حق نہیں رہتا، کیونکہ پوری امت کبھی خلافت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں اجماع ہے حالانکہ دراصل وہ نہیں ہوتا، بلکہ بہ اوقات دوسرا قول راجح ہوتا ہے۔"

(فتاویٰ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ ج ۱، صفحہ ۳۰۶)

ذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نص شرع کی کسی تعبیر پر، یا کسی قیاس یا استنباط پر، یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہل حل و

عقد کا اجماع، یا ان کی اکثریت کافیہ فی الواقع ہو جائے تو وہ جمٹ ہو گا اور قانون  
قرار پائے گا۔ اس طرح کافیہ اگر تمام دنیاۓ اسلام کے اہل حل و عقد کریں تو وہ  
تمام دنیاۓ اسلام کے لئے قانون ہو گا اور کسی ایک اسلامی مملکت کے اہل حل و  
عقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لئے تو قانون ہونا چاہئے۔

---

(۲)

## نظام اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

سوال : قرآن مجید میں ارشاد ہے :

بِإِيمَانِ الَّذِينَ أَطْعَمُوا أَهْلَهُ وَأَطْعَمُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِكَ الْأَمْرُ مِنْكُمْ جَنَاحٌ  
تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرِدُوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَوْبِيلًا۔<sup>۱</sup>

اسے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک اچھا طریقہ کار ہے اور انجام کے اضطرار سے بھی بہتر ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ نے تفسیم القرآن میں فرمایا ہے :

”وہ بات جو آیت زیر بحث میں مستقل اور قطعی ابھول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس منسلک پر بھی نزاع واقع ہو گی اس میں فیصلہ کے لئے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو

فیصلہ وہاں سے حاصل ہو گا اس کے سامنے سب سُرگلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کو بند اور مردح اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے منیز کرتی ہے۔“

آپ کی اس تشریع سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ سارے نزاکی امور میں آخری اور فیصلہ کن چیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام ہیں۔ اس ہمن میں ایک بحث یہ پیش آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات میں تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جس وقت کوئی اختلاف رائے ہوا اسی وقت رسول اکرم ﷺ کی طرف رجوع کر لیا، لیکن اب جب کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے درمیان موجود نہیں بلکہ صرف ان کی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں، اس وقت اگر اسلام کے کسی حکم کی تعبیر کا مسئلہ درپیش ہو تو ایک اسلامی نظام میں کس شخص یا ادارہ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار حاصل ہو گا کہ اس باب میں فتاویٰ شریعت کیا ہے۔ امید ہے آپ اس معاملہ میں رہنمائی فرمائے منون فرمائیں گے۔

### قرآن کی اصولی ہدایات

جواب : اس سوال میں جس بحث کا ذکر کیا گیا ہے اس کو رفع کرنے میں قرآن، سنت، دور صحابہ کا تعامل، عقل عام اور دنیا کا معروف طریق کار، سب مل جل کر ہماری مدد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کو دیکھیے۔ وہ اس معاملہ میں تین اصولی ہدایات رہتا ہے:

اول یہ کہ **فَسْأَلُوا الْأَهْلَ الذِكْرَ أَنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل الذکر سے پوچھ لو۔ (النحل ۳۳۔ الانبیاء ۷) اس آیت میں ”الْأَهْلُ الذِكْرُ“ کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ ”ذکر“ کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں مخصوص طور پر اس سبق کے لئے استعمال ہوا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی امت کو دیا ہو اور اہل الذکر صرف وہ لوگ ہیں جنہیں یہ سبق یاد ہو۔ اس لحاظ سے محس علم (Knowledge) مراد نہیں لیا جاسکتا، بلکہ اس کا اطلاق لازماً ”علم کتاب و سنت

عی پر ہو سکتا ہے۔ فذایہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ معاشرے میں مر جیت کا مقام ان لوگوں کو حاصل ہونا چاہئے جو کتاب اللہ کاظم رکھتے ہوں اور اس صلیتی سے باخبر ہوں جس پر چلنے کی تعلیم اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے۔

دوم یہ کہ وَإِذَا جَاءُهُمْ أَمْرٌ مِّنْ الْأَمْنِ أَوْ لِخُوفٍ أَذَا عَوَابٍ هُوَ لَوْرٌ دُوَّهٌ إِلَى الرَّسُولِ وَاللَّهُ أَوْلَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لِعِلْمِهِ الَّذِينَ يَسْتَبِطُونَهُ مِنْهُمْ "اور جب کبھی امن یا خوف سے تعلق رکھنے والا کوئی اہم معاملہ ان کو پیش آتا ہے تو وہ اس کا پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کو رسول نک اور اپنے اولی الامر تک پہنچاتے تو اس کی کہہ جان لیتے وہ لوگ جوان کے درمیان اس کی کہہ نکال لینے کی ملاحت رکھتے ہیں۔"

(النساء: ۸۳) اس سے معلوم ہوا کہ معاشرے کو پیش آنے والے اہم معاملات میں، خواہ وہ امن کی حالت سے تعلق رکھتے ہوں یا جنگ کی حالت سے، غیر اندیش ناک نوعیت کے ہوں یا اندریشاک نوعیت کے، ان میں صرف وہی لوگ مرجح ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اولی الامر ہوں، یعنی جن پر اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری عامکہ ہوتی ہو، اور جو "استنبطاً" کی ملاحت رکھتے ہوں، یعنی پیش آمدہ معاملے کی حقیقت بھی معلوم کر سکتے ہوں اور کتاب اللہ و طریق رسول اللہ سے بھی دریافت کر سکتے ہوں کہ اس طرح کی صورت حال میں کیا کرنا چاہئے۔ یہ آیت اجتماعی صورت اور معاشرے کے لئے اہمیت رکھنے والے معاملات میں عام اہل الذکر کے بجائے ان لوگوں کو مرجح قرار دیتی ہے جو اولی الامر ہوں۔ لیکن بہر حال ان کو بھی ہونا چاہئے اہل الذکر ہی میں سے، کیونکہ وہی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ جس قضیے سے ان کو سابقہ پڑا ہے اس میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی قولی و عملی ہدایات کو نگاہ میں رکھ کر صحیح رائے قائم کر سکیں۔

سوم یہ کہ امرہم شورٰ بینہم "ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔" (الشوری: ۳۸) یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا آخری فیصلہ کس طرح ہونا چاہئے۔

ان تین اصولوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو تمام زراعات میں فرد وہ الہ اللہ

والرسول کا فشا پورا کرنے کی عملی صورت یہ سامنے آتی ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی میں عموماً جو مسائل پیش آئیں ان میں وہ "اہل الذکر" سے رجوع کریں اور وہ انسین ہتا ہیں کہ ان معاملات میں خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔ رہے ہے مملکت اور معاشرے کے لئے اہمیت رکھنے والے مسائل، تو وہ اولی الامر کے سامنے لائے جائیں اور وہ باہمی مشاورت سے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کریں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی رو سے کیا چیز زیادہ سے زیادہ قرین حق و صواب ہے۔

### عبد رسالت ﷺ میں رفع نزاع کا طریقہ

اب دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عهد مبارک میں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں عمل و رآمد کیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں جو معاملات براہ راست آپ تک پہنچتے تھے۔ ان میں تو اللہ اور رسول ﷺ کا نشانہ ہاتھے اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکت اسلامیہ میں پھیلی ہوئی آبادی کو جو معاملات پیش آتے تھے وہ سب کے سب براہ راست حضور اکرم ﷺ تک نہیں پہنچائے جاتے تھے اور نہ آپ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپ کی طرف سے مسلمین مأمور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے کس طریقہ کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، حاصل اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے دائرہ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے فرد وہ اللہ و رسول کا فشاء پورا کرنے کا جو طریقہ حضور اکرم ﷺ نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت معاذ بن جبل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذا اللی یعنی فقال كيف  
تقضی قال اقضی بما فی كتاب اللہ قال فان لم يكن فی كتاب اللہ قال

فَبَسْتَهُ رَسُولُ اللَّهِ قَالَ فَبَلَى لَمْ يَكُنْ فِي سَنَةِ رَسُولِ اللَّهِ قَالَ اجْتَهِدْ  
رَائِئِيْهِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَقَرَسُولُ رَسُولِ اللَّهِ

(ترمذی، ابواب الاحکام۔ ابو داؤد، کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہے۔ عرض کیا پھر جو سنت رسول اللہ میں ہو۔ فرمایا اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی نہ ہے۔ عرض کیا میں اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا شکر ہے اس خدا کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں شوریٰ کے نظام کی بنا بھی ڈال دی تھی اور ہر ایسے معاملے میں جس کے متعلق آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نہ ملا ہو۔ آپ معاشرے کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ مشاورت ہے جو آنحضرت ﷺ نے اس مسئلے پر فرمائی تھی کہ لوگوں کو نماز کے اوقات پر جمع کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور جس کے نتیجے میں بالآخر اذان کا طریقہ آپ ﷺ نے مقرر فرمایا۔

### خلافت راشدہ کا تعامل

قریب قریب یہی طریقہ کا رغمہ رسالت ﷺ کے بعد خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ فرقہ صرف یہ تھا کہ عہد رسالت میں حضور اکرم ﷺ خود موجود تھے اس لئے معاملات کا آخری فیصلہ آپ سے شخصاً حاصل کیا جا سکتا تھا اور بعد کے دور میں مرحق آپ کی ذات نہ رہی بلکہ وہ روایات ہو گئیں جو آپ ﷺ کی سنت کے متعلق لوگوں کے پاس محفوظ تھیں۔ اس دور میں تین ادارے الگ الگ پائے جاتے تھے

جو اپنے اپنے مقام و موقف کے لحاظ سے فرد وہ الی اللہ والرسول کا فشا پورا کرتے تھے۔

۱۔ عام اہل علم جو کتاب اللہ کو جانتے تھے اور جن کے پاس رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں یا حضور اکرم ﷺ کے طرق عمل یا حضور اکرم ﷺ کی تقریر<sup>۱</sup> کے بارے میں کوئی علم موجود تھا۔ ان سے صرف عوام الناپس ہی اپنی زندگی کے معاملات میں فتوے نہیں لیتے تھے بلکہ خود خلفائے راشدین کو بھی جب کسی مسئلے کا فیصلہ کرنے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی حکم دیا ہے یا نہیں، تو انہی لوگوں کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ خلیفہ وقت نے علم نہ ہونے کی وجہ سے ایک مسئلے کا فیصلہ اپنی رائے سے کر دیا ہے اور بعد میں جب معلوم ہوا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی دوسری بات حضور ﷺ سے ثابت ہے تو اس فیصلے کو بدل دیا ہے۔ ان اہل علم کی موجودگی کا فائدہ صرف یہی نہ تھا کہ فردا "فردا" وہ عوام اور اولی الامر کے لئے ایک ذریعہ علم کا کام دیتے تھے، بلکہ ان کا عظیم تر فائدہ یہ تھا کہ مجموعی طور پر وہ اس بات کی صفات تھے کہ کوئی عدالت اور کوئی حکومت اور کوئی مجلس شوریٰ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کی مضمون رائے عام نظام اسلامی کی پشت پناہ تھی۔ ہر خلاط فیصلے کو ٹوکنے کے لئے ان کا چونکا رہنا نظام کے صحیح چلنے کا خاص منصب تھا۔ کسی مسئلے میں ان کا اتفاق رائے اس بات کی دلیل تھا کہ اس مسئلہ خاص میں دین کی راہ متعین ہے جس سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اور ان کا اختلاف رائے یہ معنی رکھتا تھا کہ اس مسئلے میں دو یا زیادہ اقوال کی متجانش ہے اگرچہ فیصلہ ایک ہی قول پر ہو چکا ہو۔ ان کی موجودگی میں

<sup>۱</sup> تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں کوئی عمل کیا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کو برقرار رہنے دیا ہو۔

یہ ممکن نہ تھا کہ امت کے اندر کوئی بدعت قول عام حاصل کر لے جائے، نہ کہ ہر طرف دین کے جانے والے لوگ اس پر گرفت کرنے کے لئے موجود تھے۔

۲۔ قضاۓ یعنی عدیہ جس کے مقابلے کی وضاحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شرع کے ہام اپنے ایک فرمان میں اس طرح کی ہے:

اقضى ما فى كتاب الله فان لم يكن فى كتاب الله فبستة رسول الله صلى الله عليه وسلم فان لم يكن فى كتاب الله ولا فى سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فاقضى بما قضى به الصالحون فان لم يكن فى كتاب الله ولا فى سنة رسول الله ولم يقضى به الصالحون فان شئت فتقديم وإن شئت فتأخر ولا ارى التأخير الا خيرا لك والسلام عليكم

(التسائل، کتاب آداب القضاۓ)

فیصلہ اس حکم پر کرو جو کتاب اللہ میں ہو، اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت پر، اگر نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تو پھر صالحین نے جو فیصلے کئے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کرو۔ لیکن اگر کسی معاملے کا حکم نہ کتاب اللہ میں ملا ہو اور نہ سنت رسول اللہ میں اور نہ صالحین کے فیصلوں میں اس کے متعلق کوئی نظیر موجود ہو تو تمیں اختیار ہے چاہے خود پیش قدی کرو یا رک جاؤ، اور میرے نزدیک رک جانا تمہارے لئے زیادہ مہتر ہے۔

۱۔ رک جانے سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ قاضی کچھ دریں اس بات کا انتظار کرے کہ کوئی دوسری عدالت پیش قدی کر کے اس طرح کے ایک معاملے میں نظیر قائم کرتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ قاضی خود فیصلہ کرنے کے بعد اسے اس معاملے میں اس تیرے ادارے کی طرف رجوع کرے جس کا ذکر ہے آرہا ہے۔

اسی مطالبے کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قد اتی علینا زمان ولسنا نقضی ولسنا هنالک ثم ان اللہ عزوجل قدر  
علینا ان بلغنا ما ترون فعن عرض له منكم قضاء بعد الیوم فليقض بما  
فی کتاب اللہ فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ فليقض بما قضی به نبیه  
صلی اللہ علیہ وسلم فليقض بما قضی به الصالحون فان جاء امر لیس  
فی کتاب اللہ ولا قضی به نبیه صلی اللہ علیہ وسلم ولا قضی به  
الصالحون فليجتهد رایہ ولا يقول انس اخاف وانس اخاف فان الحلال بین  
والحرام بین وبين ذالک امور مشتبهات فدع ما يریبک اللہ ما لا یریبک۔

(التسائی، کتاب نذکور)

وہ زمانہ گزر چکا ہے جب ہم نہ فیصلہ کرتے تھے اور نہ ہماری یہ خیثت  
تحی کر فیصلے کریں (یعنی سرکار رسالت ماب ملکہ کا دور) اب تقدیرِ الہی  
سے ہم اس حالت کو پہنچے ہیں جو تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ پس اب تم میں  
سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لئے پیش ہو تو اسے چاہئے کہ  
کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر کوئی ایسا معاملہ آجائے جس کا  
حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا فیصلہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلے کے مطابق  
کرے اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی  
اکرم ﷺ نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس  
کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آجائے جو نہ کتاب اللہ میں  
ہو، نہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلوں میں اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی  
اس کا فیصلہ کیا ہو، تو اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری  
کوشش کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں، سکیوں کے  
حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح اور ان دونوں کے درمیان کچھ

امور مشتبہ ہیں، سو مشتبہ امور میں آذی کو وہ فیصلہ کرنا چاہئے جو اس کے ضمیر کو نہ سکھلے اور ایسا فیصلہ کرنے بے پرہیز کرنا چاہئے جس کے متعلق خود اس کے ضمیر میں لکھک ہو۔

یہ عدیلہ صرف عوام ہی کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی بلکہ انظامیہ (Executive) کے خلاف بھی وہ لوگوں کے دعاویٰ سنتی اور ان کے فیصلے کرتی تھی۔ اس کے سامنے حاضر ہونے سے نہ کوئی گورنر ٹشٹی تھا نہ خود خلیفہ وقت۔ اسی طرح انظامیہ کے بڑے سے بڑے شخص، حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو بھی اور خود حکومت کو بھی اگر کسی کے خلاف کوئی ذاتی یا سرکاری دعویٰ ہوتا تھا تو اسے عدالت میں جانا ہوتا تھا اور عدالت ہی یہ طے کرتی تھی کہ خدا اور رسول کے قانون کی رو سے اس کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔

۳۔ اولی الامر، یعنی خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ۔ یہ وہ آخری باختیار ادارہ تھا جو قرآن کی ہدایت کے مطابق باہمی مشورے ہے یہ نظر کرتا تھا کہ معاشرے اور مملکت کو پیش آنے والے مختلف معاملات میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے کیا حکم ثابت ہے اور کسی معاملے کا حکم کتاب و سنت میں نہیں ہے تو اس کے بارے میں کون سا طرز عمل دین کے اصول اور اس کی روح اور جماعت مسلمین کی مصلحت کے لحاظ سے اقرب الی الصواب ہے۔ اس ادارے کے بکھر فیصلے احادیث و آثار اور فقہ کی کتابوں میں مستہد رائج سے نقل ہوئے ہیں اور انہوں نیشنر کے ساتھ وہ تفصیلی بحثیں بھی منقول ہوئی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت صحابہ کی مجلس میں ہوئی تھیں۔ ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ پوری سختی کے ساتھ جس قاعدہ کلیے کی پابندی کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اگر اس طرح کا کوئی معاملہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور اپنی صواب دید پر صرف اس صورت میں فیصلہ کیا جائے

جب کہ یہ دونوں مأخذ ہدایت خاموش ہوں۔ جس معاملے میں بھی اللہ کی کتاب سے کوئی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کوئی نظر ان کو مل گئی ہے، اس میں بھی انہوں نے اس سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ پورے دور صحابہ میں اس قاعدے کے خلاف ایک مثال بھی ہم کو نہیں ملتی۔ اگرچہ "عما" مملکت میں آخری فیصلے کے اختیارات اولی الامری کو حاصل تھے، لیکن "قانون" وہ قرآن اور سنت۔ رسول اللہ ﷺ کو آخری فیصلہ کن سند تعلیم کرتے تھے اور مسلم معاشرہ بھی ان کے اقتدار کی اطاعت اسی اطمینان و اعتماد کی بناء پر کرتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں قرآن و سنت کی پیروی سے تجاوز نہ کریں گے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ وہم و گمان نک نہ تھا کہ وہ نص قرآن کے خلاف کوئی قانون بنانے یا حکم دینے کے مجاز ہیں۔ اسی طرح کسی کے حاشیہ خیال میں بھی اس تصور نے کبھی راہ نہیں پائی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے کے صاحب امر تھے اور ہم اپنے زمانے کے صاحب امر ہیں، ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے دور حکومت میں جو احکام دیئے ہوں ان کے نظائر کی پیروی کریں۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا ادارہ جس روز وجود میں آیا اسی روز خلیفہ اول نے اپنے خطبہ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ:

اطیعونی ما اطاعت اللہ ورسوله فآن عصیت اللہ ورسوله فلا طاعة لى  
عليکم

میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میرے لئے کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔

اس اعلان سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خلافت کا یہ ادارہ قائم ہی اس معاہدے پر ہوا تھا کہ خلیفہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور امت خلیفہ کی اطاعت کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں امت پر خلیفہ کی اطاعت اس شرط

کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی عیروی کرے گا۔ اس شرط کے تحت ہوتے ہی امت پر سے غیغہ کی اطاعت کا فریضہ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا تھا۔

## عقل عام کا تقاضا

اس کے بعد ذرا عقل عام سے کام نہ لے کر دیکھئے کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث کا فٹا کیا ہے اور اس کے قاضیے عملاً کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت پورے مسلم معاشرے کو خطاب کر کے اسے علی الترتیب تین اطاعتوں کا ملزم قرار دیتی ہے۔ پہلے خدا کی، پھر رسول اللہ ﷺ کی، پھر ان اولی الامر کی جو خود اس معاشرے میں سے ہوں۔ اور نزاعات کے بارے میں ہدایت کرتی ہے کہ فیصلے کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس سے آیت کا جو فٹا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے پر اصل اطاعت خدا اور رسول کی واجب ہے، اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ نزاع صرف عوام کے درمیان ہی نہیں عوام اور اولی الامر کے درمیان بھی ہو سکتی ہے، اور نزاع کی تمام صورتوں میں آخری فیصلہ کن اقتدار اولی الامر کا نہیں بلکہ خدا اور رسول اللہ ﷺ کا ہے، ان کا جو حکم بھی ہو اس کے آگے عوام کو بھی سرجھ کا دینا چاہیے اور اولی الامر کو بھی۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ فیصلہ کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا خود سامنے موجود ہو اور اس کے حضور مقدمہ پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے، بلکہ اس سے مراد خدا کی کتاب سے یہ معلوم کرتا ہے کہ معاملہ تنازع نیہ میں اس کا حکم کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ذات رسول سے براہ راست رجوع کیا جائے، بلکہ لامحالہ اس کا مطلب بھی بھی ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے قول و عمل سے ہدایت حاصل کی جائے۔ یہ بات تو خود حضور ﷺ کی زندگی میں بھی ممکن نہ تھی کہ

عدن سے لے کر تبوک تک، اور بحرین سے لے کر جدے تک ساری مملکت اسلامیہ کا ہر باشندہ اپنے ہر معاملے کا فیصلہ براہ راست حضور ﷺ سے کرتا ہو۔ اس زمانے میں بھی سنت رسول علیہ السلام کا مأخذ ہونا چاہئے تھا۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ نزاعات میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے فیصلہ حاصل کرتے گی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ انسان ہی دیں گے، کتاب اور سنت خود تو نہیں بولیں گے۔ لیکن لا محالہ یہ انسان وہی ہونے چاہیں جن کے پاس کتاب و سنت کا قابل اعتماد علم ہو۔ اور کتاب و سنت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے بہر حال نزاع کے فریقین خود نہیں ہو سکتے، ان کے سوا کوئی تیرا غیر جانب دار شخص یا اوارہ ایسا ہونا چاہئے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اب یہ بات نزاعات کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کس قسم کی نزاع میں فیصلہ دینے کے لئے کون موزوں ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کی نزع الی ہے جس کا فیصلہ ہر ذی علم آدمی کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نزاع لازماً ایک عدالت چاہتی ہے۔ اور بعض نزاعات اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے الی ہیں کہ ان کا حصہ فیصلہ اولی الامر کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مگر ان سب صورتوں میں فیصلے کا مأخذ کتاب و سنت ہی کو ہونا چاہئے۔

یہ وہ بات ہے جو عقل عام کی مذہب سے آیت کے الفاظ پر خور کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کے ذہن میں کوئی انج ہستینگ نہ ہو۔ اب ایک نظریہ بھی دیکھ لیجئے کہ دنیا کا معروف طریقہ اس آیت کے تجویز کردہ نظام اور اس کی عملی صورت کے سمجھنے میں ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ دنیا میں آج قانون کی حکومت کا بوجھے میں ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لئے قانون کی پالاتری ناگزیر ہے جس کے آگے بڑے اور چھوٹے سب یکساں ہوں اور جسے عالمی اور حاکم اور خود حکومت پر بے لائگ طریقے سے نافذ کیا جائے۔ اس قانون کو چاہے ایک پارلیمنٹ ہی بنائے، مگر جب وہ قانون بن جائے تو جب تک

وہ قانون یہ ہے خود پارلیمنٹ کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے۔ اس حاکیت قانون کے نظریے کو جماں بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے وہاں لازماً ”چار چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:

ایک، ایسا معاشرہ جو قانون کا احترام کرنے والا ہو اور اس کی پیروی کا حقیقی ارادہ رکھتا ہو۔

دوسرے، معاشرے میں بکھرت اپنے لوگوں کا پایا جانا جو قانون کو جانتے ہوں، لوگوں کو قانون کی پیروی میں مددوے سکتے ہوں۔ اور جن کا مجموعی علم اور رسوخ و اثر اس بات کا ضامن ہو کہ نہ معاشرہ قانون کی راہ سے ہٹ سکے اور نہ سیاسی اقتدار کو اس سے ہٹنے کی جرات ہو سکے۔

تیسرا، ایک بے لائی عدیہ جو عوام اور حاکم اور حکومت کی باہمی نزاعات میں قانون کے مطابق صحیک صحیک فیصلے کرے۔

چوتھے، ایک بلند ترین اختیارات رکھنے والا ادارہ جو معاشرے کو پیش آنے والے تمام مسائل و معاملات کا آخری حل تجویز کرے اور وہی حل معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔

ان حقوق کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کی ذیر بحث آیت دراصل اسلامی معاشرے میں قانون کی فرماؤائی ہی قائم کرتی ہے اور اس پر عمل درآمد کے لئے وہی چار چیزوں درکار ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ وہ جس قانون کی فرماؤائی قائم کرتی ہے وہ فی الواقع اس کا مستحق ہے اور دنیا میں جن قوانین کی بالاتری قائم کی جاتی ہے وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ خدا اور رسول ﷺ کے قانون کو بالاتر قانون قرار دیتی ہے جس کے آگے سب کو سرتلیم ختم کر دینا چاہئے اور جس کے تابع ہونے میں سب مکمل ہوں۔ اس کا مخاطب ایک ایسا معاشرہ ہے جو اس قانون پر ایمان لائے اور اپنے قلب و غیر کے تقاضے سے اس کی اطاعت کرے۔ اس کا نشان پورا کرنے کے

لئے ضروری ہے کہ معاشرے میں اہل الذکر کی ایک کثیر تعداد پاکی جاتی ہو جن کی مدد سے افراد معاشرہ اپنی زندگی کے معاملات میں ہر جگہ ہر وقت اس بالاتر قانون کی رہنمائی حاصل کرتے رہیں اور جن کے ذریعہ سے رائے عام اس نظام کی حفاظت کے لئے ہمیشہ بیدار رہے۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک نظام عدالت موجود ہو جو عوام ہی کے درمیان نہیں بلکہ عوام مور ان کے حاکموں کے درمیان بھی بالاتر قانون کے مطابق فیصلے کرے اور وہ اولی الامر کے ایک ایسے ادارے کی طالب بھی ہے جو خود اس بالاتر قانون کا تابع ہو اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کے لئے اس کی تغیری و تعبیر اور اس کے تحت اجتہاد کے آخری اختیارات استعمال کرے۔

---

باب ॥

## چند دستوری اور سیاسی مسائل

- اسلامی ریاست کے چند پہلو
- خلافت و حاکیت
- ملکی سیاست میں عورتوں کا حصہ
- ذمیوں کے حقوق
- چند متفق مسائل

مولانا مودودی ” نے ان مختلف دستوری سیاسی (نظری) مسائل پر دلیل ” فوٹو ” روشنی ڈالی ہے جو ملک میں دستوری بحث کے دوران پیدا ہوئے۔ ان میں کچھ مسائل کی تدقیقی فسادات لاہور کی تحقیقاتی عدالت کے سامنے کی گئی تھی اور کچھ کی تشریع قرار دیا اور اخباری بیانات میں اور کچھ کی تحریری سوال و جواب کے ذریعہ۔ دیسے تو ان مسائل کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے چند اہم سوالات اور ان کے جوابات کو ہم ذیل میں مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔

مرتب

(۱)

## اسلامی ریاست کے چند پہلو

### (الف) لا دینی جمہوریت، تھیا کریں اور اسلامی ریاست

اسلامی ریاست، جس کا قیام اور فراغ ہمارا نصب العین ہے، نہ تو مغربی اصطلاح کے مطابق مذہبی حکومت (Theocracy) ہے اور نہ جمہوری حکومت (Democracy)۔ بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک الگ نوعیت کا نظام سیاست و تہذیب ہے۔ جو ذہنی انگلیخانی آج کل مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں "اسلامی ریاست" کے تصور کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ دراصل ان مغربی اصطلاحات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں جو لازماً اپنے ساتھ مغربی تصورات اور اپنے پیچھے مغرب کی تاریخ کا ایک پورا سلسلہ بھی ان کے ذہن کے سامنے لے آتی ہیں۔ مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے:

۱۔ خدا کی بادشاہی قانونی حاکیت (Legal Sovereignty) کے معنی ہیں اور

۲۔ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر خدا کی اس بادشاہی کو قانونی اور سیاسی حیثیت سے عملہ نافذ کرے۔

ان دو تصورات پر ایک تیرے امر واقعی کا بھی وہاں اضافہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجلی کی اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی قانونی پدایت نہ چھوڑ کر نہیں گئے اور یہٹ پال نے شریعت کو لعنت قرار دے کر عیسائیوں کو

اکام توارہ کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اب اپنی عبارت "معاشرت" معاملات اور سیاست وغیرہ کے لئے یہ مائوں کو قوانین و احکام کی جو ضرورت پیش آئی اسے ان کے مذہبی پیشواؤں نے اپنے خود ساختہ احکام سے پورا کیا اور ان احکام کو خدا کی احکام کی حیثیت سے منوایا۔ اسلام میں اس مذہبی حکومت (Theocracy) کا صرف ایک جز آیا ہے اور وہ ہے خدا کی حاکیت کا عقیدہ۔ اس کا دوسرا جز اسلام میں قطعاً نہیں ہے۔ رہا تیرا جز، تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے اور اس کی تشرع کے لئے نبی اکرم ﷺ کی ایسی قولی اور عملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے میز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو مأخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی قیسہ، امام، ولی یا عالم کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول فعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چران لیا جائے اب صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) کہنا قطعاً غلط ہے۔

دوسری طرف مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت (Democracy) کہتے ہیں وہ بھی دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے۔  
 ۱۔ عوام کی قانونی اور سیاسی حاکیت جو عوام کی اکثریت، یا ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملًا ظہور میں آئے اور  
 ۲۔ ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جزو کو لیتا ہے۔ رہا پلا جزو، تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے قانونی حاکیت اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرتا ہے جس کے احکام (خواہ وہ کتاب اللہ میں ہوں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں) ریاست کے لئے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاسی حاکیت کو "حاکیت" کے بجائے

"خلاف" (یعنی اللہ، حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلم بائشندوں کے حوالے کر رہا ہے۔ یہ خلاف مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملًا ظہور میں آئے گی۔ اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جموریت (Democracy) کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

### (ب) اسلام میں قانون سازی

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام جس نوعیت کی ریاست ہاتا ہے اس میں ایک مجلس قانون ساز (Legislature) کی موجودگی ضروری ہے جو مسلم عوام کے معتمد علیہ نمائندوں پر مشتمل ہو اور جن کے اجماع یا اکثریت کے فیصلے دار الاسلام میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوں۔ اس مجلس (Legislature) کی ترکیب، اس کے کام کا ضابطہ اور اس کے ارکان کے انتخاب کا طریقہ اسلام میں مقرر نہیں کیا گیا ہے، اس لئے ہر زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے اس کی الگ شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو باقاعدہ اصولاً" طے کر دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

- ۱۔ ریاست کا کام مشورے سے چلا یا جائے۔
- ۲۔ فیصلے یا تو اجماع (اتفاق رائے) سے ہوں یا جمور (اکثریت) کی رائے کے مطابق۔
- ۳۔ قرآن و سنت کے خلاف کوئی فیصلہ اجماع سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔
- ۴۔ قرآن و سنت کے احکام کی جس تعبیر پر اجماعی یا جموروی فیصلہ ہو جائے وہ ملک کا قانون قرار پائے۔
- ۵۔ جن امور میں قرآن و سنت کا کوئی نحیم موجود نہ ہو ان میں مسلم عوام کے نمائندے خود قانون بنائے ہیں اور ان کا اجتماعی یا جموروی فیصلہ نافذ ہو گا۔

۶۔ اس امر کا کوئی موزوں انظام ہونا چاہئے کہ افرا و ریاست کے درمیان، یا حکومت اور عوام کے درمیان یا عوام اور مجلس قانون ساز کے درمیان یا حکومت کے عقلاً شجوں اور اجزاء کے درمیان جو نزاع بھی ہو اس کا فیصلہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں کیا جاسکے۔

### (ج) اسلامی ریاست کیوں؟

پاکستان کو اس طرح کی ایک ریاست بنانے کے لئے ہمارا مطالبہ بہت سے معقول وجہ پر بُنی ہے جن میں سے اہم ترین وجہ تمن ہیں۔ ایک یہ کہ یہ میں ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور ہم ہرگز اپنے ایمان میں تخلص نہیں ہو سکتے اگر آزادی اور اختیارات پانے کے بعد بھی ہم اس قرآن اور اب رسول کے احکام کو نافذ نہ کریں جس کے برحق ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام کا مطلبہ ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جس میں خدا اور رسول کے احکام جاری ہوں اور اسی تمنا کے پیچھے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں اور عزتیں اور جائیدادیں قربان کیں۔ تیسرا یہ کہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم الشان اکثریت چاہتی ہے کہ ان کی قوی ریاست ایک اسلامی ریاست ہو اور اکثریت کی مرضی کو بہر حال نافذ ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے ضرور ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے نظریات کو برحق سمجھتے ہیں اور ان کے لئے اسلامی ریاست کے تحلیل سے اپنے ذہن کو مانوس کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ نیز پاکستان کی ملازمتوں میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جن کی ساری ذہنی و عملی تربیت مغربی طرز کا نظام حکومت چلانے ہی کے لئے ہوئی ہے اور انہیں اسلامی ریاست کا نظام آتے دیکھ کر طرح طرح کے خدشات لاحق ہو رہے ہیں۔ مگر ان کے لئے مناسب یہی ہے کہ جو چیز ہوئی اور شدہ ہے اس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابق بنائیں جس طرح ان کے بزرگوں نے انگریزی دور کی آمد پر اپنے آپ کوئئے دور کے مطابق بنایا تھا۔

ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو جموریت کا بوا شیدائی ظاہر کرتے ہیں۔ اب یہ سوچنا ان کا اپنا کام ہے کہ چند لوگوں یا خاندانوں کی سولت کی خاطر ایک الی چین کی مزاحمت کرنا کہاں تک صحیح ہے جسے باشندگان ملک کی اکثریت چاہتی ہو۔

### (د) اسلامی ریاست میں ذمیوں کی حیثیت

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت کے متعلق عدالت میں جو سوالات چھینگئے گئے ہیں ان کے جوابات سلسلہ وار حسب ذیل ہیں:

(الف) اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو اسلامی اصطلاح میں "ذی" کہا جاتا ہے۔ ذی کوئی گالی نہیں ہے اور نہ یہ لفظ شودر اور لمپھے کا ہم معنی ہے۔ ذمہ عمل زبان میں (Guarantee) کو کہتے ہیں اور ذی وہ شخص ہے جس کے حقوق ادا کرنے اور محفوظ رکھنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہو۔ اسلامی حکومت یہ ذمہ شخص اپنی طرف سے یا مسلم باشندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسول کی طرف سے لیتی ہے اور اس کی اہمیت اس درجے کی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کا قتل عام بھی کر دala جائے تو ہم انتقاماً "اپنے ملک میں اس کے ہم ذمہب ذمیوں کا بال تک پہنچانا نہیں کر سکتے۔ ایک اسلامی حکومت میں کوئی پارلیمنٹ ان کے شرعاً حقوق غصب کرنے کی صرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔

(ب) ذمیوں کی تین قسمیں ہیں۔ اول "وہ جو کسی معاهدے کے ذریعہ سے اسلامی حکومت کے تابع ہوئے ہیں۔ دوم، وہ جو بیزور شمشیر فتح ہوئے ہوں۔ سوم، وہ جو نہ مفتوح ہوں اور نہ جن سے کوئی باقاعدہ معاهدہ ہی ہوا ہو۔ پہلی قسم کے ذمیوں سے اس معاهدے کے مطابق برتاو کیا جائے گا جو ان سے طے کیا گیا ہو۔ دوسری قسم کے ذمیوں کو وہ حقوق دیئے جائیں گے جو شریعت میں اہل ذمہ کے لئے مقرر کئے ہیں۔ رہے تیسرا قسم کے ذی، تو انہیں بہر حال دوسری قسم والوں کے حقوق تو دیئے ہی جائیں گے، اور مزید ایسے حقوق بھی ہم ان کو دے سکتے ہیں جو اسلامی اصولوں سے نہ مگراتے ہوں اور جنہیں دنیا ہم اپنے حالات کے لحاظ سے

مناسب سمجھیں۔

(ج) ذمیوں کے کم سے کم حقوق جو شریعت میں مقرر کئے گئے ہیں، یہ ہیں: نہب کی پوری آزادی۔ نہبی تعلیم کی اجازت۔ نہبی لڑپھر طبع اور شائع کرنے کی اجازت۔ قانون کے حدود میں نہبی بحث کی آزادی۔ معابد کی حفاظت۔ پرنسل لاء کی حفاظت۔ جان و مال اور عزت کی حفاظت۔ دیوانی اور فوجداری قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ پوری مساوات۔ حکومت کے عام برماؤ میں ذمی اور مسلم رعایا کے درمیان عدم احتیاط۔ معاشی کاروبار کے ہر میدان میں مسلمانوں کی طرح یکساں مواقع۔ حاجت مند ہونے کی صورت میں مسلمان کی طرح ذمی کا بھی بیت المال سے مدد پانے کا انتحقاق۔ یہ حقوق اسلامی ریاست صرف کاغذ ہی پر نہیں دیتی۔ بلکہ وہ اپنے دین و ایمان کی رو سے عملًا نہیں ادا کرنے پر مجبور ہے قطع نظر اس سے کہ غیر مسلم ریاستیں مسلمانوں کو کاغذ پر کیا حقوق دیتی ہیں اور عملًا کیا۔

(د) ذمیوں کو صرف امصار مسلمین میں نئے معابد بنانے سے روکا گیا ہے۔ البتہ اگر ان کے پرانے معابد وہاں موجود ہوں تو ان کی حفاظت اور مرمت کر سکتے ہیں۔ امصار مسلمین سے مراد وہ شریں ہیں جو مسلمانوں نے خاص اپنے لئے آباد کئے ہوں، جیسے کوفہ اور بصرہ اور فسطاط۔ باقی رہے ملک کے دوسرے شراؤر قبے اور دیہات، تو ان کو وہاں نئے معابد تعمیر کرنے اور پرانے معابد کی مرمت کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔

(ه) ذمیوں پر لباس وغیرہ کے متعلق جن قوود کا ذکر بعض فقیہی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ اس سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ دراصل یہ تین قسم کی قوود تھیں جو پہلی دوسری صدی ہجری کے فقیہاء نے حالات و ضروریات کے لحاظ سے عاید کی تھیں۔

پہلی قسم کی قوود وہ تھیں جن میں ذمیوں کو فوجی وردی استعمال کرنے سے روکا گیا تھا۔ مسلمانوں کو اس چیز سے اس لئے نہیں روکا گیا کہ ہر بالغ مسلمان مرد کے

لئے اس وقت فوجی خدمت لازمی تھی اور ذمی اس سے مستثنی تھے۔

دوسری قسم کی قیود وہ تھیں جن میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے اور غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مشابہ بنشے سے روکا گیا تھا، کیونکہ اس طرح کے تشبیہ میں بہت سی قبائلیں ہیں۔ اس میں اندیشہ ہے کہ حقیقی تندیب کے مصنوعی اختلاط سے ایک دوغلی تندیب پیدا ہو جائے گی۔ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی غالبے سے مرعوب ہو کر غیر مسلموں میں وہ غلامانہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی جن کی وجہ سے مغلوب قوم اپنے لباس اور اپنی معاشرت میں غالب قوم کی لفظ اتارنے لگتی ہے۔ اسلام اس طرح کی ذہنیت کو کسی کافر میں بھی پرورش ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی لئے غیر مسلموں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تندیب و معاشرت اور اپنے مذہب کی خصوصیات کو محفوظ رکھیں اور مسلمانوں کی رلیس نہ کریں۔ چنانچہ فتح خنی کی مشہور کتاب بداع الحسنات میں یہ حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

ان اهل الذمة يوخذون باظها رعلامات يعرفون بها ولا يتركون يتشبهون  
بال-Muslimين في لباسهم (جلد ۷۔ ص ۱۱۳)

اہل ذمہ کو ایسی علامات اور نشانیاں رکھنے کا پابند کیا جائے گا جن سے وہ پہچانے جائیں اور ان کو اپنے لباس میں مسلمانوں کے مشابہ بنشے سے روکا جائے گا۔

علاوہ بریں اس میں قانونی چیزیں گیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے شراب پینا، رکھنا اور بیچنا فوج داری جرم ہے اور ذمیوں کے لئے یہ جرم نہیں ہے۔ اب اگر ایک مسلمان ذمیوں کے مشابہ لباس پہنے تو وہ پولیس کے موافقہ سے فتح سکتا ہے، اور اگر ایک ذمی مسلمانوں کے مشابہ بن کر رہے تو وہ پولیس کی گرفت میں آسکتا ہے۔

تیسرا قسم کی قیود اس وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے عائد کی گئی تھیں۔ اس وقت سندھ سے لے کر اپنی تک بہت سے ممالک مسلمانوں کی تکوار

سے مفتوح ہوئے تھے اور قدرتی طور پر ان سب ملکوں کی آبادی میں سابق حکمران طبعوں کے ایسے کثیر التعداد لوگ موجود تھے جن میں انہا کھویا ہوا اقتدار داہیں لینے کا دم داعیہ تھا۔ مسلمانوں نے دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ان طبعوں کو نہ تھے نہیں کیا تھا، بلکہ ذمی بنا کر محفوظ و مامون کر دیا تھا۔ مگر بہر حال سیاسی صالح کی بنا پر ان کو کچھ نہ کچھ دبا کر رکھنا ضروری تھا، تاکہ وہ پھر سر اٹھانے کی ہمت نہ کریں۔ اس لئے ان کو اپنی سواریوں اور اپنے لباس اور دوسرے لوازم معاشرت میں وہ شان دکھانے سے روک دیا گیا جس سے ان کے دور حکمرانی کی یاد تازہ ہوتی ہو۔ اس طرح کے احکام و قوی تھے نہ کہ ابدی۔ اور یہ احکام چاہے فقہ کی کتابوں ہی میں لکھے گئے ہوں، مگر یہیں یہیں کے لئے تمام اہل ذمہ پر ان کو چھپاں نہیں کیا جاسکتا۔

(و) اسلامی حکومت میں کوئی غیر مسلم صدر ریاست، وزیر، سپر سالار، قاضی اور ایسے کلیدی مناصب کا حامل نہیں بن سکتا جہاں وہ حکومت کی پالیسی میں حصہ دار ہو سکے۔ اس کی وجہ کوئی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایک نظریے پر بنتی ہے اور اس میں یہ مناصب ایسے ہی شخص کو دیے جاسکتے ہیں جو اس نظریے کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور اس کی صحت و صداقت پر ایمان رکھتا ہو۔ اسلامی حکومت چونکہ خلوص اور ایمان داری پر قائم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی غیر مسلم رعایا میں بھاڑے کے ٹوٹوں کی ذہنیت کرتی ہے کہ اگر تم ہمارے نظریے اور اصولوں کو صحیح سمجھتے ہو تو ان کی صداقت کا علاویہ اقرار کرو، تمہارے لئے حکمران جماعت میں شامل ہونے کے موقع کھلے ہوئے ہیں۔ اور اگر تم ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو محض پیٹ اور جاہ طلبی کی خاطر اس نظام کو چلانے اور فردوغ دینے کے لئے نہ آؤ جسے عقیدہ تا "تم فلاد سمجھتے ہو۔

(ر) ہمارے لئے یہ سوال قطعاً "کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ غیر مسلم حکومتیں

اپنے دائرہ اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں اور کیا نہیں کرتی۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس پر اپنے ملک میں عمل کریں گے اور دوسرے جس چیز کو حق سمجھیں اسے عمل میں لانے کے لئے وہ آزاد ہیں۔ آخر کار ہمارا اور ان کا مجموعی طرز عمل دنیا کی رائے عام پر کے سامنے واضح کر دے گا کہ ہم کیا ہیں اور وہ کیا۔ ہم بہرحال یہ مکاری نہیں کر سکتے کہ اپنے دستور کے صفات پر غیر مسلموں کو سارے نمائشی حقوق دے دیں مگر عملاً ان کی وہ حالت بنا کر رکھیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی، امریکہ میں جیشوں اور ریڈ افٹین قبائل کی اور روس میں غیر اشتراکی لوگوں کی ہے۔ رہایہ سوال کہ کیا ایسی حالت میں غیر مسلم اقلیتیں اسلامی حکومت کی وفاداری میں کر رہے رکھیں گی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وفاداری اور ناوفاداری دستور کے چند لفظوں سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس مجموعی برداشت سے پیدا ہوتی ہے جو حکومت اور اکثریت اپنی ذری اثر اقليتوں کے ساتھ عملاً اختیار کرے۔

#### (ھ) مرتد کی سزا اسلام میں

عدلت میں مرتد کی سزا کا مسئلہ بھی چھیڑا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی انتہائی سزا قتل ہے۔ اگر کوئی کہنا چاہے ہے کہ ایسا نہ ہو ناچاہیے تو یہ بات کہنے کا اسے اختیار ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ اسلام میں فی الواقع ایسا کوئی قانون نہیں ہے، تو وہ یا تو اسلامی قانون سے ناواقف ہے یا پھر (شماتت ہماری) سے شرعاً کر اپنے دین کے ایک حکم پر پودہ ڈالتا ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے میں لوگوں کو جو الجھنیں ہمیشہ آتی ہیں ان کے کمی وجود ہیں۔

اول یہ کہ وہ اسلام بھیت مذہب اور اسلام بھیت ریاست کا فرق نہیں سمجھتے اور ایک کا حکم دوسرے پر چپا کرنے لگتے ہیں، حالاں کہ ان دونوں جیشوں اور ان کے احکام میں فرق ہے۔

دوم یہ کہ وہ موجودہ حالات کو نگاہ میں رکھ کر اس حکم پر خور کرتے ہیں جب کہ غیر مسلم حکومتوں ہی میں نہیں، خود مسلمانوں کی اپنی حکومتوں میں بھی غیر اسلامی

تعلیم اور غیر اسلامی تہذیب کے غلبے سے مسلمانوں کی نئی نسلوں میں بکھرنا لوگ  
گراہ ہو کر اٹھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک صحیح اسلامی حکومت موجود ہو تو اس کا  
اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام اسہاب کا سد باب کرے جن سے کوئی مسلمان  
واقعی اسلام سے غیر مطمئن اور ارتداو پر آمادہ ہو سکتا ہو۔ جہاں اسلامی حکومت  
اپنے حقیقی فرائض انجام دے رہی ہو وہاں تو غیر مسلمون کا کفر پر مطمئن رہنا بھی  
مشکل ہے، کجا کہ ایک مسلمان اثاث اسلام سے غیر مطمئن ہو جائے۔

سوم یہ کہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مسلم سوسائٹی ہی وہ چنان ہے  
جس پر اسلامی ریاست کا قصر تغیر ہوتا ہے اور اسی چنان کے استحکام پر ریاست کے  
استحکام کا پورا انعام ہے۔ آخر دنیا میں وہ کون سی ریاست ہے جو اپنے اندر خود  
اپنی تحریب کے اسہاب و وسائل کو پورش کرنا یا گوارا ہی کرنا پسند کرتی ہو؟ ہم اپنی  
حد تک اپنی ریاست کی بنیادی چنان کے ہزارے کو چنان سے بدل دیاں وابستہ  
رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ پھر بھی اگر کوئی ذرہ ایسا نکل آئے جو علیحدگی کو  
عی ترجیح دیتا ہو تو ہم اس سے کہیں گے کہ تمہیں علیحدہ ہونا ہے تو ہمارے حدود سے  
باہر نکل جاؤ، ورنہ یہاں ہم تمہیں دوسرے ذرلوں کی پرانگی کا سبب بخے کے لئے  
آزاد نہ چھوڑیں گے۔

چہارم یہ کہ وہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہر قسم کے مرتد کو ہر حال میں ضرور  
قتل ہی کیا جائے گا۔ حالانکہ ایک جرم کی انتہائی سزا شدید ترین نوعیت جرم پر دی  
جاتی ہے نہ کہ مجرد جرم پر۔ ایک شخص مخفی عقاوہ کی حد تک اسلام سے منحرف ہو  
کر رہ جاتا ہے۔ دوسرا شخص اسلام کو اعلانیہ چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں جاتا  
ہے۔ تیسرا شخص مرتد ہونے کے بعد اسلام کی مخالفت میں عملی سرگرمیاں دکھانے  
لگتا ہے۔ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون اس طرح کے تمام

مختلف آدمیوں کو ہر حال میں ایک ہی نگاہ سے دیکھے گا؟ ۱

### (و) اسلامی قانون جنگ اور غلامی

اسلامی قانون جنگ اور خصوصاً "غلامی" کے مسئلے پر بھی عدالت میں کچھ سوالات کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات سمجھ لئی چاہئے کہ اسلام کا قانون جنگ حقیقت میں ایک قانون ہے جس پر اسلامی ریاست میں لازماً "عمل کیا جائے گا قطع نظر اس سے کہ دوسری قومیں، جن سے ہماری جنگ ہو، اس کے مقرر کردہ قواعد اور حدود کو ملاحظہ رکھیں۔ اس کے بر عکس جس چیز کو بین الاقوامی قانونی جنگ کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں قانون نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی راضی نامیوں کا ایک مجموعہ ہے جس کے قواعد اور حدود کی پابندی ہر قوم نے اس امید اور سمجھوتے پر قبول کی ہے کہ دوسری قومیں بھی جنگ میں انہیں ملاحظہ رکھیں گی۔ اسلام نے ہمیں جنگ کے چند کم سے کم حدود تہذیب و اخلاق کا تو پابند کر دیا ہے جنہیں اگر دوسرے توڑ بھی دیں تو ہم بہر حال نہیں توڑ سکتے، اور ان سے زائد اگر کچھ مزید مہذب قوانین پر دوسری قومی راضی ہوں تو ہم نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ ایسے سمجھوتے کرنے کے لئے آزاد ہیں، بلکہ ان سب سے بڑھ کر یہ ہمارا منصب ہے کہ انہیں جنگ میں مزید تہذیب اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ مثال کے طور پر غلامی ہی کے مسئلے کو لے لجئے۔ اسلام نے اس کی اجازت اس حالت میں دی ہے جب کہ دشمن نہ تباہ لے اسی راست پر راضی ہو اور نہ فدیے کے عوض اپنے قیدی چھڑانا اور ہمارے قیدی چھوڑنا قبول کرے۔ اس صورت میں اسلام نے قیدیوں کو جیلوں اور اجتماعی کیپوں میں رکھ کر جبری محنت لینا پسند نہ کیا بلکہ انہیں افراد میں تقسیم کر

۱۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" "از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیٹھر لاهور۔

دینے کو ترجیح دی ہاکر ان کا مسلمانوں میں جذب ہو جانا زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں دنیا کے دوسرے ممالک بھی قیدیوں کو غلام ہی نہ کر رکھتے تھے، اور غلامی کا لفظ ہمارے اور ان کے درمیان ضرور مشترک تھا، مگر جہاں تک غلامی کی حقیقت کا تعلق ہے، اسے جس طرح اسلام نے بدلا اس کی نظر دنیا میں نہیں ملتی۔ آخر وہ دنیا کی کوئی سی قوم ہے جس میں اس کثرت سے غلام اور غلام زادے سے امامت اور قضاء اور پہ سالاری اور امارت و فرمان روائی کے مرتبوں پر پہنچے ہوں؟ یہ تو وہ کم سے کم تہذیب و انسانیت کی حد تھی جس پر اسلامی قانون نے ہمیں قائم کیا۔ اب اگر دنیا کی قومیں تبادلہ ایساں جنگ کا قاعدہ قبول کر چکی ہیں تو اسلام میں کوئی چیز اس کا خیر مقدم کرنے سے ہم کو نہیں روکتی۔ ہمارے لئے تو یہ خوشی کا مقام ہے کہ دنیا بالآخر اس بات پر راضی ہو گئی جس پر ہم صدیوں پہلے اسے راضی کرنا چاہئے تھے۔

### (ر) اسلام اور فنونِ لطیفہ

یہ سوال بھی انٹھایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت میں آرٹ کا کیا حصہ ہو گا اور اس سلسلہ میں تصور یہ "ڈرامے" موسیقی، سینما اور مجسموں کا خاص طور پر نام لیا گیا ہے۔ میں اس سوال کا یہ مختصر جواب دوں گا کہ آرٹ تو انسانی فطرت کی ایک پیدائشی امیگ ہے جسے خود خالق فطرت نے اپنے ہر کام میں لمحوظ رکھا ہے، اس لئے بجائے خود اس کے ناجائز یا منوع ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر آرٹ کے مظاہر لازماً" وہی نہیں ہیں جو اس وقت مغربی تہذیب میں پائے جاتے ہیں، بلکہ ہر تہذیب اپنے اصول اور نظریات اور رہنمائی کے مطابق فطرت کی اس امیگ کا انعامار مختلف جاموں میں کرتی ہے اور دوسری تہذیبوں کے اختیار کردہ جاموں کے ہواز و عدم ہواز کا فیصلہ کیا کرتی ہے۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ "آرٹ" بس اسی چیز کا نام ہے جو مغرب سے در آمد ہو رہی ہے اور اگر اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں تو بجائے خود آرٹ ہی کا خاتمه ہو جائے گا۔ اسلام آرٹ کے تعلق

خود اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ وہ فطرت کی اس امنگ کو بت پرستی، حسن پرستی اور شوانیت کی راہوں پر جانے سے روکتا ہے اور اس کے ظہور کے لئے دوسرے راستے دکھاتا ہے۔ اس کی حکومت میں لازماً ”اس کا اپنا ہی نظریہ فرمان روا ہو گا“ مغربی تدبیر کے نظریات کی فرمان روای بہرحال جاری نہ رہ سکے گی۔

### (ج) فقی اخلافات اسلامی ریاست کے قیام میں حائل نہیں ہیں

یہ سوال بھی چیزرا گیا ہے کہ مسلمان فرقوں کے درمیان اعتقادی اور فقی اخلاف کی کیا نوعیت ہے اور یہ کہ جب ان کے درمیان بنیادی امور میں بھی اتفاق نہیں ہے، حتیٰ کہ ”سنت“ تک شیعوں اور سینوں میں متفق علیہ نہیں ہے تو ایک اسلامی ریاست کا نظام کیسے چل سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں میرے نزدیک صرف اتنی تصریح کافی ہے کہ پاکستان میں ہم کو روایتی ۳۷ فرقوں سے عملاً کوئی سابقہ درپیش نہیں ہے، اور ہر بیان خیال ہے کسی شخص نے کسی اخبار یا رسائل میں پیش کیا ہوا اور کچھ منتشر لوگوں نے قبول کر لیا ہو، کوئی قابل ذکر فرقہ نہیں پناہ دیتا۔ ہمارے ملک میں بالفعل صرف تین فرقے پائے جاتے ہیں۔ ۱۔ حنفی جو دیوبندیوں اور بہلولیوں میں تقسیم ہونے کے باوجود فقہ میں متفق ہیں۔ ۲۔ اہل حدیث۔ ۳۔ شیعہ۔ ان تینوں فرقوں کے اخلافات عملاً ایک اسلامی ریاست کا نظام بننے اور چلنے میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ پرنسل لاءِ مذہبی رسم و عباوات اور مذہبی تعلیم کی حد تک ہر فرقے کا ملک دوسرے فرقے کی مداخلت سے محفوظ رہے گا اور ملک کا انتظام ان قواعد اور قوانین کے مطابق چلے گا جو پارلیمنٹ کی اکثریت طے کرے۔ اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ”۳۷ فرقوں“ کے اس افسانے کی حقیقت بھی کھول دوں جس سے خواہ مخواہ ناواقف لوگ اپنے ذہن کو بھی الجھاتے ہیں اور دوسروں کے ذہنوں میں بھی الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان فرقوں کی وہ کثیر تعداد جس کا ذکر کتابوں میں لتا ہے، اس کا بہت بڑا حصہ کاغذی وجود کے سوانح پہلے کوئی وجود رکھتا تھا اور نہ اب

رکھتا ہے۔ جس شخص نے بھی کوئی زرالا خیال پیش کیا اور اس کے سوچپاس حامی پیدا ہو گئے اسے ہمارے مصنفین نے ایک فرقہ شمار کر لیا۔ اس طرح کے فرقوں کے علاوہ ایک معتدبہ تعداد ایسے فرقوں کی بھی ہے جو گذشتہ تیرہ سو بریس کی مدت میں پیدا بھی ہوئے اور مٹ بھی گئے۔ اب دنیا میں مسلمانوں کے بہت سلسلہ چھ سات فرقے باقی ہیں جنہیں اصولی اختلافات کی بنیاد پر مشتمل فرقہ کہا جا سکتا ہے اور جو اپنی تعداد کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی بعض فرقے بہت قمیل التعداد ہیں اور یا تو خاص خاص علاقوں میں مجمع ہیں یا دنیا بھر میں اس طرح منتشر ہیں کہ کہیں بھی ان کی کوئی قابل لحاظ آبادی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑے مسلم فرقے صرف دو ہی ہیں۔ ایک سنی، دوسرے شیعہ۔ ان میں سے امت کا سواد اعظم سنیوں پر مشتمل ہے اور ان کے ضمنی فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو حصہ تھا دوسرے سنی فرقوں سے کوئی اصولی اختلاف رکھتا ہو۔ یہ صرف ڈاہب بلکہ (School of Thought) ہیں جن کو منافرہ بازیوں نے خواہ خواہ فرقوں کی حکومت قائم کرنا چاہا ہے تو ان اختلافات کی موجودگی کہیں بھی سد راہ نہیں ہو سکتی۔

۱

یہاں تک کی پوری تحریر عدالتی بیان سے ماخذ ہے جو اب اسلامک پبلیکیشنز کی شائع کردہ کتاب "قادیانی مسئلہ - اور اس کے اخلاقی، تدقیقی اور سیاسی پہلو" کا ایک جزو ہے۔ مرتب

(۲)

## خلافت و حاکمیت

(الف) اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات<sup>۱</sup>-

(یہ ایک سوالنامہ ہے جو جرمنی سے ایک طالب علم نے اسلامی ریاست اور خلافت کے بعض سائل کی تحقیق کے لئے بھیجا ہے۔ اصل سوالات انگریزی میں ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ترجمہ دے رہے ہیں:-

۱۔ کیا اسلامی ریاست کے سربراہ کے لئے صرف خلیفہ کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے؟

- ۲۔ کیا اموی خلفاء صحیح معنوں میں خلفاء کہلاتے جانے کے متعلق ہیں؟
- ۳۔ خلفائے بنو عباس "خصوصاً" المامون کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
- ۴۔ حضرت امام حسن رض، حضرت امام حسین رض اور ابن زید رض کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کی نظر میں ۶۸۰ء میں ملت اسلامیہ کا اصل رہنا کون تھا؟ حسین یا زید؟
- ۵۔ کیا اسلامی ریاست میں خروج ایک نیکی کا کام قرار پاسکتا ہے؟
- ۶۔ اگر خروج کرنے والے مساجد یا دوسرے مقدس مقامات (حرم اور کعبہ) میں پناہ گزیں ہوں تو الحکی صورت میں اسلامی ریاست کا ایسے لوگوں کے ساتھ کیا طرز عمل ہو ناچاہئے؟

---

<sup>۱</sup> مأخذ از ترجمان القرآن۔ جلد ۵۲ عدد ۲ ہابٹ مئی ۱۹۵۹ء۔ مرتب

۷۔ وہ اپے کون سے تیکس ہیں جو ایک اسلامی ریاست اپنے شریوں سے ازروئے قرآن و سنت و صول کرنے کی مجاز ہے؟

۸۔ کیا کوئی خلیفہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جو سابق خلفاء کے طرزِ عمل سے مختلف ہو؟

۹۔ حجاج بن یوسف کو بحیثیت گورنر اور مختتم آپ کیا حیثیت دیتے ہیں؟

۱۰۔ کیا اسلامی ریاست اس بات کا استحقاق رکھتی ہے کہ وہ اپنے شریوں پر اپے تیکس عائد کرے جو نہ تو قرآن و سنت میں مذکور ہوں اور نہ ہی ان کی کوئی نظریہ سابق خلفاء کے ہاں ملتی ہو؟

جواب : آپ کے ارسال کردہ سوالات کے مفصل جوابات لکھنے کے لئے تو فرصت درکار ہے جو مجھے میر نہیں۔ البتہ مختصر جوابات حاضر ہیں :

۱۔ اسلامی ریاست کے رئیس یا صدر کے لئے "خلیفہ" کا لفظ کوئی لازمی اصطلاح نہیں ہے۔ امیر، امام، سلطان وغیرہ الفاظ بھی حدیث، فقہ، کلام اور اسلامی تاریخ میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مگر اصولاً "جو چیز ضروری ہے وہ یہ کہ ریاست کی بنیاد نظریہ خلافت پر قائم ہو۔ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ تو بادشاہی یا آمریت ہو سکتی ہے اور نہ ایسی جموریت جو حاکیت عوام وہی ریاست حقیقت میں اسلامی ہو سکتی ہے جو خدا کی حاکیت تسلیم کر لے، خدا اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت کو قانون برتر اور اولین ماذق قوانین مانے، اور حدود خدا کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو۔ اس ریاست میں اقتدار کی اصل غرض خدا کے احکام کا اجراء اور اس کی رضا کے مطابق برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا ارتقاء ہے۔ اس ریاست کا اقتدار، اقتدار اعلیٰ نہیں ہے بلکہ خدا کی نیابت و امانت ہے۔ یہی معنی ہیں خلافت کے۔

۲۔ اموی فرمائیں کی حکومت حقیقت میں خلافت نہ تھی۔ اگرچہ ان کی

حکومت میں قانون اسلام عی کا تھا، لیکن دستور (Constitution) کے بہت سے اسلامی اصولوں کو انہوں نے توڑ دیا تھا۔ نیز ان کی حکومت اپنی روح میں اسلام کی روح سے بہت ہٹی ہوئی تھی۔ اس فرق کو ان کی حکومت کے آغاز عی میں محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس حکومت کے باñی حضرت امیر معاویہؓ کا اپنا قول یہ تھا کہ انا اول العلوک (میں سب سے پہلا پادشاہ ہوں) اور جس وقت حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو ولی عمد مقرر کیا اس وقت حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمن نے اٹھ کر بر ملا کہا کہ ”یہ تو قصریت ہے کہ جب قیصر مراتا اس کا بیٹا قیصر ہو گیا۔“

۳۔ اصولی حیثیت سے خلافت عباسیہ کی پوزیشن بھی وہی ہے جو خلافت نی اسے کی ہے۔ فرق بس اتنا تھا کہ خلفائے نبی امیہ دین کے معاملہ میں بے پروا (Indifferent) تھے اور اس کے بر عکس خلفائے نبی عباس نے اپنی مذہبی خلافت اور روحانی سیاست کا سکھ بخانے کے لئے دین کے معاملہ میں ایجادی طور پر دلچسپی لی۔ لیکن ان کی یہ دلچسپی اکثر دین کے لئے مضری ثابت ہوئی۔ مثلاً ”اموں کی دلچسپی نے جو مشکل اختیار کی وہ یہ کہ اس نے ایک فلسفیانہ مسئلے کو جو دین کا مسئلہ نہ تھا، خواہ مخواہ دین کا ایک عقیدہ بنایا اور پھر حکومت کی طاقت سے زبردستی اس کو حلیم کرنے کے لئے ظلم و ستم کیا۔

۴۔ جس دور کے متعلق یہ سوال کیا گیا ہے وہ حقیقت میں فتنے کا دور تھا۔ مسلمان اس وقت سخت انتشار ذہنی میں جلا ہو گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کا حقیقی لیڈر کون تھا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یزید کا سیاسی اثر جو کچھ بھی تھا صرف اس بنا پر تھا کہ اس کے پاس طاقت تھی اور اس کے والد نے ایک مفہوم سلطنت قائم کرنے کے بعد اسے اپنا ولی عمد بنایا تھا۔ یہ بات اگر نہ ہوتی اور یزید عام مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتا تو شاید وہ آخری شخص ہوتا جس پر لیڈر شپ کے لئے مسلمانوں کی نگاہ انتخاب پڑ سکتی۔ اس کے بر عکس جسین این علی ہلہ اس وقت امت کے نمایاں ترین آدمی تھے اور ایک آزادانہ

انقلاب میں اغلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ دوست ان کے حق ہی میں پڑتے۔

۵۔ خالق امراء کے مقابلے میں خروج الی صورت میں نہ صرف جائز بلکہ فرض ہو جاتا ہے جب کہ ان کو ہٹا کر ایک صالح و عادل حکومت کرنے کا امکان ہو۔ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک بہت واضح ہے جسے ابو بکر جاص نے احکام القرآن میں اور الموقق الحنفی نے مناقب ابوحنیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے بعد عکس ایک حکومت عادلہ کے ظاف خروج بہت بڑا گناہ ہے اور تمام اہل ایمان پر لازم ہے کہ ایسے خروج کو دیادینے میں حکومت کی تائید کریں۔ میں میں حالت میں، جب کہ حکومت عادل نہ ہو مگر صالح انقلاب کے بھی امکانات واضح نہ ہوں، پوزیشن مشتبہ ہے اور آئندہ و فتحاء نے اس معاملے میں مختلف طرز عمل اختیار کئے ہیں۔ بعض نے صرف کلم حق کرنے پر اکتفا کیا مگر خروج کو ناجائز سمجھا۔ بعض نے خروج کیا اور جام شادت نوش کرنے کو ترجیح دی اور بعض نے پامید اصلاح تعاون بھی کیا۔

۶۔ حکومت عادلہ کے مقابلہ میں جو لوگ خروج کریں اور وہ اگر مساجد میں پناہ لیں تو ان کا حاصرہ کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ وہاں سے گولہ باری کریں تو جوابی گولہ باری بھی کی جاسکتی ہے۔ رہا حرم میں ان کا پناہ لیتا تو اس صورت میں صرف حاصرہ کر کے اس حد تک بیک کیا جاسکتا ہے کہ بالآخر باغی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ حرم میں قتل و خون کرنا یا حرم پر سنگ پاری یا گولہ باری کرنا درست نہیں۔ مخالف اس کے ایک خالق حکومت کا وجود خود گناہ ہے اور اپنے قیام و بغا کے لئے اس کی کوشش بھی گناہ میں اضافہ کے سوا کچھ نہیں۔

۷۔ قرآن و سنت نے ٹیکسون کا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں پر زکوٰۃ الطور عبادت اور غیر مسلموں پر جزیہ (بطور علامت اطاعت) لازم کرنے کے بعد یہ بات حکومت کی صوابدید پر چھوڑی ہے کہ جیسی ملک کی ضروریات ہوں ان کے مطابق باشندوں پر ٹیکس عائد کریں۔ خراج اور عاصل درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہیں جنہیں قرآن و سنت میں شرعاً مقرر نہیں کیا گیا تھا اور حکومت

اسلامی نے اپنی صوابیدہ کے مطابق اُسیں خود مقرر کیا۔ اس معاملہ میں اصل معیار ملک کی حقیقی ضروریات ہیں۔ اگر کوئی فرمائزہ اپنے تصرف میں لانے کے لئے بھی وصول کرے تو حرام ہے اور ملک کی حقیقی ضروریات پر صرف کرنے کے لئے لوگوں کی رضامندی سے ان پر عائد کرے تو حلال ہے۔

۸۔ جی ہاں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود اپنے کئے ہوئے سابق فیصلوں کو بھی بدل سکتا ہے۔

۹۔ حاجج بن یوسف دنیوی سیاست کے نقطہ نظر سے بڑا لائق اور دینی نقطہ نظر سے سخت خالم حاکم تھا۔

۱۰۔ جی ہاں، ان شرائط کے ساتھ جو نمبرے میں بیان ہوئی ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۲ مئی ۱۹۵۹ء)

### (ب) الخلافت یا الحکومت<sup>۱</sup>

سوال : اگر بیسویں صدی میں بھی اسلام قابل نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات یا موانع درپیش ہوں گے ان کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریہ حکومت و ریاست یعنی الخلافت یا الحکومت کس سے ممکن ہے؟

جواب : اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سد رہا ہیں ان کا اگر تجویہ کر کے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اُسیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر سلطنت ہوئیں تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں راجح کیا۔ ہمارے نظام تعلیم کو معطل کر کے اپنا

<sup>۱</sup> مأخوذه از ترجمان القرآن جلد ۷۵۔ عدد ۱۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ مرتب

نظام تعلیم راجح کیا۔ تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب لوگوں کو بر طرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظام تعلیم سے فارغ ہو کر لکھتے تھے۔ معاشری زندگی میں بھی اپنے ادارے اور طور طریقے راجح کئے اور میشیت کامیابی میں بھی رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو گیا جنہوں نے مغربی تہذیب سے تعلیم کو اختیار کیا تھا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات اور اس کی روایات، ہر چیز سے علمی طور پر بھی بیگانہ ہے اور اپنے روحانیات کے اعتبار سے بھی بیگانہ۔ یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پہنچنے میں مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے کہ اسلام اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ساری تعلیم اور تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اسلام قابل عمل نہیں ہے، کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ جس نظام زندگی کے لئے وہ تیار کئے گئے ہیں اسی کو وہ قابل عمل تصور کر سکتے ہیں۔ اب لامجالہ ہمارے لئے دوسری راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں۔ یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظام تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کا پورے طریقہ سے تجویز کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے محرف بنانے والی ہیں اور اس میں کیا تغیرات کئے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی اچھتی ہوئی توجہ بھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ بڑی سمجھدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کر لیں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ

کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکتی گے۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی، کیونکہ اس مسئلہ کی جو نوعیت اب پیدا ہوئی ہے وہ ابن خلدون کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغرب استعمار رخصت ہوتے ہوئے ہمارے ملکوں میں اس نسل کو حکمران بنانا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن علمی اور ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے انگریزوں، فرانسیسوں یا ولندیزوں کا پورا جانشین ہے۔ اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنے کا معاملہ ایک بیچیدہ معاملہ ہے جسے حل کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں ہے۔ اس لئے یہ بڑے سمجھدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لئے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

(ج) حکومت الیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق ۱۔

سوال : ”رسالہ پیغام حق“ میں ابوسعید بزی صاحب نے اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھا ہے :

”اسلامی سیاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بڑے زور و شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نظریہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ تاریخی حیثیت سے یہ اصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصہ تک تھیا کسی (theocracy) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ خدا

کوئی ناطق ادارہ نہیں، اس لئے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار و اقتدار مل جائے وہ بڑی آسمانی سے اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقة خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تصور سیاست پاپائے اعظم کے تصور ہے مختلف ہے، لیکن چونکہ وہ حکومت کو عوام کے سامنے جوابدہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمورویت کو غلط سمجھتے ہیں اس لئے فتحہ "ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر بڑی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ برآہ کرم ترجمان القرآن کے ذریعے سے اس غلط فتحی کا ازالہ فرمادیں اور صحیح نظریہ کی توضیح کر دیں۔"

جواب : بڑی صاحب نے غالباً "میرا مضمون" "اسلام کا نظریہ سیاسی" "ملاحظہ نہیں فرمایا ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انہوں نے میرے ملک پر کئے ہیں، ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ اظہارِ تعجب کروں اور کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے اس مضمون میں یہ عبارتیں قابل ملاحظہ ہیں:

"مگر یورپ جس تھیا کسی سے واقف ہے، اسلامی تھیا کسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیا کسی سے واقف ہے، جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے ہائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی تمام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزدوں ہو گا۔

بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور رسول ملکہ کی سنت کے مطابق

چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو الہی جموروی حکومت (Theo-Democratic State) کیونکہ اس میں خدا کی حاکیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حکومت عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ مسلمانوں کی رائے سے بننے کی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے بعد اس کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اجماع ہی سے ملے ہوں گے اور الہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہزوں شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔“

پھر میں نے اوپر کی عبارت کے نیچے حاشیہ میں اس کی مزید تشریع کی ہے کہ: ”یہاں کی پیاراؤں اور پادریوں کے پاس صحیح علیہ السلام کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں، لہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انہیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔“

کوئی شخص جو سمجھی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے، میرے اس اشارہ کو جو میں نے ان چند فقرہوں میں کیا ہے، سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاکی نظام بینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر میہجت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عمد نامہ میں پاکی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تدرن اور ایک سیاست کا نظام چلا دیا جاسکے۔ مگر جب پیاراؤں نے یورپ میں بلا واسطہ یا پال واسطہ تھیا کی قائم کی تو اس کے لئے ایک قانون شریعت بھی وضع کیا۔ جو ظاہر ہے کہ

کسی دوستی امام سے مانع نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھر اہوا تھا۔ اس میں انہوں نے جو نظام عطا کر، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کئے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انہوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا۔ یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ انہوں نے نظام کلیسا کے کارپردازوں کے لئے جو حقوق اور اختیارات تجویز کئے تھے اور جو مذہبی لیگیں لوگوں پر لگائے تھے ان کے لئے بھی کوئی مانع ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوانح تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انہوں نے تھیا کی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقيقة تھیا کی نہیں تھا۔ اس کو آخر اسلام کی حکومت ایسے یا شرعی حکومت سے کیا مہماں کت ہو سکتی ہے جس کے لئے کتاب و سنت کی صورت میں بالکل واضح اور ناقابل خذف و ترمیم قانون موجود ہے اور جس کو چلانا کسی مخصوص مذہبی طبقے کا اجراء نہیں ہے۔

پھر بڑی صاحب کا یہ ارشاد بالکل عجیب ہے کہ ہم خلیفہ کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو عیسائیوں میں پوپ کی حیثیت ہے اور یہ کہ ہم اسے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ اس کے جواب میں میں پھر اپنے اسی مضمون کی چند عبارتیں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے آیت وعد اللہ الذین اسنوا منکم و عملوا الصالحة لبِسْتَخْلُفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفُ النَّبِيُّونَ مِنْ قَبْلِهِمْ<sup>۱</sup> سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”دوسری کائٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ ہانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کس کو خلیفہ ہاؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔“

پھر آگے جل کر میں نے لکھا ہے کہ:

”یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا اگر وہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔“

اس کے بعد میں نے پھر اسی مضمون میں دوسرے مقام پر تصریح کی ہے کہ: ”اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترن شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے پرداز کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے خلیفہ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مر نکر ہو گئی ہے۔“

اس کے بعد یہ فقرہ بھی میرے اسی مضمون میں موجود ہے کہ: ”امیر تنقید سے بالآخر نہ ہو گا۔ ہر عالمی مسلمان اس کے پیک کاموں ہی پر نہیں بلکہ اس کی پرائیوریٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہو گا۔ وہ قابل عزل ہو گا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شریوں کے برابر ہو گی اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا اور وہ عدالت میں کسی اقتیازی بر تاؤ کا مستحق نہ ہو گا۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ مجلس شوریٰ الکی ہو گی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی مانع شرعی نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے دونوں سے

منتخب کیا جائے۔ ہر صورت میں عامہ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقوی اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفاذیت کے ساتھ؟ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مند امارت سے نیچے بھی اتار لاسکتی ہے۔“

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہماری تھیاکری کو پاپايان روم کی قائم کردہ تھیاکری سے مشابہ قرار دے تو بہر حال ہم اسے اس کی آزادی رائے سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ مگر یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ رائے علم و دلیل سے آزاد ہے۔

### (و) اسلامی حکومت اور مسلم حکومت<sup>۱</sup>

سوال : خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جو حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوئیں، وہ اسلامی حکومتیں تھیں یا غیر اسلامی؟

جواب : درحقیقت نہ وہ پوری اسلامی تھیں نہ پوری غیر اسلامی۔ ان میں اسلامی دستور کی دو ہم چیزوں کو بدل دیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ امارت انتخابی ہو، دوسرے یہ کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلا یا جائے۔ باقی ماندہ اسلامی دستور چاہے اپنی صحیح اپرٹ میں برقرار نہ رکھا گیا ہو، لیکن اسے منسوخ یا تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ ان حکومتوں میں قرآن و سنت ہی کو ماذہ قانون مانا جاتا تھا، عدالتوں میں اسلامی قانون ہی نافذ ہوتا تھا اور مسلمان حکمرانوں نے کبھی یہ جرأت نہیں کی کہ قانون اسلام کو منسوخ کر کے اس کی جگہ انسانی ساخت کے قوانین جاری کر دیں اور اگر کبھی کسی حکمران نے اس کی جرأت کی تو تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کسی نہ کسی

<sup>۱</sup> (ر) اور (ھ) میں دیے ہوئے سوال و جواب اس بحث سے لئے جا رہے ہیں جو ۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء کو کراچی پار ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ مجلس مباحثہ میں ہوئی تھی۔ مرتب

اللہ کے بندے نے اٹھ کر اس کے خلاف جماد عظیم کیا، یہاں تک کہ اس فتنہ کا سد باب ہو کر رہا۔ انہی تجیہ اور مہدو الف ثانی مددگار نے اس طرح کی کوششوں کے مقابلے میں جو کچھ کیا اس پر تاریخ گواہ ہے۔

### (ھ) مسئلہ خلافت اور فرقہ پرستی

**سوال :** کیا خلافت کا مسئلہ اس وقت آسانی سے حل ہو سکتا ہے جب کہ اسلام میں بہتر فرقہ موجود ہیں؟

**جواب :** میں یہاں تمام دنیاۓ اسلام کی خلافت کے مسئلے سے بحث نہیں کر رہا ہوں، بلکہ صرف پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام تک میری گفتگو محدود ہے۔ اگر خلف مسلمان ملکوں میں ان اصولوں پر جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں، اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں تو البتہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب ان سب کی ایک فیڈریشن بن سکے اور تمام دنیاۓ اسلام کا ایک ظیفہ منتخب کیا جاسکے۔ رہے بہتر فرنے تو وہ صرف علم کلام کی کتابوں کے صفحات میں پائے جاتے ہیں۔ عمل پاکستان میں تو اس وقت تین ہی فرقے موجود ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہل حدیث، تیسرا شیعہ۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ان تینوں فرقوں کے علماء پہلے ہی اسلامی حکومت کے بیانوی اصولوں پر اتفاق کر چکے ہیں۔ لذا اب اس اندیشے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ فرقوں کی موجودگی اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہو گی۔

(۳)

## ملکی سیاست میں عورتوں کا حصہ

(الف) مجالس قانون ساز میں عورتوں کی شرکت کا مسئلہ<sup>۱</sup>

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ آخر وہ کون سے اسلامی اصول یا احکام ہیں جو عورتوں کی رکنیت مجالس قانون ساز میں مانع ہیں؟ اور قرآن و حدیث کے وہ کون سے ارشادات ہیں جو ان مجالس کو صرف مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان مجالس کی صحیح نویت اچھی طرح واضح کر دیں جن کی رکنیت کے لئے عورتوں کے انتحقاق پر محفوظ کی جا رہی ہے۔ ان مجالس کا نام قانون ساز رکھنے سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عبد صحابہ میں خواتین بھی قانونی سائل پر بحث، محفوظ، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں اور بسا اوقات خود خلفاء ان سے رائے لیتے اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصولوں کا نام لے کر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں ہاتھی اور توڑتی ہیں، وہی نظم و نسق کی پالیسی ٹلے کرتی ہیں، وہی مالیات

<sup>۱</sup> یہ تحریر ترجمان القرآن بابت ماہ فروری ۱۹۵۲ء سے لی جا رہی ہے۔

اور محاذیات کے سائلیں طے کرتی ہیں اور انہی کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک قبیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوم" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھئے، قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو رکھتا ہے اور کسے نہیں رکھتا۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض و بما  
انفقوا من اموالهم فالصالحات قننت حفظت للغیب بما حفظ الله

(آیت: ۳۳)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں قوامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے۔

آپ کمیں گے یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لئے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لئے، مگر یہاں اول تو مطلقاً "الرجال قوامون علی النساء" کہا گیا ہے، "فی البيوت" کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گمراہی میں قوام نہ بنا�ا بلکہ قوت (اطاعت شعراً) کے مقام پر رکھا، آپ اسے تمام گمراہوں کے مجموعے، یعنی پوری مملکت میں قوت کے مقام سے اختاکر قوامیت کے مقام پر لانا چاہئے ہیں؟ گمراہ کی قوامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور

اوپنے درجے کی ذمہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائے گا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دے گا؟

اور دیکھئے۔ قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرہ عمل یہ کہہ کر معین کر دتا ہے کہ

وَقَرْنَفِي بَيْوَتِكُنْ وَلَا تَبْرُجْنَ تَبْرُجَ الْجَهَالِيَّةِ الْأَوَّلِ۔ (الاحزاب: ۳۳)

اپنے گھروں میں وقلد کے ساتھ نصری رہو اور بچھلی جاہلیت کے سے تحرج ان کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی اکرم ﷺ کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال مبارک میں کیا نبی اکرم ﷺ کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص لعنت تھا جس کی وجہ سے وہ ہیرون غانہ کی ذمہ داریوں کے لئے نا اہل شخص؟ اور کیا دوسرا خواتین کو اس لحاظ سے ان پر کوئی فوکیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلطے کی ساری آیات صرف اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تحرج جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انہیں غیر مردوں سے اس طرح کی باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ ان کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبی ﷺ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد حدیث کی طرف آئیے۔ یہاں ہم کو نبی اکرم ﷺ کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:

إذَا كُلَّ أَمْرٍ أَنْتُمْ شُرَارُكُمْ وَ اغْنِيَانُكُمْ بَخْلَانُكُمْ وَ امْرُورُكُمْ أَنْسَانُكُمْ فَبِطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ مِّنْ ظَهُورِهَا۔ (ترمذی)

جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں اور جب تمہارے دولت  
مند بیٹل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں  
ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پینچے سے بہتر ہے۔

عن ابی بکرۃ لعما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اہل فارس  
ملکواعلیہم بنت کسری قال لمن یفلح قوم ولو امرهم امراة۔

(بخاری، احمد، نسائی، ترمذی)

ابو بکر سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر پہنچی کہ اپر ان والوں  
نے کسری کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاج  
نسیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے پرداز کئے ہوں۔

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد الرجال قوامون علی النساء کی تحریک  
تحریک تفسیریان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری  
عورت کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ رہایہ سوال کہ عورت کا دائرہ عمل ہے کیا،  
تو نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

والمراة راعية على بيت بعلها ولده و هي مسؤولة عنهم۔ (ابوداؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ ہے اور وہ ان  
کے پارے میں جوابدہ ہے۔

یہ ہے آئت و قون فی بیوتکن کی صحیح تفسیر، اور اس کی مزید تفسیر وہ احادیث  
ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کمتر درجہ کے خارج از بیت فرائض  
و واجبات سے بھی مستثنی کیا گیا ہے۔

الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة إلا لربعة: عبد مخلوق،  
لواعرة أو صبي أو مريض۔ (ابوداؤد)

جسہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے۔ بجز چار  
تم کے لوگوں کے، ایک فلام، دوسرے عورت، تیسرا پچھا، چوتھے

مریض۔

عن ام عطیہ قالت نہیں اعن اتباع الجنائز۔ (بخاری)

ام علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کماہم کو جنائز کے ناتھے جانے سے روک دیا گیا تھا۔

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطہ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی صحیح کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں، مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا ہے، دوسرا بھی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی قبولی کرنے سے پہلے اور قبولی کے لئے شرط کے طور پر، عقلی دلائل کا مقابلہ کرے۔ مسلمان کو، اگر وہ واقعی مسلمان ہے، پہلے حکم کی قبولی کرنی چاہئے، پھر وہ اپنے رماغی اطمینان کے لئے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو درجہ میں خدا اور رسول ﷺ کا حکم نہ مانوں گا تو ہم اسے سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے، کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کے لئے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ قبول حکم کے لئے عقلی دلیل مانگنے والے کا مقام اسلام کی نرحد سے باہر ہے نہ کہ اس کے اندر۔

سیاست و ملک داری میں عورت کے داخل کو جائز ثہرائے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضوی کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علی رضوی کے خلاف جنگ جمل میں نبرد آزمائیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً "ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہو، اس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو، ہمگز جنت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ مگر اس غرض کے لئے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسول ﷺ کے تابعے ہوئے راستے پر چلیں، نہ اس غرض کے

لئے کہ ہم اللہ اور رسول ﷺ کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا ایذاع کریں۔ پھر جس فعل کو اسی زمانے میں جلیل القدر صحابہ کرام نے غلط قرار دیا تھا اور جس پر بعد میں خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا بھی نادم ہوئیں، اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جاسکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کاپورا ابن قتبیہ نے الامانۃ والیاستہ میں اور ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے کتنے پر زور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ ”آپ کے دامن کو قرآن نے سمیٹ دیا ہے، آپ اسے پھیلائیے نہیں۔“ اور ”کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو دین میں افراط برستنے سے روکا ہے؟“ اور یہ کہ آپ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صورت میں ایک گھاث سے دوسرے گھاث کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے؟“

پھر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجئے کہ ”عائشہؓ کے لئے ان کا گھرانہ کے ہو دے سے بہتر ہے۔“

اور حضرت ابو بکرؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمائیجئے کہ میں جنگ جمل کے نقشے میں جھلا ہونے سے صرف اس لئے بیخ گیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد یاد آگیا کہ ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جسی نے اپنے معاملات ایک عورت کے پرورد کر دیئے ہوں۔“

حضرت علیؓ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون شریعت کا جانے والا تھا؟ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز ہے اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فناہت کے پاوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے کہ

”بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر غصب ہاک ہو کر نکلی ہیں، مگر آپ ایک ایسے کام کے بیچے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی۔ عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح میں الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمان رضوی کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھی ہیں، مگر میں بح کرتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان رضوی کے قاتلوں سے زیادہ سختہ گار ہے۔“

دیکھئے، اس خط میں سیدنا علی رضوی حضرت عائشہؓ کے فعل کو صریحاً ”خلاف شرع قرار دے رہے ہیں۔“ مگر حضرت عائشہؓ اس کا کوئی جواب اس کے سوانہ دے سکتیں کہ جل الامر عن العتاب۔ معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے۔“

پھر جنگ جمل کے خاتمے پر جب حضرت علی رضوی ام المؤمنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا: یا صاحبة الہودج قد امرک اللہ ان تقدی فی بیتک ثم خوجت تقاطلین؟ ”اے ہودے والی، اللہ نے آپ کو مگر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کے لئے کھل پڑیں۔“ مگر اس وقت بھی حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا یہ نہ کہ سکتیں کہ اللہ نے ہم عورتوں کو مگر بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصہ لینے کا حق ہے۔

پھر یہ بھی ثابت ہے کہ آخر کار حضرت عائشہؓ نے خود اپنے اس فعل پر پچتا تی رہیں۔ چنانچہ علامہ ابن عبد البر استیعاب میں یہ روایت لائے ہیں کہ ام المؤمنینؓ نے عبد اللہ بن عمر رضوی سے ٹکایا ”فرمایا ”اے ابو عبد الرحمن تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع کیا؟“ انہوں نے جواب دیا ”میں نے دیکھا کہ ایک شخص (یعنی عبد اللہ بن زہیر) آپ کی رائے پر حادی ہو گیا ہے اور مجھے امید نہ تھی کہ آپ اس کے خلاف چل سکتیں گی۔“ اس پر ام المؤمنینؓ نے فرمایا ”کاش تم مجھے منع کر دیتے تو میں نہ نکلتی۔“

اس کے بعد جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے عمل میں آخر کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کے مل بوتے پر کوئی صاحب علم یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اسلام میں عورتیں بھی سیاست اور نظم حکومت کی ذمہ داری میں شریک قرار دی گئی ہیں؟ رہے وہ لوگ جن کے لئے اصل معیار حق صرف دنیا کی غالب قوموں کا طرز عمل ہے اور جنہیں بہر حال چنان اسی طرف ہے جس طرح انہوں چارہا ہو، تو انہیں کس نے کہا ہے کہ اسلام کو اپنے ساتھ ضرور لے چلیں؟ ان کا چدھر جمی چاہئے کہ جس معتدلا کے دراصل وہ ہیرو ہیں اسی کا نام لیں، بلادلیل اسلام کی طرف وہ باتیں منسوب نہ کریں جن سے خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت اور قرون مشہود لہا بالخیر کی تاریخ صاف صاف انکار کر رہی ہے۔

### (ب) اسلامی حکومت میں خواتین کا وائرہ عمل۔

سوال : کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی، معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جب کہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (Status) عطا کیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے درست کا حصہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں کے شانہ بثانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہو گی؟ فرض کیجئے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عمدوں کے لئے ایکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی

میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا  
 جب کہ بہت بی شایدیں الی آج موجود ہیں، مثلاً سنجون میں وزارت  
 عظیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا نیدر لینڈ میں ایک خاتون حکمران اعلیٰ  
 ہے۔ برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہیت ہے۔ سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ  
 دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیکم رعایات علی خان نیدر  
 لینڈ میں سفیر ہیں یا دیگر جس طرح مزدوجہ لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی  
 کمشنز ہیں اور اقوامِ تحدہ کی صدر رہ چکی ہیں اور بھی شایدیں جیسے نور  
 جہاں، جہانی کی رانی، رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ جو کہ  
 (Pride of Woman) کملاتی ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف  
 لکھنؤ میں جنگ کی کمائنڈ کی۔ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت  
 کر دیا ہے۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبحال لیں  
 تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟  
 کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، دکاء، مجسٹریٹ، جج، فوجی افسر یا پائلٹ وغیرہ  
 بننے کی مطلق اجازت نہ ہو گی؟..... خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ  
 نرزوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابل ذکر  
 ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی، پانی  
 پلایا اور حوصلے بلند کئے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدمی قوم کو  
 مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

جواب : اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر  
 کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے، اگر فی الواقع  
 اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو چے دل سے مانتے  
 ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ  
 عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے

بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو محیث لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو ہماری خاگی زندگی بالکل جاہ ہو جائے گی جس کی پیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً "شريك نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً" پہلی صورت ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آئکھیں بند کر کے دوسروں کی حماقوں کی لفڑی اتارنا چکنڈی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لئے کوئی مخالف نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ اس پاب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے۔ نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی پایہ مرد پر ڈالا گیا ہے۔ یہوی کا سرا اور نفقہ بھی اس پر واجب ہے اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی مالی ہار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے۔

اسلام اصولاً "خلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا ائم جو خاندان کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی خلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بعد تین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھلتے کے لئے تیار ہوں تو شوق سے بھلتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی مخالف نتیجہ زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پڑی کا کام لیا گیا ہے تو اس

کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفترتوں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمینٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرہ عمل میں، جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے، ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نا اہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدمی زنانہ اور آدمی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکتیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری مکاموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی پر نسبت ۵۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس ٹھیک کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورت کا داخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہئے، لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لئے تھیک تھیک تیار ہو سکیں

اور ان کی تعلیم بینہ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ مخلوط تعلیم کے ملک تباہی مغلی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آچکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندر سے ہی ان کا انتشار کر سکتے ہیں، مثال کے طور پر دیکھئے، امریکہ میں ۷۴ سال تک عمر کی لاکیاں جو ہائی سکولوں میں بڑھتی ہیں، مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسٹا "ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں۔" کو ابھی یہ عقل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی ہے لیکن اس مخلوط تعلیم کے تباہی کچھ ہمارے سامنے بھی آئے۔ شروع ہو گئے ہیں۔ تیرے یہ کہ اصلی تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداووں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہوں مثلاً زنانہ تعلیم گاہیں اور زنانہ ہپتال دیگر۔

### (ج) معاشرہ کی اصلاح و تربیت۔

سوال : کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی زیبائش اور نیم عربان لباس زیب تن کرنے اور فیشن کار رجحان۔ اور جیسے آج کل نوجوان لاکیاں نہایت بحک و دل فریب نہ سے معطر لباس اور غازہ و سرخی سے مزین اپنے ہر خدوخال اور شیب و فراز کی نمائش بر سر عام کرتی ہیں اور آج کل نوجوان لاکے بھی ہالی وڈ قلبوں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں۔ تو کیا حکومت قانون (Legislation) کے ذریعہ سے ہر مسلم و غیر مسلم لاکے اور لاکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی؟ خلاف ورزی پر سزا دے گی؟ والدین و سرپستوں کو جرمانہ کیا جائے گا؟ تو اس طرح کیا ان کی شری

آزادی پر ضرب نہ لگے گی؟ کیا مگر تو کہیو۔ اپا (APWA) یا دیگر  
دائلی، ایم، سی، اے (YMCA) اور دائلی، ڈبلیو، سی، اے (YWCA)  
جیسے اوارے اسلامی قائم میں گوارا کئے جا سکتے ہیں؟ کیا خواتین  
۔۔۔۔۔ اسلامی عدالت ہے۔۔۔۔۔ خود طلاق لینے کی بحاجز ہو  
سکیں گی اور مردوں پر ایک بے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہو گی؟ یا  
خواہ اسلامی عدالت کے ردیبوں ہی ان کو اپنی پسند سے  
کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو  
یو تھر فیشنیول، کھلیوں، نمائش، ڈراموں، ناج، ظہوروں یا مقابلہ حسن میں  
شرکت یا (Air Hostess) کرنے کا حق بھی اسلامی حکومت  
مخالفت کرے گی؟ ساتھ ہی قوی کردار تباہ کرنے والے اوارے متلا  
سینما، فلمیں، ٹیلی ویژن، ریڈیو پر حضش گانے والے عربان رسائل و لڑیجہ،  
موسیقی، ناج و رنگ کی شاخائی محفلین وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا یا قادر  
الہما ممکن ہو گا؟

جواب : اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ذمہ  
سے نہیں لیتا۔ تعلیم، تشویش اشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں  
خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ  
جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامن نہیں  
کرتا۔ عورتوں کی عربانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی  
بھی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے  
درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو از روئے قانون رونکا پڑے  
گا۔ اس کا نام اگر بھری آزادی پر ضرب لگانا ہے تو جو اربوں کو کھڑانا اور جیب  
کھتروں کو سزا میں رہنا بھی بھری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی  
زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ افراد کو اس کے لئے آزاد نہیں

چھوڑا جاسکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجھات اور دوسروں سے سمجھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گاہنڈ (Girls Guides) کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ اپوا (APWA) ٹائم رو سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں روکر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ (YWCA) عیسائی عورتوں کے لئے روکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں مجنہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مسلمان عورتیں چاہیں تو (YWMA) ہنا سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدیہ کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ خلع نکاح اور تفرق (Judicial Separation) کی ذکری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ذکری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (Divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیئے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخِ محمد رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا ہنچائیت اس میں دخل دئے۔ یہ تخيّل سیدھا یورپ سے ٹھل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے بھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس مظہر (Back Ground) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بڑے غنائم رو نما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گروں کے سینڈل کل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا غنائم رو نما ہوئے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں اوزروئے قانون پابندی عائد

کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تختہ بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرست پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اس سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک عورت اگر منکوہ یہوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابل برداشت ہے بلکہ اس کے حرام بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی نظر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لئے ہیں، حرام کے لئے نہیں ہیں۔ بحال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجس سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ مسلمانوں میں زنا کا رد اج بڑھے گا۔ گرل فریڈز اور داشتائیں (Mistresses) فروع پائیں گی اور دوسری یہوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک الی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خدوخال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورت حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو۔ مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدائشیں ہوتی۔ یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی مشرق عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی الی یہودی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں جلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہو گا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک بیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے؟

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یو تھے نیشنول (Youth Festival) اور

کھلیوں کی نمائشیں اور ڈراموں اور رقص و سرور اور مقابلہ حسن میں مسلمان عورتوں کو لائے یا ائمہ ہوش بنا کر مسافروں کے دل مونپنے کی خدمت ان سے لے تو ہمیں معلوم ہوا چاہئے کہ اسلامی حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے؟ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت میں باسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

سینما، قلم، ٹلی و ڈن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں مجھے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان کے اس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لئے استعمال کرے اور اخلاقی فضاد کے لئے استعمال ہونے کا وروازہ بند کر دے۔

(۳)

## ذمیوں کے حقوق

(الف) اسلامی ریاست میں ذمی رعایا۔

سوال : "میں ہندو ہما سجا کا اور کر ہوں۔ سال گذشتہ صوبہ کی ہندو سجا کا پروپرٹی نتھی ہوا تھا۔ میں حال ہی میں جناب کے نام سے شناسا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں مسلمان اور سیاسی سکھش حصہ اول و سوم، اسلام کا نظریہ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ سلامتی کا راستہ دغیرہ دیکھی ہیں، جن کے مطابعہ سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطا" بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہو گئی ہوتی تو ہندو مسلم مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومت ایسے کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس میں زندگی برکرنا قابل فخر ہو سکتا ہے۔ مگر چند امور دریافت طلب ہیں۔ خط و کتابت کے علاوہ ضرورت ہو گی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومت ایسے کے اندر کس درجہ میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہل کتاب کے حقوق دیئے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہل کتاب اور ذمی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر

عربی حملہ کی تاریخ کا علم ہے، محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے  
ہندوؤں کے اہل کتاب کے حقوق دیئے تھے۔ امید ہے کہ آپ  
اس معاملہ میں تفصیلی طور پر اکھمار خیال کریں گے۔

نیز یہ بھی فرمائیے کہ اہل کتاب اور ذی کے حقوق میں کیا فرق ہے؟  
کیا وہ ملک کے لفڑی و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا پولیس،  
فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گا؟ اگر  
نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لئے  
وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار ہوں گے جو کہ آپ حکومت ایسے میں  
ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ کیا قرآن کے فوج داری اور  
دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا  
ہندوؤں کا قومی قانون (Personal Law) ہندوؤں پر نافذ ہو گایا  
نہیں؟ میرا مدعایہ ہے کہ ہندو اپنے قانون وراثت، مشترکہ فیصلی سسٹم اور  
متلبی وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منوشاست) کے مطابق زندگی ببر  
کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محسن ایک ملالی حق کی حیثیت سے پیش  
کئے جا رہے ہیں۔

جواب : میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے  
عنتیت نامہ میں ظاہر کئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسلمہ کو  
چیزیں اور ناقابل حُدُک چیزیں بنا دینے کی زمہ داری ان لوگوں پر ہے جنہوں نے  
اصول حق اور راستی کی بیادوں پر مسائل زندگی حل کرنے کے بجائے مخفی  
خاندانی، طبقاتی، نسلی اور قومی بیادوں پر انہیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔  
اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہئے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اور اس بدستی میں ہم

آپ سب برابر کے شریک ہیں، کوئی بھی حدے میں نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر حکومت ایسے قائم ہو تو اس کی حیثیت یہ نہ ہو گی کہ ایک قوم دوسری قوم یا اقوام پر حکمران ہے، بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہو گی کہ ملک پر ایک اصول کی حکومت قائم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اینی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری باشندگان ملک میں سے وہی لوگ اٹھا سکیں گے جو اس اصول کو مانتے ہوں۔ دوسرے لوگ جو اس اصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں، ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر "اہل ذمہ" کی حیثیت حاصل ہو گی، یعنی جن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲۔ "اہل کتاب" اور "عام اہل ذمہ" کے درمیان اس نے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ ذمیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا، البتہ اصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذی دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معافہ کریں اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معافہ کے ذمہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معافہ میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذی تو ان کا ذمہ ہونا یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان اور مال اور آبرو کی کریں گے۔ ان کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہو گی جو مسلمان کے خون کی ہے۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم بہ جبراں پر نہیں ٹھوٹی جائے گی۔

ذمیوں کے متعلق اسلام کے دستوری قانون کی تفصیلات انشاء اللہ ہم ایک کتاب کی بھل میں الگ شائع کریں گے۔ ۱۔

۴۔ جماں تک ذمیوں کے پر مشتمل لاء کا تعلق ہے وہ ان کی نہ ہی آزادی کا ایک لازمی جز ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح و طلاق اور قوانین وراثت و تہذیت کو اور ایسے عی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے نہ مگراتے ہوں، ان پر جاری کرے گی اور صرف ان امور میں ان کے پر مشتمل لاء کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا برا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تو ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی ذی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بد کاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے، کیونکہ یہ اخلاق انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تحریمات (Criminal Law) سے بھی مگرائی ہے، جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون بھی ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے امور کو قیاس کر سکتے ہیں۔

۵۔ آپ کا یہ سوال کہ آزادی ملک کے ل Clem و نق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گایا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لئے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومت ایسے میں دیں گے؟ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر منی ہے۔ ایک یہ کہ اصولی غیر قومی حکومت (Ideological Non-National State) کی صحیح حیثیت آپ نے اس

۱۔ اس موضوع پر جماعت اسلامی کی طرف سے دو مشتمل رسائل شائع ہو چکے ہیں۔

میں بخود نہیں رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ کاروباری لین دین کی ذہنیت اس میں جملکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اول میں تصریح کر چکا ہوں، اصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اٹھاسکتے ہیں جو اس اصول پر تعین رکھتے ہوں۔ وہی اس کی روح کو سمجھ سکتے ہیں، انہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین و ایمان سمجھتے ہوئے اس "ریاست" کے کام کو چلاں گے اور انہی سے نیہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لئے گر ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں تربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اصول پر ایمان نہیں رکھتے، اگر حکومت میں شریک کئے بھی جائیں گے تو وہ اس کی اصولی اور اخلاقی روح کو سمجھ سکیں گے۔ وہ اس روح کے مطابق کام کر سکیں گے اور وہ ان کے اندر ان اصولوں کے لئے اخلاص ہو گا جن پر اس حکومت کی عمارت قائم ہو گی۔ سول مکبوں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر طازمانہ ذہنیت کا فرمہ ہو گی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور اپنی قابلیتیں پھیلیں گے اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرانے کے سپاہیوں (Merecenaries) گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے اس لئے اصولاً" اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہل ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے بر عکس فوجی حفاظت کا پورا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہل ذمہ سے صرف ایک وقاری ٹیکس لینے پر اتفاق کرتی ہے۔ لیکن یہ ٹیکس اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہل ذمہ سے نہیں لئے جاسکتے۔ اگر اہل ذمہ بطور فوجی خدمت کے اپنے آپ کو پیش کریں تو وہ ان سے قبول کر لی جائے گی اور اس صورت میں وقاری ٹیکس ان سے نہ لیا جائے گا۔ رہے سول مجھے تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عمدے جو پالیسی کے تعین و

تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں، بہر حال اہل ذمہ کو نہیں دیئے جاسکتے۔ البتہ کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو اسلامی شوریٰ کے لئے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہل ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کو تسلیم بنا دی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی وجہ بحال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی لطمہ و نق کے متعلق اپنی خواہشات، اپنی ضروریات اور شکایات اور اپنی تجویز کا اطمینان بھی کر سکیں گی جن کا پورا پورا الحاظ اسلامی مجلس شوریٰ (Assembly) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومت ایسے کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے، جو بھی اس کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ لیکن جو اس کے اصول کو تسلیم نہ کرے وہ خواہ مسلم زادہ ہی کیوں نہ ہو، حکومت کی محافظت (Protection) سے قادر تو اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ "کیا ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرے گے جو حکومت ایسے میں ہندوؤں کو دے گے؟" دراصل مسلم ریگ کے لیڈرؤں سے کیا جانا چاہئے تھا، کیونکہ لین دین کی باتیں وہی کر سکتے ہیں۔ ہم سے آپ پوچھیں گے تو ہم تو اس کا بے لاگ اصولی جواب دیں گے۔

جہاں حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اصولاً "دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں:

یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو۔

یا پھر ایسی حکومت جو وطنی قومیت کی بنیاد پر ہو۔

پہلی صورت میں آپ کے لئے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہئے کہ جیسے حقوق حکومت ایسے میں ہندوؤں کو ملیں گے دیسے ہی حقوق ہم "رام راج" میں مسلمانوں

کو دے دیں گے۔ بلکہ آپ کو اس معاملہ میں اگر کوئی رحمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم و کاست اسی پر عمل کریں گے، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملہ سے بہتر ہو گا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پالیں گے، اور بعد نہیں کہ ایک روز ہماری حکومت ایسے آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر معاملہ ان کے بر عکس ہوا تو ظاہر ہے کہ دیریا سوریہ بھی بر عکس ٹھلل کر رہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت وطنی قومیت کی بنیاد پر قائم ہو تو اس صورت میں بھی آپ نے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جموروی (Democratic) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں، یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (Subject Nation) کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔

ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں۔ بہر حال آپ کے بر تاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست آن اصولوں میں ذرہ برا بر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمیوں سے معاملہ کرنے کے لئے قرآن و حدیث میں مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اپنی قوی ریاست میں مسلمانوں کا قتل عام کر دیں اور ایک مسلمان بچے تک کو زندہ نہ چھوڑیں۔ اسلامی ریاست میں اس کا انتقام لینے کے لئے کسی ذمی کا بال تک بیکانہ کیا جائے گا۔ اس کے بر عکس آپ کا جی چاہے تو ہندو ریاست میں صدر جموروی اور وزیر اعظم اور کمائڈر انجیف سب ہی کچھ مسلمان باشندوں کو بنا دیں۔ بہر حال اس کے جواب میں کوئی ایک ذمی بھی کسی ایسی پوزیشن پر مقرر نہیں کیا جائے گا جو اسلامی ریاست کی پالیسی کی خل اور سست معین کرنے میں دخل رکھتی ہو۔

## مزید تصریحات

سوال : آپ کی جملہ تصانیف اور سابق علیت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عمد میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہو گی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ”ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی انہیں ان کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا۔“ مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہو گایا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کر لے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے؟ خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ۔“ برآہ کرم اس کی توضیح کیجئے کہ ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اس احساس برتری (Superiority Complex) کے بارے میں مندرجہ ذیلیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (Justification) کے لئے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا آپ یہ مانے کے لئے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول ..... کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کریمتر کے اصولوں پر پورے اتریں گے؟ آج کے

مسلمان کی بات تو اگر رہی۔ کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافت راشدہ کے عمد میں اکثر دیشتر جو لوگ اسلام لائے وہ زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہیں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمائیے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تمیں پہنچتیں سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علی ہلہ جسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر مخالفت ہوئی اور خاندان میں حضرت عائشہ صاحبہ تک تھیں؟

نیز یہ گرد بھی کھولئے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرز حکومت کو چلانے کے لئے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کریکٹر کی خصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے؟ جب کہ حضرت ابو بکر صدیق ہلہ، حضرت عمر ہلہ، حضرت عثمان غنی ہلہ اور حضرت علی ہلہ جسے عدیم المثال بزرگ اسے چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے۔ چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیش نظر ہیں جن کی بنا پر آپ کی دور رس نگاہیں حکومت ایسے کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور و شور سے سمجھیں رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ یعنی اسلام ہے۔ مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے، یعنی آپ کے پاس عمد خلافت راشدہ کی اصولی حکومت چلانے کے لئے فی زمانہ کریکٹر کے آدمی کہاں ہیں؟ پھر جب کہ وہ بہترین نمونہ کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش نہیں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

جواب : آپ کے سوالات کا سراحتیقت میں ابھی تک میں نہیں پاس کا ہوں۔ اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات تکل آپتے

ہیں جن کے نکلنے کی بجائے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر پتدرج فروعی معاملات اور وقتی سیاست (Current Politics) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے۔ سردست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ”جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں اس میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت وہی ہو گی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے۔“ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ یا تو آپ ذمیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں یا ہندوؤں میں اچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اول تو اچھوتوں کی جو حیثیت منوکے دھرم شاستر سے معلوم ہوتی ہے اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیئے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے۔ اور ذمیت کی بنیاد مخفی عقیدہ پر۔ اگر ذمی اسلام قبول کر لے تو وہ ہمارا امیر و امام تک بن سکتا ہے۔ مگر کیا ایک شور ور کسی عقیدہ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد درن آشرم کی پابندیوں سے بری ہو سکتا ہے؟

آپ کا یہ سوال بہت ہی عجیب ہے کہ ”کیا ایک ہندو رجھے ہوئے بھی آپ کی حکومت کے اصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہو سکتا ہے؟“ شاید آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسلامی حکومت کے اصولوں پر ایمان لے آنے کے بعد ہندو ہندو کب رہے گا، وہ تو مسلم ہو جائے گا۔ آج جو کروڑوں ”ہندو زادے“ اس ملک میں مسلمان ہیں وہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لا کر ہی تو مسلمان ہوئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ جو ہندو زادے اسے مان لیں گے وہ بھی مسلم ہو جائیں گے۔ اور جب وہ مسلم ہو جائیں گے تو یقیناً ”اسلامی حکومت کو چلانے میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔

آپ کا یہ سوال کہ "آیا ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہو گایا نہیں۔" جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذی گروہوں کو حاصل ہو گا۔ دوسرا شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجودہ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے۔ اس کی اجازت بھی زمیوں کو ہو گی، مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنادین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسرا شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک مظہم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مال یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون "اسلام میں قتل مرتد کا حکم" ملاحظہ فرمائیے۔<sup>۱</sup>

اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہل کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساس برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفیاتی حقیقت پر مبنی ہے، مرو بالعلوم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعلوم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلم اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہوتا ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنا لے گی اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسلمان عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو

<sup>۱</sup> یہ مضمون اب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ "مرتد کی سزا۔ اسلامی قانون میں۔" مطبوعہ اسلامک پبلی کیشور لمبیڈ لاہور۔

جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنائے سکے گی۔ اسی لئے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی سکتی کہ وہ اپنی لوگوں کا نکاح غیر مسلم سے کریں۔ البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص خود اپنی بھی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم یوہی کی محبت میں جلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت اسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے موقع پر یہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبول عام حاصل ہو، بلکہ بعض حالات میں تو اس سے منع بھی کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے کے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشوونما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پہنچیس سال چل کر کیوں رہ گئی، ایک اہم تاریخی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہ ہو گا۔ کسی خاص اصول کی علیحدہ جماعت جو نظام زندگی قائم کرتی ہے اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر محصر ہوتا ہے کہ لیڈر شپ ایک ایسے چیزوں گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا اور سرگرم ہیرو ہے۔ اور لیڈر شپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جب کہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عنیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہو کہ اسے اس خاص اصول کے ساتھ گری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لئے تیار بھی نہ ہو جو اس اصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقہ کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالئے۔

نی اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا اور جو نیا نظام زندگی قائم ہوا اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب (Moral Revolution) واقع ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا اس کی قیادت تمام اہل عرب نے تسلیم کر لی۔ لیکن آگے چل کر بعد خلافت راشدہ میں جب ملک پر ملک بیٹھ ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی ملکت میں توسعہ بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہو سکا۔ چونکہ اس زمانے میں نشر و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ کے ذریع احتیجت نہ تھے جتنے آج ہیں اور زندہ وسائل حمل و نقل موجودہ زمانہ کے مانند ہوئے ان لئے جو فوج در فوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے ان کو اخلاقی، ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں کامل طور پر جذب کرنے کا انعام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن اصولاً "ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے جب حضرت علیؓ کے زمانہ میں ارتھاگی تحریکیں<sup>۱</sup>

(Reactionary Movements) رونما ہوئیں تو مسلمان پاک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہو گیا اور لیدر شپ ان لوگوں کے ہاتھ سے کھل گئی جو یہ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے۔ اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرہ برابر بھی ول شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت نہیں پہنچتیں سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق اور اس سیرت کے

<sup>۱</sup> یعنی جن کا مقصد اسلام سے پھر کی نہ کسی طرح کی جالمیت کی طرف پلٹ جانا تھا۔

انسانوں کا مغلوم کر سکیں جو اسلام کے خلاف کے مطابق ہو تو ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھا کرنے صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی و تہذیب انقلاب برپا کر سکیں گے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے مغلوم ہو جانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جا سکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کر رہے ہیں وہ اس حالت پر چپاں نہیں ہو سکتی جو ہمارے پیش نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدان عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، یہودی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہو جائیں گے اور خود اپنے ہم نہب لیڈروں کو چھوڑ کر ان پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعہ سے تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری مدد کرے۔

### (ب) ذمیوں کے حقوق<sup>۱</sup>

سوال : اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو، مثلاً یہودی، یہودی، بدھ، چین، پارسی، ہندو وغیرہ کو کیا مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟ کیا ان کو اپنے نہب کی تبلیغ بھی اسی طرح کرنے کی اجازت ہو گی جیسا کہ آج کل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پر پچار ہوتا ہے؟ کیا اسلامی مملکت میں ایسے نہبی یا شتم نہبی اوارے مثلاً ادارہ مکتبی فوج (Salvation Army) کی تھڈرل، کانونٹ، پینٹ

جان یا سیٹ فرانسز وغیرہ جیسے ادارے "قانوناً" بند کر دیئے جائیں گے (جیسا کہ حال میں سیلوں میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے) یا فراخ دلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماؤن ابجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہو گی؟ کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ وصول کرنا مناسب ہو گا (عالمی حقوق، انسانی کی روشنی میں بھی) جب کہ وہ نہ صرف فوج اور سرکاری عمدوں پر فائز اور حکومت کے وفادار ہوں؟

**جواب :** اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (Civil Rights) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے مگر سیاسی حقوق (Political Rights) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلاسیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں اس لئے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کئے جاسکتے۔ البتہ نظم و نسق میں ایسے عمدےے ان کو دیئے جاسکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرز عمل منافعناہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرز عمل صاف صاف ایمان دارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عمل در آمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخ دلی کا بر تماڈ کرتے ہیں۔ غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں (National Minorities) کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں مگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کوشک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (Negroes) کے ساتھ اور روس میں غیر کیونٹ باشندوں کے ساتھ اور چین و ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک

ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خواہ تجوہ دوسروں سے شرما کر ہم اپنے ملک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جنماں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب تک ہم بالکل خود کشی کے لئے ہی تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حفاظت نہیں کرنی چاہئے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقت و را قلیت پیدا ہونے دیں جو فیر مکمل سرمایہ سے پروردش پائے اور ہٹھے اور جس کی پشت پناہی ہیروئی حکومتیں کر کے ہمارے لئے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدت دراز تک ترکی کے لئے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔

عیسائی مشنوں کو یہاں مدارس اور ہسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ (De-Nationalise) کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قوی خود کشی ہے۔ ہمارے حکمران اس معاملہ میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو قریب کے قائدے تو نظر آتے ہیں مگر دور دس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت کے لئے ریاست کا ہے جب کہ وہ یا تو مفتوح ہوئے ہوں یا کسی معاہدہ کی رو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لئے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔

(۵)

## چند متفق مسائل

(الف) تعبیر دستور کا حق۔

سوال : دستور کی تعبیر کا حق کس کو ہونا چاہئے؟ مخففہ کو یا عدیہ کو؟ سابق دستور میں یہ حق عدیہ کو تھا اور موجودہ دستور میں یہ حق عدیہ سے چھین کر مخففہ کو ہی دے دیا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عدالتوں کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے اور یہ حق عدیہ کے پاس باقی رہنا چاہئے۔ اس مسئلہ پر ایک صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ اسلام کے دور اول میں عدالتوں کا کام صرف مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ قانون کی تشریع اور تعبیر کا حق عدالتوں کو نہ تھا اور نہ عدالتیں یہ طے کرنے کی مجاز تھیں کہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ یہ رائے کہاں تک درست ہے؟<sup>۱</sup>

جواب : موجودہ زمانے کے قانونی و دستوری مسائل پر اسلام کے دور اول کی نظریں چپاں کرنے کا رجحان آج کل بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن جو لوگ اس طرح کے استدلال کرتے ہیں وہ بہت اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس وقت کے معاشرے اور ہمارے آج کے معاشرے میں، اور اس وقت کے کار فرماؤں اور اس دور کے کار فرماؤں میں فی الواقع موجود ہے۔

خلافت راشدہ میں خلیفہ خود قرآن و سنت کا بہت بڑا عالم ہوتا تھا اور اس کی

<sup>۱</sup> ترجمان القرآن۔ جلد ۵۹۔ عدد ۳۔ دسمبر ۱۹۷۲ء

<sup>۲</sup> واضح رہے کہ اب دستور میں ترمیم ہو چکی ہے اور تعبیر دستور کا حق عدیہ کو دیا جا چکا ہے۔

متقبانہ بیرت کی وجہ سے مسلمان اس پر یہ اعتماد رکھتے تھے کہ زندگی کے کسی مسئلے میں بھی اس کا اجتہاد کبھی دین کے راستے سے منحرف نہ ہو گا۔ اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان بھی سب کے سب بلا استثناء اس بنیاد پر رکنیت کا شرف حاصل کرتے تھے کہ وہ قوم میں سب سے زیادہ دین کے جانے اور بخشنے والے ہیں۔ ان کے ذمہ میں کوئی ایسا آدمی بار نہیں پاسکا تھا جو دین سے جالیں ہو، یا نفیانیت کی بنا پر دین میں تحریف کرنے والا ہو، یا جس سے مسلمانوں کو کسی بدعت یا فیر اسلامی رہنمائی کا اندریشہ ہو۔ معاشرے کی عظیم اکثریت بھی اس وقت دین کے رنگ میں رُگی ہوئی تھی اور کوئی شخص اس ماحول میں یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے خلاف کوئی حکم دے یا کوئی قاعدہ و ضابطہ جاری کر دے۔ کسی بلند معیار اس وقت کی عدالتون کا بھی تھا۔ منصب قضاپر وہ لوگ سرفراز ہوتے تھے جو قرآن و سنت میں گردی بیسرت رکھتے تھے، کمال درجہ کے متین و پرہیزگار تھے اور قانون خداوندی سے بال برابر بھی تجاوز کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں مقتضہ اور عدیلہ کے تعلقات کی وجہی نوعیت تھی جو ایسے معاشرے میں ہونی چاہئے تھی۔ تمام صحیح مقدمات کے فیصلے برآہ راست قرآن و سنت کے احکام کی بنیاد پر کرتے تھے اور جن امور میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی تھی ان میں بالعموم وہ خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ جہاں معاملات کی نوعیت اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ جو اپنے انفرادی اجتہاد سے فیصلہ نہ کریں بلکہ خلیفہ کی مجلس شوریٰ ان میں شریعت کا حکم مشخص کرے، ان کے پارے میں اجتماعی اجتہاد سے ایک ایسا ضابطہ ہا دیا جاتا تھا جو دین کے اصولوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہو سکتا تھا۔ اس قام میں کوئی وجہ نہ تھی کہ جوں کو مجلس شوریٰ کے ہنائے ہوئے قانون پر نظر ہانی کرنے کا اختیار ہوتا کیونکہ وہ اگر کسی قانون کو رد کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے تو اسی بنیاد پر تو ہو سکتے تھے کہ وہ اصل دستور (یعنی قرآن و سنت) کے خلاف ہے۔ اور قانون وہاں سرے سے کسی ایسے معاملہ میں ہایا ہی نہیں جاتا تھا

جس کے متعلق قرآن و سنت میں واضح حکم موجود ہو۔ قانون سازی کی ضرورت صرف ان معاملات میں پیش آتی تھی جن میں نص موجود نہ ہونے کی وجہ سے اجتہاد ناگزیر ہوتا تھا اور ایسے معاملات میں ظاہر ہے کہ افرادی اجتہاد کی ہے نبہت اجتماعی اجتہاد زیادہ قابل اعتماد ہو سکتا تھا، خواہ بعض افراد کا ذاتی اجتہاد اس سے خلاف ہی کوئی نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اس وقت کی یہ دستوری نظر آج کے حالات پر کسی طرح بھی چپاں نہیں ہوتی۔ نہ آج کے حکمران اور مجلس قانون ساز کے ارکان خلفائے راشدین اور ان کی مجلس شوریٰ سے کوئی نبہت رکھتے ہیں، نہ آج کے بچ اس وقت کے قانیوں میں ہیں اور نہ اس دور کی قانون سازی ان حدود کی پابند ہے جن کی پابندی اس دور میں کی جاتی تھی۔ اس لئے اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے دستوری ضابطے اس وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تجویز کریں اور خلافت راشدہ کی نظیروں پر عمل شروع کرنے سے پہلے وہ حالات پیدا کرنے کی غر کریں۔ جن سے وہ نظیروں عملاً تعلق رکھتی تھیں۔ موجودہ حالات میں جہاں تک شرعی معاملات کا تعلق ہے، آخری فیصلہ نہ انتقامیہ پر چھوڑا جاسکا ہے، نہ مقتضہ پر، نہ عدیہ پر اور نہ مشاورتی کو نسل پر۔ ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مسلمان شرعی امور میں اس پر کامل اعتماد کر سکیں۔ شریعت کو منحر کرنے والے اجتہادات سے امن میر آنے کی صورت اس کے سوانحیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عام کو بیدار کیا جائے اور قوم بھیت مجبوی اس قسم کے ہر اجتہاد کی مزاحمت کے لئے تیار ہو۔ رہے عام دستوری مسائل، جن میں شریعت کوئی حقی یا ثابت احکام نہیں دیتی، ان میں مقتضہ کو آخری فیصلہ کن اختیارات دے دیں، بحالات موجودہ خطرے سے غالی نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک غیر جانب دار ادارہ ایسا موجود ہونا چاہئے جو یہ دیکھ سکے کہ مقتضہ نے کوئی قانون ہانے میں دستور کے حدود سے تجاوز تو نہیں کیا ہے اور ایسا ادارہ ظاہر ہے کہ عدیہ ہی ہو سکتا ہے۔

(ب) اسلام اور جموریت<sup>۱</sup>

سوال : جموریت کو آج کل ایک بہترن نظام قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سیاست کے بارے میں بھی کسی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بہت بڑی حد تک جموری اصولوں پر منی ہے۔ مگر میری نگاہ میں جموریت کے بعض نتائج ایسے ہیں جن کے متعلق میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اسلام انہیں کس طرح دور کر سکتا ہے۔ وہ نتائج درج ذیل ہیں:

- ۱۔ دوسرے سیاسی نظاموں کی طرح جموریت میں بھی عملاً آخر کار اقتدار جمور کے ہاتھوں سے چمن کر اور چند افراد میں مرکز ہو کر جنگ زرگری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور (Plutocracy) یا (Oligarchy) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا کیا حل ممکن ہے؟
- ۲۔ عوام کے متنوع اور حضار مفاہمات کی بیک وقت رعایت ملحوظ رکھنا نفیاتی طور پر ایک بڑا مشکل کام ہے۔ جموریت اس عوامی ذمہ داری سے کس مشکل میں عمدہ برآ ہو سکتی ہے؟
- ۳۔ عوام کی اکثریت جانل، سادہ لوح، بے حصہ اور شخصیت پرست ہے اور خود غرض عناصر انہیں برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں نیا نتیجہ اور جموری ادارت کے لئے کامیابی سے کام کرنا بڑا دشوار ہے۔

۴۔ عوام کی تائید سے جو انتخابی اور نمائندہ مجالس وجود میں آتی ہیں، ان کے ارکان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے اور ان کے مابین باہمی بحث و مشاورت اور آخری فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ رہنمائی فرمائیں کہ آپ کے خیال میں اسلام اپنے جمہوری ادارت میں  
ان خرایوں کو راہ پانے سے کیسے روکے گا؟

جواب : آپ نے جمہوریت کے بارے میں جو تفید کی ہے اس کے تمام نکات  
اپنی جگہ درست ہیں، لیکن اس مسئلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے چند اور  
نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لئے اصول "کون سا طریقہ  
صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے  
سربراہ کا مقرر کئے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات  
چلانیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو حاصل رہے اسی وقت تک وہ  
سربراہ کا بر رہیں؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا مگر وہ خود سربراہ کا بن بیٹھے اور اپنی مرضی  
سے معاملات چلانے اور اس کے تقریر اور علیحدگی اور کارپروپردازی میں سے کسی چیز  
میں بھی ان لوگوں کی مرضی درائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو،  
اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور بھی برانصاف ہے تو ہمارے لئے دوسری  
صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہئے اور ساری بحث اس  
پر ہونی چاہئے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔  
دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل  
میں لانے کی وجہے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں،  
ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پر کھا  
جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی  
ہیں، تو کوئی تابعی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اول یہ کہ "جمہور" کو عمار مطلق اور حاکم مطلق (Sovereign) فرض کر  
لیا گیا اور اس پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب  
بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں عمار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی

جمهوری کے حاکیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمورویت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چند پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جموروں پر چند آدمیوں کی عملی حاکیت ہے۔ اسلام پہلے یہ قدم پر اس کا سمجھ علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمورویت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند نہیں کرتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (Sovereign) نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جموروں اور اس کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمورویت کی ہاتھی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمورویت اس وقت تک نہیں ہمیں سمجھی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سارنے کے لاکن شور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ احلام اسی لئے عام مسلمانوں کی فرداً "فرداً" تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا معاشرہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چنی جنی کم مددگی جمورویت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور یہ جتنی زیادہ ہو گی، امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمورویت کے کامیابی کے ساتھ پہلے کا انحصار ایک پیداوار مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے علمہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب محاشرہ اجھے افراد پر مشتمل ہو، ان افراد کو صلح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں فلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اجتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس میں نہ پھول پھول سکیں اور نیک لوگ یہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لئے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ ہلاتینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمورویت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی تھائی جائے، وہ کامیابی کے ساتھ ہمیں سمجھی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی تھائی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح و ارتقاء کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ

جمهوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بذریعہ ایک ناقص مشینری بھڑا اور کامل تر بھی چلی جائے گی۔

### (ج) صدر ریاست کو ویٹو کا حق<sup>۱</sup>

سوال : کچھ عرصہ سے اخبارات کے ذریعہ سے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ صدر پاکستان کو خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین کے معزز خطاب سے آرائشہ کیا جائے۔ اس تصور میں مزید جان ڈالنے کے لئے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر کو حق تنخیلنا چاہئے کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رض نے جلیل القدر صحابہ کے مقابلے میں ویٹو سے کام لیا۔ اور مکریں زکوٰۃ و مدحیان نبوت کی سرکوبی کے لئے جماد کا حکم دے کر صحابہ رض کی رائے کو رد کر دیا۔ کیا اس دلیل سے شرعی جیشیت کے ساتھ ویٹو ہیے و حاصلی آمیز قانون کو محکم فرمایا جا رہا ہے۔

ان حالات کی روشنی میں جذب والا کی خدمت میں چند سوالات پیش کئے جا رہے ہیں امید ہے کہ بصرافت جوابات سے مطمئن فرمائیں گے۔

۱۔ کیا حضرت ابو بکر رض نے آج کے معنوں میں ویٹو استعمال فرمایا تھا؟

اور

۲۔ اگر استعمال فرمایا تھا تو ان کے پاس کوئی شرعی دلیل تھی یا نہیں؟

جواب :: خلافے راشدین کی حکومت کے نظام اور آج کل کے صدارتی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز صرف دی لوگ قرار دے سکتے ہیں جو اسلام کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ میں نے اس فرق پر مفصل بحث اپنی کتاب اسلامی ریاست میں صفحہ ۳۲۳ تا ۳۲۴ پر کی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جس چیز کو خلافت کے نظام میں ”وینو“ کے اختیارات سے تغیر کیا جا رہا ہے وہ موجودہ زمانے کی دستوری اصطلاح سے بالکل مختلف چیز تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صرف دو فیصلے ہیں جن کو اس معاملہ میں بنائے استدلال بنا�ا جاتا ہے۔ ایک جیش اسامہ کا معاملہ۔ دوسرے مرتدین کے خلاف جہاد کا مسئلہ۔ ان دونوں معاملات میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے محض اپنی ذاتی رائے پر فیصلہ نہیں کر دیا تھا، بلکہ اپنی رائے کے حق میں کتاب و سنت سے استدلال کیا تھا۔ جیش اسامہ کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جس کام کا فیصلہ نبی اکرم ﷺ اپنے عہد میں کر چکے تھے اسے حضور اکرم ﷺ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دیا میرا فرض ہے۔ میں اسے بدل دینے کے اختیارات نہیں رکھتا۔ مرتدین کے معاملہ میں ان کا استدلال یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ بھی نماز اور زکۃ میں غلط کرتا ہو، اور یہ کہ کہ میں نماز تو پڑھوں گا لیکن زکۃ ادا نہیں کروں گا، وہ مرتد ہے، اسے سلطان سمجھنا ہی غلط ہے، لہذا ان لوگوں کی دلیل قابل قبول نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے قائلین پر تم کیسے تکوار اٹھاؤ گے۔ یہی دلائل تھے جن کی بنا پر صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے آگے سرجحا دیا۔ یہ اگر ”وینو“ ہے تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا وینو ہے نہ کہ سربراہ ریاست کا۔

حقیقت میں اسے وینو کہنا یہ سرے سے غلط ہے، کونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے استدلال کو تسلیم کر لینے کے بعد اختلاف کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اس کی صحت کے قائل ہو گئے تھے اور اپنی سابقہ رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا تھا۔

حصہ سوم

## اسلام کا اصول حکمرانی

- انسان کے بیادی حقوق
- غیر مسلموں کے حقوق
- اسلام اور عدل اجتماعی
- اسلامی ریاست کے رہنماء اصول  
(قرآن کی روشنی میں)

باب ۱۷

انسان کے بنیادی حقوق

ایک مدت سے یہ سوال زیر بحث ہے کہ آیا اسلام نے کچھ بنیادی انسانی حقوق کی صفائت دی ہے یا نہیں۔ جو لوگ صرف مغرب کی تاریخ اور اس کے سیاسی ارتقاء ہی سے واقف ہیں وہ اپنی لاطینی میں اس خیال کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اس پابند میں اصل ترقی مغربی حماکت ہی میں ہوئی ہے حالانکہ یہ بات بد اہتا "غلط ہے۔ اسلام نے انسانی حقوق کی صفائت اس وقت دی جب دنیا اس تصور سے نا آشنا تھی۔ اور یہی الہامی ہدایت کا اعجاز ہے کہ وہ زندگی کی ان بنیادوں کو واضح کرتی ہے جن تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے روٹری کلب لاہور کی دعوت پر انسانی حقوق کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا جسے ظیلی حامدی صاحب نے قلم بند کر لیا تھا۔ یہاں اس تقریر کو درج کیا جا رہا ہے۔

یہ انسانی حقوق ایک طرف اسلامی ریاست کے دستور کا ایک باقابل تشریف جزو ہوتے ہیں اور دوسری طرف اسلام کی تمام پالیسیوں کے لئے رہنماء اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حصہ سوم کا آغاز انسانی حقوق کے بیان سے کیا جا رہا ہے۔

## انسان کے بنیادی حقوق

جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، انسان کے بنیادی حقوق کا تصور ہمارے لئے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی فگاہ میں ان حقوق کی تاریخ یو، این، او کے چارڑ سے شروع ہوتی ہو یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna Carta) سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن ہمارے لئے اس تصور کا آغاز بہت پہلے سے ہے۔ اس موقع پر میں انسان کے بنیادی حقوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے مختصر طور پر یہ عرض کروں گا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی حقوق کے تصور کا آغاز کیونکر ہوا ہے۔

### بنیادی حقوق کا سوال کیوں؟

درحقیقت یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ دنیا میں ایک انسان ہی ایسا ہے جس کے پارے میں خود انسانوں ہی کے درمیان بار بار پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ انسان کے سو ادوی مخلوقات جو اس کائنات میں بس رہی ہیں، ان کے حقوق خود فطرت نے دیئے ہیں اور آپ سے آپ انہیں مل رہے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے لئے سوچ پھاڑ کریں۔ لیکن صرف انسان وہ مخلوق ہے جس کے پارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس کے حقوق متعین کئے جائیں۔

اتھی ہی عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی کوئی جس ایسی نہیں ہے جو اپنی جس کے افراد سے وہ معاملہ کر رہی ہو۔ جو انسان اپنے ہم جس افراد سے کر رہا ہے بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی کوئی قوع ایسی نہیں جو کسی دوسری قوع کے

حیوانات پر بھی محض لطف و لذت کے لئے یا ان پر حکمران بننے کے لئے جملہ آور ہوتی ہو۔

قانون فطرت نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے لئے اگر غذا بنا�ا ہے تو وہ صرف غذا کی حد تک ہی اس پر دست درازی کرتا ہے۔ کوئی درندہ ایسا نہیں ہے جو غذائی ضرورت کے بغیر یا اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد بلا وجہ جانوروں کو مارتا چلا جاتا ہو۔ خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نوع حیوانی کا وہ سلوک نہیں ہے جو انسان کا اپنے افراد کے ساتھ ہے۔ یہ غالباً اس فضل و شرف کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ذہانت اور قوت ایجاد کا کرشمہ ہے کہ انسان نے دنیا میں یہ غیر معمولی روشن انتیار کر رکھی ہے۔

شیروں نے آج تک کوئی فوج تیار نہیں کی۔ کسی کتنے نے آج تک دوسرے کتوں کو فلام نہیں بنا�ا۔ کسی مینڈک نے دوسرے مینڈکوں کی زبان بندی نہ کی۔ یہ انسان ہی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر جب اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لیتا شروع کیا تو اپنی ہی جس پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اس وقت سے آج تک تمام حیوانات نے اتنے انسانوں کی جان نہیں لی ہے جتنی انسانوں نے صرف دوسرا جنگ عظیم میں انسان کی جان لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو فی الواقع دوسرے انسانوں کے بُنیادی حقوق کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جس نے انسان کی رہنمائی اس باب میں کی ہے اور اپنے پیغمبروں کی دعا سلطت سے انسانی حقوق کی واقفیت بھی پہنچائی ہے۔ درحقیقت انسانی حقوق تعین کرنے والا انسان کا خالق ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خالق نے انسان کے حقوق نہایت تفصیل سے ہتائے ہیں۔

### دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقاء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقوق انسانی کے اسلامی مشبور کے نکات پر محفوظ کرنے سے قبل دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ پر اجمالي نظر

ڈال لی جائے۔

(۱) انگلستان میں سمجھ جانے ۱۷۵۱ء میں جو بینکنا کارٹا جاری کیا تھا، وہ دراصل اس کے امراء (Barons) کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس کی حیثیت پادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی تھی اور زیادہ تر امراء ہی کے مفاد میں وہ مرتب کیا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کا اس میں کوئی سوال نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کے اندر وہ معنی پڑھے جو اس کے اصل لکھنے والوں کے سامنے بیان ہوتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ سترہویں صدی کے قانون پیشہ لوگوں نے اس میں یہ پڑھا کہ "تحقیق جرم روپرورے مجلس قضا (Trial by Jury)" جس بھاکے خلاف دادری کنٹرول کے حقوق الگینڈ کے باشندوں کو اس میں دیئے گئے ہیں۔

(۲) ٹام پین (Tom Paine) (۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء) کے پھلٹ "حقوق انسانی" (Rights of Man) نے اہل مغرب کے خیالات پر بہت بڑا انقلابی اثر ڈالا اور اسی کے پھلٹ (۱۷۹۱ء) نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کی عام اشاعت کی۔ یہ شخص الہامی مذہب کا قائل نہ تھا اور ویسے بھی وہ دور الہامی مذہب سے بغاوت کا دور تھا۔ اس نے مغربی عوام نے یہ سمجھا کہ الہامی مذہب حقوق انسانی کے تصور سے خالی ہے۔

(۳) انقلاب فرانس کی داستان کا اہم ترین ورق "مشور حقوق انسانی" (Declaration of the Rights of Man) ہے جو ۱۷۸۹ء میں نمودار ہوا۔ یہ انھارہویں صدی کے اجتماعی فلسفے اور "خصوصاً" روسو کے نظریہ معاہدہ عمرانی (Social Contract Theory) کا شروع تھا۔ اس میں قوم کی حاکیت، آزادی، مساوات اور ملکیت کے فطری حقوق کا اثبات کیا گیا تھا۔ اس میں دوست کے حق، قانون سازی اور سمجھی عائد کرنے کے اختیارات پر رائے عام کے کنٹرول، "تحقیق جرم روپرورے مجلس قضا (Trial by Jury)" دغیرہ کا اثبات کیا

میا۔<sup>۱</sup>

اس مشور حقوق انسانی کو فرانس کی دستور ساز اسمبلی نے اعلان فرانس کے  
حد میں اس غرض کے لئے مرتب کیا تھا کہ جب دستور بنایا جائے تو اس وقت اسے  
اس کے آغاز میں درج کیا جائے اور دستور میں اس کی پہنچ کو ملاحظہ رکھا جائے۔

(۳) امریکہ (U.S.A) کی دس ٹرائیم میں بڑی حد تک وہ تمام حقوق گنوائے  
گئے ہیں جو برطانوی فلسفہ جمہوریت پر مبنی ہو سکتے تھے۔

(۴) انسانی حقوق و فرائض کا وہ مشور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے گوٹا  
کافرنیس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۲۸ء میں منظور کیا۔

(۵) پھر جمہوری فلسفہ کے تحت یو، این، اونے تدریجیاً بہت سے ثابت اور  
بہت سے تخفیفاتی حقوق کے متعلق قراردادیں پاس کیں اور بالآخر "عالیٰ مشور  
حقوق انسانی" مظہر عام پر آیا۔

دسمبر ۱۹۳۶ء میں اقوام متحدہ کی جنگ اسمبلی نے ایک ریزولوشن پاس کیا جس  
میں انسانوں کی نسل کشی (Genocide) کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک  
جرائم قرار دیا گیا۔

پھر دسمبر ۱۹۳۸ء میں نسل کشی کے انداد اور سزاوی کے لئے ایک قرارداد  
پاس کی گئی اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ اس میں نسل کشی کی تعریف کرتے  
ہوئے کہا گیا کہ حسب ذیل افہال میں سے کوئی فعل اس غرض سے کرنا کہ کسی قوی،  
نسلی یا اخلاقی (Ethical) گروہ (Group) یا اس کے ایک حصے کو فنا کر

۱۔ خود یہ ایک دلچسپ موضوع معالجہ ہے کہ مغرب کے انکارکمان تک اسلامی تعلیمات کے اثرات  
کا شر ہے۔ اس سلطے میں پروفیسر الیاس احمد مرحوم کی کتاب  
(The Social Contract and the Islamic State) مطبوعہ اردو جلشہ  
ہاؤس۔ الہ آباد (۱۹۷۳ء) کا محتاوی دلچسپی سے غالباً ہو گا۔ مرتب۔

دیا جائے۔

- ۱۔ ایسے کسی گروہ کے افراد کو قتل کرنا۔
- ۲۔ ان کو شدید نوعیت کا جسمانی یا ذہنی ضرر پہنچانا۔
- ۳۔ اس گروہ پر بالارادہ زندگی کے ایسے احوال کو مسلط کرنا جو اس کی جسمانی بقاء کے لئے کلا یا جزا تباہ کرن ہوں۔
- ۴۔ اس گروہ میں سلطہ تولید کو روکنے کے لئے جری اقدامات کرنا۔
- ۵۔ جری طور پر اس گروہ کی اولادوں کو کسی دوسرے گروہ کی طرف منتقل کرنا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو جو "عالیٰ منشور حقوق انسانی" پاس کیا گیا تھا، اس کے دریافتے میں من جملہ دوسرے عزائم کے ایک یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ:

"نبیادی انسانی حقوق میں، فرد انسانی کی عزت و اہمیت میں مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موڑ پہنانے کے لئے۔"

نیز اس میں اقوام متحده کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ:

"انسانی حقوق کا احترام قائم کرنے اور نسل و صنف یا زبان و مذہب کا انتیاز کے بغیر تمام انسانوں کو نبیادی آزادیاں دلوانے کے کام میں میں الاقوامی تعاون کا حصول۔"

اسی طرح دفعہ ۵۵ میں اقوام متحده کا یہ منشور کرتا ہے:

"مجلس اقوام متحده انسانی حقوق اور سب کے لئے اساسی آزادیوں کے عالم گیر احترام اور ان کی محمد اشت میں اضافہ کرے گی۔"

اس پورے منشور کے کسی جز سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان و اظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاملہ نہیں ہے جس کی بناء پر دھخڑ کرنے والی تمام حکومتوں اس کی پابندی پر مجبور ہوں اور میں الاقوامی

قانون کے مطابق ان پر قانونی وجوب عائد ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پھر بھی بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اعتراض کیا۔<sup>۱</sup>

اب دیکھ لجئے کہ اس منشور کے عین مائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہو رہا ہے اور خود مذہب ترین اور سرکردہ ممالک کے اپنے ہاں ہو رہا ہے جو اسے پاس کرنے والے تھے۔<sup>۲</sup>

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اول تو مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جا رہا ہے تو ان کے پیچے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے، بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے حقوق انسان کا ہو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی اکرم ﷺ نے مجتبہ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلام کے لئے اعتقاد، اخلاق اور خدھب کی حیثیت سے واجب الاجاع بھی۔ پھر ان حقوق کو عمل آقام کرنے کی بے شل نظریں بھی حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں۔

اب میں ان حقوق کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جو اسلام نے انسان کو دیئے ہیں۔

<sup>۱</sup> واضح رہے کہ اس اجلاس میں ۲۸ ممالک نے ان حقوق کے حق میں ووٹ دینے اور آنے دوئے دینے سے اعتراض کیا۔ ووٹ سے احتجاز کرنے والوں میں روس بھی شامل تھا۔ مرتب۔

<sup>۲</sup> مذہب دنیا میں مذہب انسان اپنے ہی اہانتے نوع کے ساتھ کیا کر رہا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو (Fanaticism Intolerance and Islam) از خورشید احمد۔ مرتب۔

## ۱۔ حرمتِ جان یا جینے کا حق

قرآن مجید میں دنیا کے سب سے پہلے واقعہ قتل کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا اولین ساخہ تھا جس میں ایک انسان نے دوسرے انسان کی جان لی۔ اس وقت پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی کہ انسان کو انسانی جان کا احترام سکھایا جائے اور اسے ہتایا جائے کہ ہر انسان جینے کا حق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

من قتل نفس ام بغير نفس او فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا  
طوفمن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا۔ (المائدہ: ۳۲)

”جس نے کسی شخص کو، بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو، قتل کر دیا“ اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اسے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔“

اس آیت میں قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانی دنیا کا قتل ہتایا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ ”احیاء“ کے معنی ہیں زندہ کرنا۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی شخص نے انسانی زندگی کو بچانے کے لئے کوشش کی اس نے انسان کو زندہ کرنے کا کام کیا۔ یہ کوشش اتنی بڑی تکی ہے کہ اسے ساری انسانیت کے زندہ کرنے کے برابر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس اصول سے صرف دو حالتوں مبتلا ہیں۔

ایک یہ کہ کوئی شخص زمین میں فساد برپا کرے تو اسے قتل کیا جائے۔ دوسری یہ کہ کوئی شخص زمین میں فساد برپا کرے تو اسے قتل کیا جائے۔ ان دو حالتوں کے مساوا انسانی جان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔“

”زید ملاحظہ ہو آئت لا تقتلوا النفس التي حرم اللہ الا بالحق۔ (بی اسرائیل: ۲۲)  
”قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔“

انسانی جان کے تحفظ کا یہ اصول اللہ تعالیٰ نے تاریخ انسانی کے پتداری دور میں واضح کر دیا تھا۔ انسان کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ تاریکی میں پیدا ہوا ہے اور اپنے ہم جنسوں کو قتل کرتے کرتے کسی مرحلہ پر اس نے یہ سوچا کہ انسان کو قتل نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی پر منی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع سے انسان کی رہنمائی کی ہے اور اس رہنمائی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس نے انسان کو انسان کے حقوق سے آشنا کیا۔

### ۲- معدودوں اور کمزوروں کا تحفظ

دوسری بات جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سے واضح ہے، یہ ہے کہ عورت، پچھے، بوڑھے، زخمی اور بیکار کے اوپر کسی حال میں بھی دست اندازی جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اپنی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے۔ الایہ کہ جنگ کی صورت میں یہ افراد خود بر سر پیکار ہوں۔ ورنہ دوسری ہر صورت میں ان پر دست اندازی کی ممانعت ہے۔ یہ اصول اپنی قوم کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ یہی اصول برداشتے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس معاملہ میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں۔ خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ وہ جب دشمنوں سے مقابلہ کے لئے فوجیں روانہ کرتے تھے تو وہ فوج کو یہ صاف ہدایات دیتے تھے کہ دشمن پر حملہ کی صورت میں کسی عورت، پچھے، بوڑھے، زخمی اور بیکار پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

### ۳- تحفظ ناموس خواتین

ایک اور اصولی حق جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور حدیث میں بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں، یہ ہے کہ عورت کی عصمت ہر حال میں واجب الاحترام ہے، یعنی جنگ کے اندر دشمنوں کی عورتوں سے بھی اگر سابقہ پیش آئے تو کسی

مسلمان سپاہی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالے۔ قرآن کی رو سے بد کاری مطلقاً "حرام" ہے خواہ وہ کسی عورت سے کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ عورت مسلمان ہو یا فیر مسلم، اپنی قوم کی ہو یا غیر قوم کی، دوست ملک کی ہو یا دشمن ملک کی۔

### ۳۔ معاشری تحفظ

ایک بیماری اصول یہ ہے کہ بھوک آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے روٹی دی جائے۔ نہ گاہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے کپڑا دیا جائے۔ زخمی اور بیمار آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے علاج کی سولت فراہم کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ بھوکا، نہ گاہر زخمی یا مریض شخص دشمن ہو یا دوست۔ یہ عمومی (Universal) حقوق میں سے ہے، دشمن کے ساتھ بھی ہم یہی سلوک کریں گے۔ اگر دشمن قوم کا کوئی فرد ہمارے پاس آ جائے گا تو ہمارا فرض ہو گا کہ اسے بھوکا نگانہ رہنے دیں اور زخمی یا بیمار ہو تو اس کا علاج کرائیں۔<sup>۱</sup>

### ۴۔ عدل و انصاف

قرآن کریم کا یہ اعلیٰ اصول ہے کہ انسان کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔  
الله تعالیٰ کا ارشاد ہے:

و لا يجرمنكم شذان قوم على الاتعدلوا۔ اعدلوا هواقرب للتقوى۔

(المائدہ: ۸۰)

<sup>۱</sup> وَفِي أموالهِمْ حُقْقُ الْمَسَائلِ وَالْمَحْرُومُونَ۔ (الذريات: ۱۹)

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم دونوں کا حق ہے۔"

نَزَّلَ اللَّهُ عَزَّ ذَلِكَ الْكِتَابَ عَلَىٰ جَبَهٍ مَسْكِينٍ أَوْ يَتِيمٍ مَا وَسِيرًا۔ (الدحیر: ۸)

"اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

”کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مستحق نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔  
عدل کرو۔ یہ خدا تری سے زیادہ قریب ہے۔“

اس آئت میں اسلام نے یہ اصول معین کر دیا کہ انسان کے ساتھ۔۔۔۔۔ ایک فرد کے ساتھ بھی اور ایک قوم کے ساتھ بھی۔۔۔۔۔ بہر حال انصاف کو محفوظ رکھنا پڑے گا۔ اسلام کے نزدیک یہ قطعاً ”درست نہیں ہے کہ دوستوں کے ساتھ تو ہم عدل و انصاف بر تھیں اور دشمنوں کے ساتھ اس اصول کو نظر انداز کر دیں۔

#### ۶۔ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون

ایک اور اصول جو قرآن معین کرتا ہے، یہ ہے کہ نیکی اور حق رسانی کے معاملے میں ہر ایک کے ساتھ تعاون کیا جائے اور برائی اور غلظہ کے معاملہ میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ برائی خواہ بھائی کر رہا ہو تو بھی ہم اس کے ساتھ تعاون نہ کریں اور نیکی اگر دشمن بھی کر رہا ہو تو اس کی جانب دست تعاون بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تعاونوا على الابرو والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان۔

(المائدہ ۲:۲۳)

”جو کام نیکی اور خدا تری کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔“

بر کے معنی صرف نیکی ہی نہیں، بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ حق رسانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کو حقوق دلوانے میں اور تقویٰ اور پرہیز گاری میں ہم ہر ایک کی مدد کریں۔ قرآن کا یہ مستقل اور داعی اصول ہے۔

#### (۷) مساوات کا حق

ایک اور اصول جسے قرآن کریم نے بڑے زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل ہے تو وہ اخلاق کے

اہم بارے ہے۔ اس معاملے میں قرآن کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّنْ ذِكْرٍ وَّأَنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شَعُوبًا وَّقَبَائلٌ

**لتعارفو ان اكرمكم عند الله اتقاكم**

”اے لوگو، ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بائیکر کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متھی ہے۔“

اس میں پہلی بات یہ ہتائی گئی کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں۔ یہ مختلف نسلیں، مختلف رنگ، مختلف زبانیں درحقیقت انسانی دنیا کے لئے کوئی معقول وجہ تقسیم نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہتائی کہ ہم نے قوموں کی یہ تقسیم صرف تعارف کے لئے کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک برادری، ایک قوم اور ایک قبیلہ کو دوسرے پر کوئی خرو نصیلت نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق تو بڑھا چڑھا کر رکھے اور دوسروں کے کم۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی یہ تفریقیں کی ہیں، شکلیں ایک دوسرے سے مختلف ہتائی ہیں یا زبانیں ایک دوسرے سے الگ رکھی ہیں، تو یہ سب چیزیں خفر کے لئے نہیں ہیں بلکہ صرف اس لئے ہیں کہ باہم تیز پیدا کر سکیں۔ اگر تمام انسان یکساں ہوتے تو تیز نہ کی جاسکتی۔ اس لحاظ سے یہ تقسیم فطری ہے۔ لیکن دوسروں کے حقوق مارنے اور بے جا امتیاز برتنے کے لئے نہیں ہے۔ عزت و افتخار کی بنیاد اخلاقی حالت پر ہے۔ اس بات کو نبی اکرم ﷺ نے ایک دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فتح کہ کے بعد جو تقریر ارشاد فرمائی، اس میں فرمایا۔

لأفضل لغة عربية على أعمى ولا لأعمى على عربٍ ولا لأحمر على أسود

ولا سود على أحمر إلا بالتفوي و لا فضل للأنساب

تقوی کے اور نبی بیادوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔“<sup>۱</sup>  
یعنی فضیلت دیانت اور تقوی پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص چاندی سے  
پیدا کیا گیا ہو اور کوئی پھر سے اور کوئی مٹی سے۔ بلکہ سب انسان یکساں ہیں۔“<sup>۲</sup>

### ۸۔ معصیت سے اجتناب کا حق

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اور نہ  
کسی پر یہ واجب یا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ اس کو اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو  
وہ اطاعت کرے۔ قانونِ قرآن کی رو سے اگر کوئی افراد پنے ماتحت کو ناجائز  
کارروائیوں کا حکم دیتا ہے یا کسی پر بے جا دست درازی کا حکم دیتا ہے تو ماتحت کے  
لئے اس معاملے میں اپنے افسر کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا  
ارشاد مبارک ہے لا طاعته لمخلوق فی معصیتہ الخالق۔ جن چیزوں کو خالق نے  
ناجائز نہ کرایا ہے اور معصیت بتایا ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ان کے ارتکاب کا  
کسی کو حکم دے۔ نہ حکم دینے والے کے لئے معصیت کا حکم دینا جائز ہے اور نہ  
کسی دوسرے شخص کے لئے اپنے حکم کی قبولی جائز ہے۔

### ۹۔ خالم کی اطاعت سے انکار کا حق

اسلام کا ایک عظیم الشان اصول یہ ہے کہ کسی خالم کو اطاعت کا حق نہیں

۱۔ قام فرعون کو قرآن نے جن وجوہ سے باطل قرار دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی کہ۔  
ان فرعون علاوی الارض وجعل اهله اشیعا یستضعف طائفہ منهم۔ (التصریح: ۳)  
”بے شک فرعون ملک میں بڑا مغدور ہو گیا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا کر کھاتھا  
اور ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ ..... اخ”  
یعنی اسلام اس کارروادا ر نہیں کہ کسی معاشرہ میں انسان کو فو قاتی اور تحفاظی یا حکمران  
اور ملکوم طبقوں میں باٹا جائے۔

ہے۔ قرآن کریم میں یہ بتایا گیا ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام مقرر کیا اور فرمایا کہ انہی جاعلک للنفس اماماً تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے سوال کیا کہ و من ذریقی (کیا میری اولاد سے بھی بھی وعدہ ہے؟) تو اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا لا ينال عهدي الظالمين<sup>۱</sup> (میرا وعدہ ظالموں کے متعلق نہیں ہے) عهد کا لفظ یہاں اس معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ انگریزی زبان میں عہد (Letter of Appointment) کا مفہوم ہے۔ اردو میں پروانہ امر کہیں گے۔

اس آیت میں اللہ نے صاف بتایا کہ ظالموں کو اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پروانہ امر نہیں کہ وہ دوسరے سے اطاعت کا مطالبہ کریں۔<sup>۲</sup> چنانچہ امام ابوحنینہ محدث فرماتے ہیں کہ کوئی خالم اس امر کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کا امام ہو۔ اگر ایسا شخص امام بن جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اسے صرف برداشت کیا جائے۔<sup>۳</sup>

۱۔ القرآن البقرہ: ۱۲۳

۲۔ مزید یہ مرتب آیات سامنے رہیں۔ ولا تطیعوا امر العاصفین۔ (الشراعہ: ۱۵۱) اور حدود سے نکل جانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔ (۲) ولا تطبع من اخلفنا قلبك عن ذكرنا۔ (الکٹت: ۲۸) اور ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ (۳) واجتنبوا الطاغوت۔ (النحل: ۳۶) اور طاغوت (خدا کے باقی) سے بچتے رہو۔ (۴) وتلك عاد قف جحدوا بآيات ربهم وعصوا رسلاه واتبعوا امر كل جبار عنيده۔ (حود: ۵۹) یہ قوم عاد تمی جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور ان کے رسولوں کا کھانا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کئے پڑھتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی تازہ ترین کتاب "خلافت و طوکیت" یہ سلسلہ مصائب ترجمان القرآن (۱۹۶۳ء۔ ۶۵) میں شائع ہو چکا ہے۔ مرتب۔

## ۱۰۔ سیاسی کار فرمائی میں شرکت کا حق

انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک بواحق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد حکومت میں حصہ دار ہیں۔ تمام افراد کے مشورے سے حکومت ہونی چاہئے۔ قرآن نے فرمایا۔ *لِيَسْتَخْلِفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ*<sup>۱</sup> (اللہ تعالیٰ ان کو۔۔۔۔۔ یعنی اہل ایمان کو۔۔۔۔۔ زمین میں خلافت و پیغام) یہاں جمع کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا کہ ہم بعض افراد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو خلافت دیں سکے۔ حکومت ایک فرد کی یا ایک خاندان کی یا ایک طبقے کی نہیں، بلکہ پوری ملت کی ہو گی اور تمام افراد کے مشورے سے وجود میں آئے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ د امرہم شوری بینہم<sup>۲</sup> یعنی یہ حکومت آپس کے مشورے ہے چلے گی۔ اس معاملے میں حضرت عمر رضوی کے صاف الفاظ موجود ہیں کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ان پر حکومت کرے۔ مسلمان راضی ہوں تو ان پر حکومت کی جاسکتی ہے اور راضی نہ ہوں تو نہیں کی جاسکتی۔ اس حکم کی رو سے اسلام ایک جمہوری و شورائی حکومت کا اصول قائم کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری بد قسمتی سے تاریخ کے ادوار میں ہمارے اوپر بادشاہیاں سلطنتی ہیں۔ اسلام نے ہمیں ایسی بادشاہیوں کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ یہ ہماری اپنی حماقتوں کا نتیجہ ہیں۔

## ۱۱۔ آزادی کا تحفظ

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی انسان کی آزادی عدل کے بغیر سلب نہیں کی جا

<sup>۱</sup>۔ القرآن (النور: ۵۵)

<sup>۲</sup>۔ القرآن (الشوری: ۳۸) نیز آیت و شاودھم فی الامر۔ (آل عمران: ۱۵۹) "اور اپنے کاموں میں ان (لوگوں) سے مشورہ کیا کرو۔"

سکتی۔ حضرت عمر رضوی نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ :- لا یوسر رجل فی الاسلام الا بحق۔<sup>۱</sup> اس کی رو سے عدل کا وہ تصور قائم ہوتا ہے جسے موجودہ اصطلاح میں باضابطہ عدالتی کارروائی (Judicial Process of Law) کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی آزادی سلب کرنے کے لئے اس پر متعین الزام لگانا، کھلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے دفاع کا پورا پورا موقع دینا۔ اس کے بغیر کسی کارروائی پر عدل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل معمولی عدل (Common Sense) کا تقاضا ہے کہ ملزم کو مخالف کا موقع دیئے بغیر انصاف نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں اس امر کی کوئی محاجات نہیں ہے کہ ایک شخص کو کپڑا جائے اور اسے مخالف کا موقع دیئے بغیر بند کر دیا جائے۔ اسلامی حکومت اور عدیلہ کے لئے انصاف کے قاضیے پورے کرنا قرآن نے واجب ثہرا�ا ہے۔<sup>۲</sup>

## ۱۲۔ تحفظ ملکیت

ایک بیانی حق یہ ہے کہ قرآن واضح طور پر انفرادی ملکیت کا تصور دیتا ہے۔  
الله تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَأْكِلُوا الْمَوْالِكَمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (البقرہ: ۱۸۸)

”تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔“

اگر قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مال کو کھانے کے کون کون سے طریقے باطل ہیں۔ اسلام نے ان طریقوں کو مسمی نہیں رکھا ہے۔ اس اصول کی رو سے کسی آدمی بے ناجائز طریقے

<sup>۱</sup> ”اسلام میں کسی آدمی کو سوائے حق کے نہیں کپڑا جائے گا۔“ بحوارہ موطا امام مالک۔

<sup>۲</sup> آیت وَاذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ انْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ (النساء: ۵۸)

”اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔“

سے کوئی مال حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی شخص کو یا کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون توز کر اور ان معین شکلؤں کے علاوہ جو خود اسلام نے واضح کر دی ہیں، کسی کی ملکیت پر دست درازی کرے۔

### ۱۳۔ عزت کا تحفظ

انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ سورہ مجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے۔ مثلاً ”ارشاد ہوتا ہے کہ

۱۔ لا يسخر قوم من قوم

”تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے۔“

۲۔ ولا تنازبوا بـ الـ قـابـ

”اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔“

۳۔ ولا يغتب بـ عـضـكـمـ بـعـضـاـ

(ال مجرات: ۱۱-۱۲) ”اور تم ایک دوسرے کی برائی پیچھے پیچھے بیان نہ کرو۔“

یعنی جتنی شکلیں بھی انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے کی ہو سکتی ہیں۔ ان سے منع کر دیا گیا۔ وضاحت سے کہہ دیا کہ انسان خواہ موجود ہو خواہ موجود نہ ہو اس کا نہ مذاق اڑایا جاسکتا ہے، نہ برے القاب دیئے جاسکتے ہیں اور نہ اس کی برائی کی جاسکتی ہے۔ ہر شخص کا یہ قانونی حق ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے اور ہاتھ سے یا زبان سے اس پر کسی تم کی زیادتی نہ کرے۔<sup>۱</sup>

### ۱۴۔ نجی زندگی کا تحفظ

اسلام کے بنیادی حقوق کی رو سے ہر آدمی کو (Privacy) یعنی نجی زندگی کو

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن۔ سورہ المجرات۔ ترجمان القرآن۔ بابت جون

محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس محاٹے میں سورہ نور میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتیٰ تستانسو۔<sup>۱</sup> اپنے گھروں کے سوادوں سے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو۔ سورہ مجرمات میں فرمایا گیا لا تجسسوا۔<sup>۲</sup> (تجسس نہ کرو) نبی اکرم ﷺ کے ارشاد مبارک ہے کہ ایک آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے گھر سے دوسرے آدمی کے گھر میں جھائیگے۔ ایک شخص کو پورا پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسروں کے شور و شب سے، دوسروں کی تاک جھائیک سے اور دوسروں کی مدائلت سے محفوظ و مامون رہے۔ اس کی گھر بیوی بے تکلفی اور پرده داری برقرار رہنی چاہئے۔ مزید برآئی یہ کہ شخص کو دوسرے کا خط اوپر سے نگاہ ڈال کر دیکھنے کا حق بھی نہیں ہے۔ کجا کہ اسے پڑھا جائے۔ اسلام انسان کی پرائیویسی کا پورا پورا تحفظ کرتا ہے اور صاف ممانعت کرتا ہے کہ گھروں میں تاک جھائیک نہ کی جائے اور کسی کی ڈاک نہ دیکھی جائے۔ الایہ کہ کسی شخص کے متعلق معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع مل جائے کہ وہ کوئی خطرناک کام کر رہا ہے۔ ورنہ خواہ خواہ کسی کے حالات کا تجسس کرنا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے۔

### ۱۵۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

اسلام کے بنیادی حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا يَحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرُ بِالسَّوْءِ مِنَ الْقُولِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ط (النساء: ۱۳۸)

”اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے“ الایہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔“

یعنی مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

## ۱۶۔ آزادی اظہار رائے

ایک اور اہم چیز جسے آج کے زمانہ میں آزادی اظہار (Freedom of Expression) بیان کرتا ہے۔ مگر دیکھیے مقابلہ "قرآن کا کتنا بند تصور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ "امر بالمعروف" <sup>۱</sup> اور "نهي عن المنكر" نہ صرف انسان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے۔ قرآن کی روئے بھی اور حدیث کی ہدایات کے مطابق بھی۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لئے لوگوں سے کہے اور برائی سے روکے۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہو تو صرف یہی نہیں کہ بس اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ اس کے انداد کی کوشش بھی فرض ہے۔ اور اگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی اور اس کے انداد کی نظر نہیں کی جاتی تو الاٹاگناہ ہو گا۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔ اگر اس معاملے میں مسلمان کی آواز بند کی جائے تو اس سے برا کوئی ٹلم نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے بھلائی کے فروغ سے روکا تو اس نے نہ صرف ایک بیباودی حق سلب کیا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی سے روکا۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان کو ہر حالت میں یہ حق حاصل رہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے تزل کے اسباب بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ **كَانُوا لَا يَتَنَاهُونَ عَنْ مُنْكِرٍ** <sup>۲</sup>۔

<sup>۱</sup> ملاحظہ ہو آئیت کفتہ خیر امۃ اخرجت للناس، تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر۔ (آل عمران: ۱۱۰) تم بہترن امت ہو جو انسانیت کی طرف بیجے گئے ہو۔ نیکی کا حکم کرتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو۔

<sup>۲</sup> القرآن (المائدہ: ۷۹)

(وہ برائوں سے ایک دوسرے کو بادنہ رکھتے تھے) یعنی کسی قوم میں اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں کہ برائی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہو تو آخر کار رفتہ رفتہ برائی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے اور وہ پھلوں کے سڑے ہوئے ٹوکرے کے ماندہ ہو جاتی ہے جس کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس قوم کے عذاب الہی کے مستحق ہونے میں کوئی کسریاتی نہیں رہتی۔

### ۱۷۔ ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق

اسلام نے "لا اکراه فی الدین" (البقرہ: ۲۵۶) "دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔" کا اصول انسانیت کو دیا اور اس کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ قوت کا استعمال اسلام میں اگر ہے تو دو ضروریات کے لئے ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود اور اس کے استقلال کی سلامتی کے لئے میدان جہاد میں دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ نظم و نسق اور امن و امان کے تحفظ کے لئے جرائم اور فتنوں کا سد باب کرنے کے لئے عدالتی اور انتظامی اقدامات کئے جائیں۔

ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہی کا قیمتی حق تھا جسے حاصل کرنے کے لئے مکہ کے پیروہ سالہ دور احتلاء میں مسلمانوں نے ماریں کھا کھا کر کلمہ حق کما اور بالآخر یہ حق ثابت ہو کے رہا۔ مسلمانوں نے یہ حق جس طرح اپنے لئے حاصل کیا تھا، اسی طرح دوسرے کے لئے بھی اس کا پورا پورا اعتراف کیا۔ اسلامی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی فیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو، یا کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا ہو۔

### ۱۸۔ نہیں دل آزاری سے تحفظ کا حق

اسلام اس امر کا رو اوار نہیں کہ مختلف نہیں گروہ ایک دوسرے کے خلاف دریہ دہنی سے کام لیں اور ایک دوسرے کے پیشواؤں پر کچڑا چھالا کریں۔ قرآن

میں ہر شخص کے مذہبی معتقدات اور اس کے پیشوایان نہ ہب کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ **و لَا تُسْتَبِّو الظَّالِمِينَ يَدِ عَوْنَ وَهُنَّ مِنْ دُونِ اللَّهِ**<sup>۱</sup> (ان کو برآ بھلاند کو جنہیں یہ لوگ اللہ کے مساوا معبود ہنا کر پکارتے ہیں) یعنی مختلف مذاہب اور معتقدات پر دلیل سے محکم کرنا اور معقول طریق سے تنقید کرنا یا ائمہار اختلاف کرنا تو آزادی ائمہار کے حق میں شامل ہے، مگر دل آزاری کے لئے بدگوئی کرنا روا نہیں۔

## ۱۹۔ آزادی اجتماع کا حق

آزادی ائمہار کے عین منطقی نتیجے کے طور پر آزادی اجتماع کا حق نسودار ہوتا ہے۔ جب اختلاف آرا کو انسانی زندگی کی ایک اٹھی حقیقت کے طور پر قرآن نے پار پار پیش کیا ہے تو پر اس امر کی روک تحام کیا ممکن ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے لوگ آپس میں مربوط ہوں۔ ایک اصول اور نظریے پر مجتمع ہونے والی ملت کے اندر بھی مختلف مدارس مگر ہو سکتے ہیں اور ان کے متولیین بہر حال باہم و گر قریب تر ہوں گے۔ قرآن کرتا ہے:

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران: ۱۰۳)

”اور تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور مسکرے روکے۔“

عملی زندگی میں جب ”خیر“ ”معروف“ اور ”مسکر“ کے تفصیلی تصورات میں فرق واقع ہوتا ہے تو ملت کی اصولی وحدت کے قائم رہنے ہوئے بھی اس کے اندر مختلف مدارس مگر تکمیل پاتے ہیں اور یہ بات معیار مطلوب سے

کتنی بھی فروٹر ہو، گردہوں اور پارٹیوں کا ظہور ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کلام میں بھی فقہ و قانون میں بھی اور سیاسی نظریات میں بھی اختلاف آرا ہوا اور اس کے ساتھ مختلف گردوں وجود میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی دستور اور منشور حقوق کے لحاظ سے کیا مختلف اختلافی آراء رکھنے والوں کے لئے آزادی اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علیؓ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور آنحضرتؓ نے ان کے لئے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے خارجیوں سے فرمایا ”جب تک تم تکوar اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے، تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔“

## ۲۰۔ عمل غیر کی ذمہ داری سے برہت

اسلام میں آدمی صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کے لئے جواب دہ ہے۔ دوسروں کے اعمال اور دوسروں کے جرائم میں اسے کپڑا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے اصول یہ قرار دیا ہے کہ:

ولَا تزددازرة وَذر اخْرَى (الانعام: ۱۶۳)

”اور کوئی بوجو اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجو اٹھانے پر مکلف نہیں ہے۔“

اسلامی قانون میں اس کی محاجائش نہیں کہ کرے ڈاڑھی والا اور کپڑا جائے مونپھوں والا۔

## ۲۱۔ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی

اسلام میں ہر شخص کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ تحقیق کے بغیر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ اس سلطے میں قرآن کی واضح ہدایت ہے کہ کسی کے خلاف اظلاءع ملنے پر تحقیقات کر لو ہا کہ ایمانہ ہو کہ کسی گردوں کے خلاف لا علمی میں

کوئی کارروائی کر جیشو۔<sup>۱</sup> علاوہ بریں قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے۔

اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ (الحجرات: ۱۲)

”بہت سے مگانوں سے بچوں کیونکہ بعض مگان گناہ ہوتے ہیں۔“

اجمالاً ”یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جو اسلام نے انسانوں کو عطا کئے ہیں۔ ان کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے جو انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کو بتا دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان (Declaration of Human Rights) ہوا ہے اسے کسی حتم کی سند اور قوت نافذہ حاصل نہیں ہے۔ بس ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا ہے۔ اس معیار پر عمل در آمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے۔ نہ اور کوئی ایسا موثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری قوموں سے منو اسکے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے پابند ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ نے بنیادی حقوق کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی اسے یہ حقوق لازماً دینے ہوں گے۔ مسلمانوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی۔ اس معاملہ میں کسی ایسے معاہدے کی حاجت نہیں ہو گی کہ فلاں قوم اگر ہمیں یہ حق دے گی تو ہم اسے دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کو بہر حال یہ حقوق دینے ہوں گے۔ دوستوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی۔

۱۔ ملاحظہ ہو آئت ان جائزکم فاسق م بنباء فتیینوا ان تصبیوا قوما بجهالتة فتصبحوا علی ما فعلتم نہ میں۔ (الحجرات: ۱۰)

”اگر کوئی فاسق تمارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرو۔ کبھی کسی قوم کو ہادی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو۔ پھر اپنے کئے پر پچھتا ناپڑے۔“

باب ۱۳

غیر مسلموں کے حقوق

دستوری مسائل میں سب سے پیچیدہ مسئلہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں بے شمار غلط فرمیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ذہنی انتشار پھیل رہا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے حصول آزادی کے فوراً بعد اس مسئلہ پر سپر حاصل بحث کی تھی اور اس کے تمام پہلوؤں کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق کیا ہیں؟ مولانا موصوف کا وہی مقالہ ان کی نظر ہانی کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ ترجمان القرآن پاہت اگست ۱۹۳۸ء سے لیا جا رہا ہے۔ اس میں بھی ایک طرف غیر مسلموں کی دستوری پوزیشن کو واضح کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف اسلامی ریاست اور مسلم معاشرہ کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی بھی ہے۔ نہیں وہ اصول ہیں جن کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کو غیر مسلموں سے معاملہ کرنا ہے۔

## غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی حکومت میں فیر مسلموں کے حقوق پر بحث کرنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لیتا ضروری ہے کہ اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (Ideological) حکومت ہے اور اس کی نوعیت ایک قوی جموروی حکومت سے قطعاً مختلف ہے۔ دونوں قسم کی مختلف ریاستوں کے اس نوعی فرق کا مسئلہ زیر بحث پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کو حسب ذیل نکات سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ قوی حکومت انہیں اس لحاظ سے رہنے والے لوگوں کو اس لحاظ سے تقسیم کرتی ہے کہ کون لوگ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو دراصل ریاست کی ہائے اور چلانے والی ہے اور کون لوگ اس سے تعلق نہیں رکھتے، آج کل کی اصطلاح میں اس کے لئے اکثریت اور اقلیت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

۲۔ قوی حکومت اپنی رہنمائی و کار فرمائی کے لئے صرف اپنے افراطیوں کا کام ہوتا ہے جو اس کے قوم ہی پر اعتماد کرتی ہے اور دوسری

قیل التعداد قومیں جو اس کے شریوں میں شامل ہوں، اس اعتماد کی مسخر نہیں ہوتی۔ یہ بات چاہے صاف صاف کسی نہ جاتی ہو، مگر عملاً ہوتا اسی طرح ہے۔ اور اگر اقلیت کے کسی فرد کو کبھی کوئی کلیدی منصب دیا بھی جاتا ہے تو یہ محض ایک نمائشی حرکت ہوتی ہے پالیسیوں کی تکمیل میں فی الحقیقت اس کا کوئی داخل نہیں ہوتا۔

۳۔ قومی حکومت کے لئے یہ مناقصہ چال بازی آسان ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو نظریے کے اعتبار سے ایک قوم قرار دے کر کاغذ پر سب کو مساوی حقوق دے دے، مگر عملاً اکثریت اور اقلیت کا پورا امتیاز قائم رکھے اور زمین پر اقلیتوں کو کسی حتم کے حقوق نہ دے۔

۴۔ قومی حکومت کو اپنے نظام میں غیر قومی عناصر کی شمولیت سے جو پچیدگی پیش آتی ہے اسے حل کرنے کے لئے وہ تن مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے

انظام میں غیر مسلموں کی خدمات تو ضرور استعمال کر سکتی ہے۔ مگر رہنمائی و کار فرمائی کے مناصب انہیں نہیں دے سکتی۔

۵۔ اسلامی حکومت میں اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے اس بات پر مجبور ہے کہ مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان واضح امتیاز قائم کرے اور صاف صاف بتا دے کہ وہ غیر مسلموں کو کیا حقوق دے سکتی ہے اور کیا نہیں دے سکتی۔

۶۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام میں غیر مسلم عناصر کی موجودگی سے جو پچیدگی پیش آتی ہے اسے وہ اس طرح حل کرتی ہے کہ انہیں معین

ایک یہ کہ ان کی انفرادیت کو بند رجع  
ٹھاکر اپنے اندر جذب کر لے۔  
دوسرے یہ کہ ان کی ہستی کو مح  
کرنے کے لئے قتل و غارت اور  
اخراج کے ظالمانہ طریقے اختیار  
کرے۔ تیسرا یہ کہ ان کو اپنے  
اندر اچھوت بنا کر رکھ دے۔ یہ  
تینوں تدبیریں دنیا کی قوی جموروی  
ریاستوں میں بکھرت اختیار کی گئی  
ہیں، اب تک کی جا رہی ہیں اور آج  
ہندوستان نے خود مسلمانوں کو ان کا  
ٹھخ تجربہ ہو رہا ہے۔

۵۔ قوی جموروی حکومت میں اقلیتوں  
کو جو حقوق بھی دیئے جاتے ہیں وہ  
اکثریت کے عطا کردہ ہوتے ہیں اور  
اکثریت جس طرح انہیں عطا کرنے کا  
حق رکھتی ہے اسی طرح وہ ان میں  
کی بیشی کرنے اور بالکل سلب کر  
لینے کا بھی حق رکھتی ہے۔ پس  
درحقیقت اس نظام میں اقلیتیں  
سراسرا اکثریت کے رحم پر جلتی ہیں  
اور ان کے لئے ابتدائی انسانی حقوق

**حق کا ذمہ (Guarantee)**  
دے کر مطمئن کر دیتی ہے، اپنے  
اصولی نظام کے حل و عقد میں ان کی  
مدائلت روک دیتی ہے اور ان کے  
لئے ہر وقت یہ دروازہ کھلا رکھتی ہے  
کہ اگر اسلام کے اصول انہیں پند  
آ جائیں تو وہ انہیں قبول کر کے  
حکمران جماعت میں شامل ہو جائیں۔

۵۔ اسلامی حکومت ذمی غیر مسلموں کو  
وہ تمام حقوق دینے پر مجبور ہے جو  
شریعت نے ان کے لئے مقرر کئے  
ہیں۔ ان حقوق کو سلب کرنے پا ان  
میں کی کرنے کا اختیار کسی کو نہیں  
ہے۔ البتہ مسلمانوں کو یہ اختیار  
ضرور حاصل ہے کہ وہ ان حقوق کے  
علاوہ کچھ مزید حقوق انہیں عطا کر  
دیں، بشرطیکہ یہ اضافہ اسلام کے  
اصولوں سے متصادم نہ ہوتا ہو۔

تک کی کوئی پائیدار صفات نہیں  
ہوتی۔

یہ بینا دی اختلافات ہیں جو ذمیوں کے ساتھ اسلام کے سلوک اور اقليتوں کے ساتھ قومی جمہوریتوں کے سلوک ایک دوسرے سے بالکل ممتاز کر دیتے ہیں۔ جب تک انہیں پیش نظر نہ رکھا جائے، انسان خلط بحث سے نہیں فتح سکتا اور نہ اس غلط فہمی سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ موجودہ زمانے کی قومی جمہوریتیں تو اپنے دستوروں میں اقليتوں کو بالکل مساویانہ حقوق دیتی ہیں مگر اسلام اس معاملے میں تک نظری سے کام لیتا ہے۔

ان ضروری توصیمات کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

### ۱۔ غیر مسلم رعایا کی اقسام

اسلامی قانون اپنی غیر مسلم رعایا کو تین اقسام پر تقسیم کرتا ہے:  
ایک وہ جو کسی صلح نامے یا معاهدے کے ذریعے سے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں۔

دوسرے وہ جو اٹکت کھا کر مغلوب ہوئے ہوں۔  
تیسرا وہ جو بُنگ اور صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔

یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں، لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ اس لئے اہل الذمہ کے حقوق کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ہم ان مخصوص گروہوں کے جدا چدا احکام بیان کریں گے۔

## معاہدین۔

جو لوگ جنگ کے بغیر یا دور ان جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور حکومت اسلامی سے مخصوص شرائط ملے کر لیں ان کے لیے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے ملے ہوئی ہوں۔ دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے چند فیاضانہ شرائط ملے کر لینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف بر تاؤ کرنا آج کل کی مہذب قوموں کے سیاسی معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط ملے ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں) تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سرمو تجاوز نہ کیا جائے، بلاحال اس کے کہ فریقین کی اخباری حدیث اور طاقت و قوت (Relative Position) میں کتنا ہی فرق آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لعلکم تقاتلون قوماً فتظهرون عليهم فيتقونكم بالموالهم دون  
أنفسهم وآباءِهم (وفی روایته فیصالحونکم علیٰ صلح) فلا تصيروا منهم  
فقذالک فانه لا يصلح لكم<sup>۱</sup>

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آ جاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لیے تم کو خراج دیتا منکور کر لے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے صلح نامہ ملے کر لے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک جب بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لیے ناجائز ہو گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الا من ظلم معاهده او كلفه فوق طاقتہ او اخذ منه شيئاً

بغير طيب نفس فانها حبيجه يوم القيامتہ۔<sup>۲</sup>

خبردار! جو شخص کسی معابر پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کم کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا، یا اس سے کوئی جز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہنوں گا۔

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ کلیہ مستبط ہوتا ہے کہ معابر ذمیوں کے ساتھ مسلح نامہ میں جو شرائط ملے ہو جائیں ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج ہو عایا جاسکتا ہے، نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں حجمی جاسکتی ہیں، نہ ان پر سخت فوج داری قوانین نافذ کیے جاسکتے ہیں، نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جاسکتا ہے، نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جاسکتا ہے جو ظلم یا انتہاء، یا تکلیف مالا بیطا، یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلح "فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدون نہیں کئے ہیں اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائط مسلح کے مطابق ہو گا۔ امام ابو یوسف<sup>۱</sup> لکھتے ہیں:-

يؤخذ منهم ما صولحواعليه ويوفى لهم ولا يزيد عليهم

ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کی ساتھ مسلح ہوئی ہے، ان کے حق میں مسلح کی شرائط پوری کی جائیں گی، اور ان پر کچھ اضافہ نہ کیا جائے گا۔

<sup>۱</sup> ابو داؤد، کتاب الجمادات۔

اس کتاب المراجع صفحہ ۳۵۔

## مفتونین

دوسرا تم میں وہ لوگ شامل ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں اور جنہوں نے اس وقت تھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات کو توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہو چکی ہوں۔ اس تم کے مفتونین کو جب ذمی بنا�ا جاتا ہے تو ان کو چند خاص حقوق دیئے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیلات فقیہی کتابوں میں موجود ہیں۔ ذیل میں ان احکام کا خلاصہ دیا جاتا ہے جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

۱۔ جب امام ان سے جزیہ قبول کر لے تو وہ ہمیشہ کے لیے عقد ذمہ قائم ہو جائے گا، اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہو گا، کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ ہی عصمت نفس و مال ثابت ہو جاتی ہے۔<sup>۱</sup> اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انہیں غلام بنا لیں۔ حضرت عمر<sup>ؓ</sup> نے حضرت عبیدہ<sup>ؓ</sup> کو صاف لکھا تھا کہ :-

فاذالخدم منهم الجزية فلا شئ لک عليهم ولا سبيل۔<sup>۲</sup>

جب تم ان سے جزیہ قبول کر لو تو پھر تم کو ان پر دست درازی کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

۲۔ عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد اپنی ذمیتوں کے مالک وہی ہوں گے۔ ان کی ملکیت ان کے درہاء کو خلل ہو گی، اور ان کو اپنے املاک میں بیع، بہر، رہن وغیرہ کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی حکومت کو انہیں بے دخل کرنے کا حق نہ ہو گا۔<sup>۳</sup>

<sup>۱</sup> بuda'ah al-mana'ij ج ۷ ص ۳۳۳۔

<sup>۲</sup> Kitab al-kharaj ص ۸۲۔

<sup>۳</sup> Fiqh al-Qudoor ج ۲ ص ۳۵۹۔

۳۔ جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ جو مال دار ہیں ان سے زیادہ جو متوسط الحال ہیں ان سے کم، اور جو غریب ہیں ان سے بہت کم لیا جائے گا۔ اور جو کوئی ذریعہ آمنی نہیں ہے کہتے، یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے، ان کو جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم مقرر نہیں ہے، لیکن اس کی تعیین میں یہ امرہ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا ان کے لئے آسان ہو۔ حضرت عرب<sup>ؓ</sup> نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔<sup>۱</sup>

۴۔ جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائے گا جو اہل قتل (Combatants) ہیں۔ غیر اہل قتل، مثلاً پچے عورتیں، دیوانے، اندھے، اپاچ، عبادت گاہوں کے خادم، راہب، شیاسی، اذکار رفتہ بوڑھے، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصہ تک متدا ہو جائے، اور وعدی، غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنی ہیں۔<sup>۲</sup>

۵۔ بزر ششیری حق ہونے والے شر کے معابد پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے۔ لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بہ طریق احسان ان کو علی حالت قائم رہنے دینا اولی اور افضل ہے۔ حضرت عرب<sup>ؓ</sup> کے زمانہ میں جتنے ممالک حق ہوئے ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کی گیا۔ امام ابو یوسف<sup>ؓ</sup> لکھتے ہیں:-

۱۔ کتاب المزاج ص ۳۶۔

۲۔ بداعج ۷۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ لمح القدیر ج ۲ ص ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ کتاب المزاج ص ۲۷۳۔

تیوکت علیٰ حالہا ولم تسم ولم یتعرض لهد۔<sup>۱</sup>  
 ان کو ان کے مال پر چھوڑ دیا گیا، نہ سمار کیا گیا اور نہ ان سے  
 کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔  
 قدم معابد کو سمار کرنا بہر مال ناجائز ہے۔<sup>۲</sup>

## ۲- ذمیوں کے عام حقوق

اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جن میں تینوں اقسام  
 کے اہل الہمہ شریک ہیں۔

### حفاظتِ جان

ذی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی  
 مسلمان ذمی کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس  
 طرح مسلمان کو قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ کے  
 زمانے میں ایک مسلمان نے ایک ذمہ کو قتل کیا تو آپ نے اس کے  
 قتل کا حکم دیا اور فرمایا کہ :-  
 انا الحق من وفی بخدمته<sup>۳</sup>

اپنے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں۔

حضرت عمر رض کے زمانہ میں قبیلہ بکرین والیں کے ایک شخص نے جیرہ کے  
 ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو متعول کے حوالہ کیا

اس کتاب المراجع ص ۸۳۔

۲- بدائع جلد ۷ ص ۱۱۳۔

۱- عایہ شرح ہدایہ ج ۸ ص ۲۵۶، دارقطنی نے یہی حدیث ابن عمر رض کے حوالہ سے تعل  
 کی ہے اور اس میں "انا اکرم من وفی بخدمته" آیا ہے۔

جائے۔ چنانچہ وہ محتول کے وارثوں کو دے دیا گیا اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔<sup>۲</sup>

حضرت علیؑ کے زمانہ میں خود عبید اللہ بن عمرؓ کے قتل کا فتویٰ دے دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے ہر مزان اور ابو حولو کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی سمازش میں شریک تھے۔

حضرت علیؑ کے زمانہ میں ایک مسلمان ایک ذمی کے قتل میں ماخوذ ہوا۔ ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔ محتول کے بھائی نے آکر عرض کیا "میں نے خون معاف کیا۔" مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا:

لعلهم فزرعوك او هدوك

شاپر ان لوگوں نے مجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ "نہیں۔ مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آ جائے گا۔" تب آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا کہ:

من حکان له ذمتنا فدمه گدمنا و دیته گدیتنا۔<sup>۱</sup>

جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دست ہماری دست کی طرح ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے فرمایا:

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا و دمائهم كدمائنا.

انہوں نے عقد ذمہ قبول عی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔

<sup>۱</sup> بربان شرح مواهب الرحمن ج ۳ ص ۲۸۷۔

<sup>۲</sup> بربان جلد ۲، ص ۲۸۲

اسی بحاء پر فقہاء نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اسکی دست بھی وہی ہو گی جو مسلمان کو خطاہ "قتل کرنے سے لازم آتی ہے۔"

### فوجداری قانون

تعزیرات کا قانون ذی اور مسلمانوں کے لئے یکساں ہے اور اس میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ جرام کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذی کو بھی دی جائے گی۔ ذی کا مال مسلمان چرا لے یا مسلمان کا مال ذی چرا لے دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کٹا جائے گا۔ ذی کسی مرد یا عورت پر زنا کی تھمت لگائے یا مسلمان ایسا کرے، دونوں صورتوں میں ایک ہی حد قذف جاری ہو گی۔ اسی طرح زنا کی سزا بھی ذی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے۔ البتہ شراب کے معاملہ میں ذمیوں کے لئے استثناء ہے۔<sup>۱</sup>

### دیوانی قانون

دیوانی قانون بھی ذی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے اور دونوں کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علی ہٹھ کے ارشاد اموالہم کاموالنا کے معنی ہی ہی ہیں کہ ان کے مال کی دلیکی ہی حماقت کی جائے گی جیسی مسلمان کے مال کی ہوتی ہے اور دیوانی حقوق ہمارے اور ان کے برابر ہوں گے۔ اس مساوات

<sup>۱</sup> در عکار، ج ۲ ص ۲۰۳

<sup>۲</sup> کتاب الخراج ص ۲۰۸-۲۰۹۔ المبسوط ج ۹ ص ۵۷-۵۸۔ امام مالک ہٹھ کے نزدیک ذی کے لئے شراب کی طرح زنا کے معاملہ میں بھی استثناء ہے۔ وہ حضرت علی ہٹھ اور حضرت عمر ہٹھ کے اس فیصلہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ذی اگر زنا کرے تو اس کا معاملہ اس کے اہل ملت پر چھوڑ دیا جائے (یعنی اس کے پر عل لاء کے مطابق عمل کیا جائے)۔

کا طبعی لازمہ یہ ہے کہ دیوانی قانون کی رو سے جتنی پابندیاں مسلمان پر عائد ہوتی ہیں وہی سب ذی پر بھی عائد ہوں۔

تجارت کے جو طریقے ہمارے لئے منوع ہیں، وہی ان کے لئے بھی ہیں۔ سود جس طرح ہمارے لئے حرام ہے اسی طرح ان کے لئے بھی ہے۔ البتہ ذمیوں کے لئے صرف شراب اور سور کا استثناء ہے۔ وہ شراب بنانے، پینے اور نیچنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں سور پالنے، کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں۔<sup>۱</sup> اگر کوئی مسلمان کسی ذی کی شراب یا اس کے سور کو تخف کر دے تو اس پر تاؤان لازم آئے گا۔ درالمخاریب میں ہے:

وَيُضْمَنُ الْمُسْلِمُ قِيمَةُ خَمْرٍ وَخَنْزِيرٍ إِذَا أَتَلَفَهُ

مسلمان اس کی شراب اور کے سور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اسے تخف کر دے۔

### تحفظ عزت

ذی کو زہان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا۔ اس کو نگالی رہنا، مارنا، بیٹھانا، یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں یہ افعال ناجائز ہیں۔ درالمخاریب میں ہے:-

وَبِجَبِ كَفِ الْأَذْى عَنْهُ وَنَحْرِمُ غَيْبَتَهُ كَالْمُسْلِمِ<sup>۲</sup>

اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔

<sup>۱</sup> المبوط ج ۱۲، ص ۳۸-۳۷

<sup>۲</sup> درالمخاریب ج ۳ ص ۲۷۳

<sup>۳</sup> درالمخاریب جلد ۳ ص ۲۷۳-۲۷۴

## ذمہ کی پاکداری

عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی نروم رکھتا ہے، یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر اسے توڑ دینے کے عمار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔ بدائع میں ہے:-

واما صفة العقد فهو لازم في حقنا لا يملأ المسلمين نقضه بحال من  
الاحوال واما في حقهم فغير لازم<sup>۱</sup>

عقد ذمہ ہمارے حق میں تو لازم ہے، یعنی ایک مرتبہ ذمی ہنا لینے کے بعد ہم اس ذمہ کو کسی حال میں توڑ نہیں سکتے۔ لیکن ان کے لیے یہ لازم نہیں ہے۔ (یعنی اگر وہ ہمارے ذمہ سے خارج ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں)۔

ذمی خواہ کیسے عی بولے جرم کا ارتکاب کرے، اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا۔ حتیٰ کہ جزیہ بند کر دیا، مسلمان کو قتل کرنا، نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقص ذمہ نہیں ہے۔ ان افعال پر اسے مجرم کی حیثیت سے مزادی جائے گی، لیکن باقی قرار دے کر ذمہ سے خارج نہیں کر دیا جائے گا۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ذمی خارج از ذمہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ دارالاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا طے۔ دوسرے یہ کہ حکومت اسلامی کے خلاف صریح بغاوت کر کے قتلہ و فساد برپا کرے۔<sup>۲</sup>

<sup>۱</sup>- در المخارج ۷ ص ۱۱۲

<sup>۲</sup>- بدائع ۷ ص ۱۱۳۔ فتح القدير ۷ ص ۲۸۱-۸۲

## شخصی معاملات

زمیں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون (Personal law) کے مطابق ملے کیے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے لئے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے، وہ اگر ان کے مذہبی و قومی قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت ان کے قانون یعنی کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح، یا بلا مرکے نکاح، یا زمانہ عدت کے اندر نکاح ہانی، یا محربات کے ساتھ نکاح اگر وہ جائز رکھتے ہوں تو ان کے لئے یہ سب افعال جائز رکھے جائیں گے۔ خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے تمام اداروں میں اسلامی حکومتوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس معاملہ میں حضرت حسن بصری سے فتویٰ طلب کیا تھا کہ:-

ما بآل الخلفاء الراشدین ترکوا اهل الذمة وما هم عليه من نكاح  
المحارم والقتناء والخمور والخنازير؟

کیا ہاتھ ہے کہ خلفاء راشدین نے زمیں کو محربات کے ساتھ نکاح اور شراب اور سوون کے معاملہ میں آزاد پھوڑ دیا؟  
جواب میں حضرت حسنؓ نے لکھا ہے:-

انما بذروا الجزية ليترکوا وما يعتقدون وانما انت متبع ولا مبتدع  
والسلام

”انہوں نے جزیہ رہا اسی لئے تو قول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی برکرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام پچھلے طریقہ کی ہیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا۔

البته اگر کسی مقدمہ میں فریضیں خود اسلامی عدالت سے درخواست کریں کہ شریعت اسلام کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے، تو عدالت ان پر شریعت نافذ کرے گی۔ نیز اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فرق

مسلمان ہو تو پھر فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ مثلاً کوئی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی اور اس کا شوہر مر گیا۔ تو اس عورت کو شریعت کے مطابق پوری عدالت و قات مگزارتی ہو گی۔ عدالت کے اندر وہ نکاح کرے گی تو ایسا نکاح باطل ہو گا۔<sup>۱</sup>

### نہیٰ مراسم

نہیٰ مراسم اور قوی شعائر کو پلک میں اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کرنے کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اہل الذمہ خود اپنی بستیوں میں تو ان کو پوری آزادی کے ساتھ کر سکیں گے۔ البتہ غالباً اسلامی آبادیوں میں حکومت اسلامی کو اختیار ہو گا کہ انسیں اس کی آزادی دے یا ان پر کسی قسم کی پابندیاں عاید کر دے۔<sup>۲</sup> بدائع میں ہے:-

لَا يَمْنَعُونَ مِنَ الظَّهَارِ شَيْئًا مَا ذُكِرَنَا مِنْ بَيْعِ الْخَمْرِ وَالْخَنْزِيرِ  
وَالصَّلِيبِ وَضَرَبَ النَّاقُوسَ فِي قَرْيَةٍ أَوْ مَوْضِعٍ لَيْسَ مِنْ أَعْصُلِ  
الْمُسْلِمِينَ وَلَوْكَانَ فِيهِ عَدْدٌ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ السَّلَامِ وَإِنَّمَا يَكْرَهُ ذَلِكُفِي  
الْأَعْصُلِ الْمُسْلِمِينَ وَهُنَّ الَّذِينَ يَقْعُدُونَ فِي هَذِهِ الْجَمْعِ وَالْأَعْدَادِ وَالْحَدَادِ...  
وَلَمَا ظَهَارَ فَسْقٌ يَعْتَدُونَ حِرْمَةَ كَالْزَنَاءِ وَسَائِرَ الْفَوَاحِشِ الَّتِي حَرَامٌ فِي  
دِيْنِهِمْ فَإِنَّهُمْ يَمْنَعُونَ مِنْ ذَلِكَ كُلُّ سَوَاءٍ كَانُوا فِي أَعْصُلِ الْمُسْلِمِينَ

<sup>۱</sup> المبسوط ج ۵ ص ۳۸-۳۹۔

<sup>۲</sup> غالباً اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں "اعصار المسلمين" کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف ان مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی تحریک ہو، اور جن کو مسلمانوں نے اظہار شعائر اسلام کے لئے مخصوص کر لیا ہو۔

### لوف امصار میں<sup>۱</sup>

جو بستیاں امصارِ مسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں زمیں کو شراب و خزر پیجئے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بھانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی عی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال امصارِ مسلمین میں ناپسندیدہ ہیں، یعنی ان شرودیں میں جنہیں جمع و عیدین اور اقامت حدود کے لئے مخصوص کیا گیا ہو..... رہا وہ فتن جس کی حرمت کے خود وہ بھی قائل ہیں مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں، تو اس کے علاویہ ارتکاب سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا خواہ وہ امصارِ مسلمین میں ہوں یا خود اپنے امصار میں۔

لیکن امصارِ مسلمین میں بھی ان کو صرف ملیوں اور مورثیوں کے جلوس نکالنے اور علائیہ ناقوس بھانے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ورنہ اپنے قدیمِ معابر کے اندر رہ کروہ تمام شعائر کا اغفار کر سکتے ہیں۔ حکومتِ اسلامیہ اس میں دخل نہ دے گی۔<sup>۲</sup>

### عبادت گاہیں

امصارِ مسلمین میں زمیں کے جو قدیمِ معابر ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ثوث جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ ہنا لینے کا حق ہے۔ لیکن نئے معابر ہنانے کا حق نہیں ہے۔<sup>۳</sup> رہے وہ مقامات جو امصارِ مسلمین نہیں ہیں تو

<sup>۱</sup> بدائع ج ۷ ص ۱۱۳۔

<sup>۲</sup> شرح الیہ الرکبی ج ۲ ص ۲۵۱۔

<sup>۳</sup> بدائع جلد ۷ ص ۱۱۳۔ شرح الیہ الرکبی ج ۳ ص ۲۵۱۔

ان میں ذمیوں کو نئے معابرہ بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اسی طرح جو مقامات اب "مصر" نہ رہے ہوں، یعنی امام نے ان کو ترک کر کے وہاں اقامت جمع و اصیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی ذمیوں کو نئے معابرہ کی تعمیر اور اپنے شعائر کے انکسار کا حق ماضی ہے۔<sup>۱</sup>

ابن عباس کا فتویٰ یہ ہے :-

لما مصر مصربته العرب فليس لهم لن يحد ثوابه بناء بيعة ولا  
كنيسة ولا يضرروا فيه بنا قوس ولا يظهرروا فيه خمراً ولا يتخذوا فيه  
خندزيراً وكل مصر كانت المعجم مصرته ففتحه الله على العرب فنزلوا  
على حكمهم فلعم ما في عدمه وعلى العرب أن يوفوا لهم بذلك۔<sup>۲</sup>

جن شروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابرہ اور کنائس تعمیر کریں یا ناقوس بجا سین یا علائیہ شراب اور سور کا گوشت پہیں۔ ہاتھی رہے وہ شر جو بھیوں کے آباد کیے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ پر لے کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے حکم کی اطاعت قبول کر لی تو بھم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معابرہ میں ملے ہو جائیں اور مسلمانوں پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

### جزیہ و خراج کی تحصیل میں رعایات

جزیہ و خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد کرنا منوع ہے۔ ان کے ساتھ

<sup>۱</sup> بدائع جلد ۷ ص ۱۱۳۔ شرح البر اکبر ج ۳ ص ۲۵۷۔

<sup>۲</sup> کتاب الخراج ص ۸۸۔

زی اور رفق کی تائید کی گئی ہے اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ لا یکلفو افوق طلاقہم، بتا مال و نا ان کی طاقت سے باہر ہو اس کے او اکرنے کی انسیں تکلیف نہ دی جائے۔<sup>۱</sup>

جیپے کے عوض ان کی ا بلاک کا نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ نے اپنے ایک عامل کو فرمان بھیجا تھا کہ لا تبیعن لہم ف خراجہم حملوا<sup>۲</sup> ولا بقرۃ ولا کسوۃ شہینا<sup>۳</sup> ولا صنفا۔ خراج میں ان کا گردھا، ان کی گائے، ان کے کپڑے نہ پہننا۔<sup>۴</sup> اور ایک موقع پر اپنے عامل کو بھیجے وقت حضرت علیؓ نے فرمایا:-  
ان کے جاؤے گری کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور  
ان کے جانور جن سے وہ سختی ہاوی کرتے ہیں، خراج وصول کرنے کی  
خاطر ہرگز نہ پہننا، نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا،  
نہ کسی کو کھدا رکھنے کی زیارت نہ خراج کے عوض کسی جز کا نیلام  
کرنا۔ کیونکہ ہم جو ان کے حاکم ہائے گئے ہیں تو ہمارا کام زی ہے  
وصولی کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے  
بجائے تم کو پکوئے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف درزی کی خبر پہنچی تو  
میں تمہیں معزول کر دوں گا۔<sup>۵</sup>

جیپے کی تحلیل میں ان پر ہر حکم کی سختی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں سندھ اور  
اکام کے ایک یہ بھی تھا کہ:-

<sup>۱</sup> سہیب الخراج ص ۸۰، ۸۲۔

<sup>۲</sup> فتح البان ج ۲ ص ۹۳۔

<sup>۳</sup> سہیب الخراج ص ۹۔

وَلِمُنْفَعِ الْمُسْلِمِينَ مِنْ ظُلْمِهِمْ وَالْأَضْرَارِ بِهِمْ وَالْكُلُّ أَمْوَالُهُمْ إِلَّا  
بِحُطْمَدٍ<sup>۱</sup>

مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انہیں سنانے اور ناجائز طریقہ  
سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عامل جزیہ وصول کرنے  
کے لئے ذمیوں کو سزا دے رہے ہیں۔ اس پر آپؓ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ  
دو، اگر تم انہیں عذاب دو گے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خسیں عذاب دے  
گا۔ لَا تَعْنِبُ النَّاسَ فَإِنَّ الَّذِينَ يَعْذِبُونَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا يَعْذِبُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ<sup>۲</sup>

ہشام بن حکم نے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قطعی کو جزیہ وصول  
کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے۔ اس پر انہیں نے ملامت کی اور فرمایا  
کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنائے کہ :-

لَنْ يَعْلَمَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يَعْذِبُ الَّذِينَ يَعْذِبُونَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا<sup>۳</sup>

اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو  
عذاب دیتے ہیں۔

فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انہیں  
تاریباً قید بے مشقت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ امام ابو یوسفؓ لکھتے ہیں ولیکن  
يَرْفَقُ بِهِمْ وَيَحْسُنُونَ حَتَّى يَوْمَ وَما عَلَيْهِمْ<sup>۴</sup>

اسکتاب المزارج ص ۸۲۔

اسکتاب المزارج ص ۸۷۔

<sup>۳</sup> ابو داؤد کتاب المزارج باب الفتن والamarah۔

اسکتاب المزارج ص ۷۰۔

جو ذی محتاج اور فقیر ہو جائیں افسوس صرف جزیہ سے معاف ہی نہیں کیا  
جائے گا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانے سے وظائف بھی مقرر کیے جائیں گے۔  
حضرت خالدؓ نے اہل حربہ کو جو امانت نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں :-  
وَجَعَلْتُ لِهِمْ أَيْمَانَ شِيخٍ ضَعْفٍ عَنِ الْعَمَلِ أَوْ أَصَابَتْهُ أَفَةٌ مِّنَ الْأَلْفَاتِ  
أَوْ كَلْبٌ غَنِيَا فَا فَتَقُرُو صَارِ أَهْكَلٍ دِينُهُ يَتَصَدَّقُونَ عَلَيْهِ طَرَحْتُ جُزِيَّةَ  
وَهِيَلٌ مِّنْ بَيْتِ مَالِ الْمُسْلِمِينَ هُوَ وَعْدَ اللَّهِ<sup>۱</sup>

میں ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو شخص بڑھاپے کے  
سبب اذکار رفتہ ہو جائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے، یا وہ پہلے  
مال دار تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم ذہب لوگ اس کو  
مردقة و خیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے اور اسے  
اور اس کے ہال بچوں کو مسلمانوں کے بیت الممال سے مددوی جائے۔  
ایک رفعہ حضرت عزػ نے ایک ضعیف العبر آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور  
اس سے اس ذیلیل حرکت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے  
لئے بھیک مانگتا ہوں۔ اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کر دیا اور اس کے لئے  
وغیرہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا:-

”خدا کی حتم یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے  
قادرو اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں۔“<sup>۲</sup>  
دشمن کے سفر میں بھی حضرت عزػ نے اپنے مخدور ذمیوں کے لئے امدادی  
وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کیے تھے۔<sup>۳</sup>

۱۔ کتاب المراجع ص ۸۵۔

۲۔ کتاب المراجع ص ۷۲۔ فتح القدری رج ۲ ص ۳۷۳۔

۳۔ فتوح البلدان للبلاذری طبع یورپ ص ۱۲۹۔

اگر کوئی ذی مر جائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا ہاتا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے وارثوں پر اس کا بارہ لا جائیگا۔ امام ابو یوسف<sup>ؓ</sup> لکھتے ہیں :-

لَنْ فَجِيَتْ عَلَيْهِ الْجُزِيَّةُ فَمَا تَوْلَى مَنْ تَوْلَى مَنْ لَوْلَى لَهُ بَعْضُهَا وَبَقِيَّهُ  
البعض لَمْ يَوْلَى بَعْذَبَ الْكَوْرُثَةِ وَلَمْ تَوْلَى مَنْ تَرَكَهُ۔<sup>۱</sup>

اگر کسی ذی پر جزیہ واجب ہو اور وہ اس کو ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کے درہاء سے وہ وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ترکہ سے لا جائے گا۔

## تجارتی نیکیں

مسلمان تاجرود کی طرح ذی تاجرود کے اموال تجارت پر بھی نیکیں لیتے گا۔ جب کہ اف کار راس المان ۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ حوال سونے کے مالک ہو جائیں۔<sup>۲</sup>

اس میں تک نہیں ہے کہ فقہاء نے ذی تاجر پر تجارتی محصول ۵ فی صدی لگایا تھا اور مسلمان تاجر پر ۲۰۱-۲ فی صدی، لیکن یہ فعل کسی نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا اور دراصل وقتی مصالح اس کے متعلقی تھے۔ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر ملک کی خانست میں مشغول تھے اور تمام تجارت ذمہوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اسی لئے مسلمان تاجرود کی بہت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے ان پر نیکیں کم کر دیا گیا۔

<sup>۱</sup> کتاب الخراج ص ۷۰۔ المبسوط ج ۱۰ ص ۸۱۔

<sup>۲</sup> کتاب الخراج ص ۷۰۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ آج بھی نیک مائدہ کرنے کے لئے کسی نصاب رکھا جائے۔ یہ نصاب اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے قدر۔

## فوچی خدمت سے استثناء

ذی فوچی خدمت سے مستثنی ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تھا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اصول پر جو ریاست قائم ہو اس کی حفاظت کے لئے دعی لوگ لو سکتے ہیں اور انہی کو اس کے لئے رونا چاہئے ہو اس اصول کو حق مانتے ہوں۔ پھر لا ایک میں اپنے اصول اور حدود کی پابندی بھی دی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ اگر ریاست کی حفاظت کے لئے لوہیں گے تو محض نکارا یہ کے پاہیوں (Mercenaries) کی حیثیت سے لوہیں گے اور اسلام کے مقرر کیے ہوئے اخلاقی حدود کی پابندی نہ کر سکتیں گے۔ اسی لئے اسلام نے ذمیوں کو فوچی خدمت سے مستثنی کر کے ان پر صرف یہ فرض عاید کیا ہے کہ وہ ملکی حفاظت کے مصارف میں انہا حصہ ادا کر دیں۔ جیز کی اصل حیثیت بھی ہے۔ وہ نہ صرف اطاعت کا نشان ہے، بلکہ فوچی خدمت سے استثناء کا بدل اور ملکی حفاظت کا معاوضہ بھی ہے۔ چنانچہ جیز یہ صرف قابل بگیر مردوں عی پر لگایا جاتا ہے، اور اگر مسلمان کسی وقت ذمیوں کی حفاظت سے قادر ہوں تو جیز واپس کروانا جاتا ہے۔<sup>۱</sup>

<sup>۱</sup> اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو بہوت ج ۱۰ ص ۷۸-۷۹ ہدایہ کتاب البر فصل فی سینیدہ تحد افغانم و باب الجزیہ۔ فتح القدر بیان ج ۲ ص ۲۲۷-۲۸ و ص ۳۶۹-۷۰

اگر کسی ہمروں مملک کے موقع پر ملک کے غیر مسلم باشندے مدافعت کے لئے اپنی خدمات بطور خود پیش کریں تو ہم ان کی اس پیشکش کو قبول کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں ان کا جزیہ ساقط کرنا ہو گا۔ یہاں یہ تصریح کر دیتا بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ جزیہ کے نام سے غیر مسلموں کو جو وحشت ہوتی ہے وہ محض اس پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے جو

جنگ پر موك کے موقع پر جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام منود علاقوں کو چھوڑ کر ایک مرکز پر اپنی طاقت سمجھتی پڑی تو حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے انہیں واپس کر دو اور ان سے کو کہ "اب ہم تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں" اس لئے ہم نے جو حال تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں۔ اس حکم کے مطابق تمام امراء فوج نے جمع شدہ رقوم واپس کر دیں۔ بلاذری اس موقر پر غیر مسلم رعایا کے جذبات کا حال لکھتا ہے کہ جب مسلمانوں نے جمع میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "تمہاری حکومت اور انصاف پسندی ہم کو اس ظلم و شتم سے زیادہ محبوب ہے جس میں ہم جلاتے ہیں۔ اب ہم ہر قل کے عامل کو اپنے شر میں ہرگز سمجھنے نہ دیں گے تو فیکر لوز کر مظلوب نہ ہو جائیں۔"

### یقینہ خاشیہ

ایک دن سے اسلام کے ہالین کرتے رہے ہیں۔ دردہ حقیقت میں اس توحش کے لئے کوئی بیاد نہیں ہے۔ جزیہ دراصل اس تحفظ کا معاوضہ ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کے تحت میر آتا ہے۔ یہ معاوضہ صرف صاحب استطاعت اور بالغ مردوں سے لیا جاتا ہے اسے اگر اسلام قبول نہ کرنے کا جرمانہ قرار دیا جائے تو پھر اس ذکوے کو کیا کہا جائے گا جو ہر صاحب استطاعت سelman مردی سے نہیں بلکہ عورت سے بھی لی جاتی ہے اور جس کی شرح جزیہ کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔ کیا وہ اسلام قبول کرنے کا جرمانہ ہے؟  
اسکتاب المخراج صفحہ ۱۱۱۔

عن توحیح البلدان طبع یورپ صفحہ ۱۳۷۔

### ۳۔ فقہاء اسلام کی حمایت

یہ ہیں اس قانون کی تفصیلات جو صدر اول میں غیر مسلم رعایا کے حقوق و فرائض سے متعلق بنایا گیا تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ بھی تاریخاً چاہتے ہیں کہ ظفراء راشدین کے بعد پادشاہی دور میں جب کبھی ذمیوں کے ساتھ بے انسانی کی گئی تو وہ فقہاء اسلام ہی کاگرde تھا جو آگے بڑھ کر ان کی حمایت کے لئے کڑا ہو گیا اور متفق ہو کر ان کا پشت پناہ بنا۔ تاریخ کا مشور واقعہ ہے کہ ولید بن عبد الملک اموی نے دمشق کے کنیسه یوحا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا تھا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیز مدد خلافت پر محتکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس قلم کی حفایت کی تو انہوں نے اپنے عامل کو لکھا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر غیر کیا گیا ہے اسے مندم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو۔<sup>۱</sup>

ولید بن یزید نے روی حملہ کے خوف سے قبرص کے ذی باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا۔ فقہائے اسلام اور عالم مسلمان اس پر سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس کو گناہ عظیم سمجھا۔ پھر جب ولید بن یزید نے انہیں دوبارہ قبرص میں لے جا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر غمین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تھا شاہی۔ اساعیل بن عیاش کا میان ہے کہ:-

مستنفع ذلك المسلمين واستمعتمه الفقهاء فلما ولى يزيد بن وليد  
بن عبد العنك رد لهم الى قبرص فاستحسن المسلمين ذلك من فعله  
ورأوه عدلا۔<sup>۲</sup>

مسلمانوں نے اس کی اس حرکت سے بیزاری ظاہر کی اور فقہاء نے

<sup>۱</sup> فتوح البلدان مطبوعہ یورپ ص ۱۳۲

<sup>۲</sup> فتوح البلدان ص ۱۵۶۔

اس کو گناہ سمجھا۔ پھر جب بیرونی بن دلید مظیف ہوا اور اس نے ان کو قبرص کی طرف پھر لوٹا دیا تو مسلمانوں نے اس کو پسند کیا اور اسے حمل و انصاف سمجھا۔

بلادوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لہن کے ہاشمیوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کر دی۔ اس پر صالح بن علی بن عبد اللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی اور اس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو جل کر دیا اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کر دیا اور ایک جماعت کو وہیں آپا درہ بنے دیا۔ امام اوزاعی اس زمانے میں زندہ تھے۔ انہوں نے صالح کو اس علم پر سخت تنیسہ کی اور ایک طویل خط لکھا جس کے چھ فقرے یہ ہیں :-

”جبل لہن کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تم کو معلوم ہے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر ہاؤ جو اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیج دیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیوں کر دی جا سکتی ہے اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جاگہ ادوس سے اپنی ہے دھل کیا جا سکتا ہے، طالا نکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لا تزد ول زر و زر اخرين اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے۔ تمہارے لئے بہترین فیصلت یہ ہے کہ تم رسول اللہ کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ ”جو کوئی کسی مجاہد پر علم کرے گا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدھی ہنوں گا۔“

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ علامہ اسلام نے بیشہ اہل ذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے اور کبھی کسی امیر یا پادشاہ نے ان پر جزو قلم کیا بھی ہے تو ہو لوگ اس حمد میں اسلامی قانون کے پاسبان رہے ہیں وہ کبھی اس پر طامت کرنے سے باز خیس رہے۔

### ۳۔ زائر حقوق جو غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں

یہاں تک ہم نے اہل الذمہ کے ان حقوق کا ذکر کیا ہے جو شریعت میں ان کے لئے مقرر ہیں اور جنہیں لازماً ہر اسلامی دستور میں شامل ہونا چاہئے۔

اب ہم خفتر طور پر تائیں گے کہ موجودہ زمانہ میں ایک اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شریوں کو اصول اسلام کے مطابق مزید کیا حقوق دے سکتی ہے۔

### رئیسِ مملکت کا منصب

سب سے پہلے رئیسِ مملکت کے سوال کو لجھئے۔ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت ہے اس لئے وہ ان فریب کاریوں سے کام نہیں لے سکتی جو بے دین قوی جموروں کی رائے دی کے معاملہ میں بر تھی ہیں۔ اسلام میں رئیسِ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ اصول اسلام کے مطابق ریاست کا نظام چلائے، لہذا جو لوگ سرے سے اصول اسلام کو مانتے ہی نہ ہوں وہ رئیسِ مملکت کا منصب بہرحال نہیں سنہمال سکتے۔

### مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ

اس کے بعد ہمارے سامنے مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کا مسئلہ آتا ہے۔ جہاں تک شیعہ اسلامی نظریہ کا تعلق ہے، اس کی رو سے تو مجلس شوریٰ میں بھی غیر مسلموں کی نمائندگی صحیح نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے حالات میں اس کے لئے محتاجش ثالی جاسکتی ہے بڑھنکہ نک کے دستور میں اس بات کی واضح اور صریح دعالت موجود ہو کر۔

(ا) پارلیمنٹ قران و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہ ہو گی اور ہر فیصلہ جو اس حد سے تجاوز ہو قانونی سند حاصل کرنے سے محروم رہے گا۔

(ب) ملک کے قانون کا اولین ماذقہ قرآن و سنت ہوں گے۔

(ج) قوانین کی آخری توثیق کا اختیار جس شخص کو حاصل ہو گا وہ لازماً "مسلمان" ہو گا۔

ایک شغل یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ غیر مسلموں کو ملک کی پارلیمنٹ میں شامل کرنے کے بجائے ان کے لئے ایک الگ نمائندہ مجلس یا اسمبلی بنادی جائے تا کہ وہ اپنی اجتماعی ضروریات بھی اس کے ذریعہ سے پوری کریں، اور محلی انتظام کے معاملہ میں بھی انہا نقلہ نظر پیش کر سکیں۔ اس مجلس کی رکنیت اور رائے وہی غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہو اور اس میں ان کو انہمار رائے کی پوری آزادی دی جائے۔ اس مجلس کے ذریعہ سے:-

۱۔ وہ اپنے مخصوصی معاملات کی حد تک قوانین تجویز کرنے اور سابق قوانین میں اصلاح و ترمیم کرنے کے مجاز ہوں گے، اور اس طرح کی تمام تجویزیں رکھیں گی۔ حکومت کی منظوری سے قانون بن سکیں گی۔

۲۔ وہ حکومت کے نظم و نتیق اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے متعلق اپنی شکایات، اعتراضات، مشورے اور تجویز پوری آزادی کے ساتھ پیش کر سکیں گے اور حکومت انصاف کے ساتھ ان پر غور کرے گی۔

۳۔ وہ اپنے گروہ کے معاملات اور عام محلی معاملات کے متعلق سوالات بھی کر سکیں گے، اور حکومت کا ایک نمائندہ ان کے جوابات دینے کے لئے موجود رہے گا۔

ذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک بلدیات اور مقامی مجالس (Local Bodies) کا تعلق ہے ان میں غیر مسلموں کو نمائندگی اور رائے دہی کے پورے حقوق دیئے جاسکتے ہیں۔

### آزادی تحریر و تقریر وغیرہ

غیر مسلموں کو اس ریاست میں تحریر و تقریر اور رائے و خمیر اور اجتماع کی دعی آزادی حاصل ہو گی جو خود مسلمانوں کو حاصل ہو گی، اور اس معاملہ میں جو قانونی پابندیاں مسلمانوں کے لئے ہوں گی دعی ان کے لئے بھی ہوں گی۔

قانون کی حدود میں رہنے ہوئے وہ حکومت پر، اس کے حامی پر اور خود ریاست کی حکومت پر آزادانہ تنقید کر سکتی گے۔

قانون کی حدود کے اندر غیر مسلموں کو بھی مذہبی بحث و مباحثہ کی ولی ہی آزادی ہو گی جیسی مسلمانوں کو ہے۔

وہ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی پوری طرح آزاد ہوں گے اور اگر ایک غیر اسلامی مذہب کا یہود کسی دوسرے غیر اسلامی مذہب کو قبول کر لے تو حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ البتہ کوئی مسلمان اسلامی ریاست کے حدود میں رہنے ہوئے اپنا دین بدلتے کا مجاز نہ ہو گا۔ لیکن ارتداویں صورت میں منواختہ جو کچھ بھی ہو گا خود مرتد سے ہو گا نہ کہ اس غیر مسلم سے جس کا اثر قبول کر کے وہ مرتد ہوا ہے۔

انہیں اپنے خمیر کے خلاف کوئی عقیدہ یا عمل انتیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا، اور اپنے خمیر کے مطابق وہ ایسے سب کام کرنے کے مجاز ہوں گے جو قانون ملکی سے مصادم نہ ہوتے ہوں۔

### تعلیم

انہیں نظام تعلیم تو دعی قبول کرنا ہو گا جو ریاست پورے ملک کے لئے ہائے گی، لیکن جہاں تک اسلام کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے، اس کے پڑھنے پر وہ مجبور نہ

کیے جائیں گے۔ اپنی پورا حق ہو گا کہ یعنی درس گاہوں میں، یا خود اپنی مخصوص درس گاہوں میں، اپنے مذہب کی تعلیم کا مشتمل انعام کریں۔

### لازم متنیں

چند محفوظ مناصب کے سوا وہ تمام لازموں میں داخل ہونے کے حق دار ہوں۔ مگر اس معاملہ میں ان کے ساتھ کوئی تعصب نہ برداشت کرے گا۔ مسلمان اور غیر مسلم، دونوں کے لئے الیت کا ایک یعنی معیار ہو گا اور اہل آدمیوں کو بلا اختیار انتخاب کیا جائے گا۔

محفوظ مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مناصب کی فہرست کافی غور و خوض کے بعد ماہرین کی ایک جماعت ہنا سکتی ہے۔ ہم ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تکمیل اور حکوموں کی رہنمائی سے ہے وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں، اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں کو دی جاسکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان خدمات کو مستحق کرنے کے بعد باقی تمام نظم و نتیجے میں بڑے سے بڑے عمدوں پر بھی اہل الذمہ اپنی الیت کے لحاظ سے متعدد کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً کوئی چیز ان میں سے کسی شخص کے آکاؤنٹسٹ جنرل، یا چیف انجینئر یا پوسٹ میشن جنرل ہائے جائے میں مانع نہیں ہے۔

ای مطرح فوج میں بھی صرف جنگی خدمات محفوظ لازموں میں ثمار ہوں گی۔ باقی دوسرے فوجی شعبے جن کا تعلق برداشت راست حرب و ضرب سے نہیں ہے، ذمیوں کے لئے کھلے ہوں گے۔

### معاشی کار و بار اور پیشے

صنعت و حرف، تجارت، زراثت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے غیر

مسلموں کے لئے بالکل کھلے رہیں گے۔ ان میں مسلمانوں کو ایسی کوئی رعایت حاصل نہ ہو گی جو غیر مسلموں کو نہ حاصل ہو، اور غیر مسلموں پر کوئی ایسی پابندی عائد نہ کی جاسکے گی جو مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔ ہر شری کو، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، محاشر میدان میں جدوجہد کا مساویانہ حق ہو گا۔

### غیر مسلموں کے لئے تحفظ کی واحد صورت

آخر میں اس امر کی توضیح بھی ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شریوں کو جو حقوق بھی دے گی بلا اس لحاظ کے دے گی کہ کوئی ہمارے غیر مسلم حکومت اپنی مسلمان رعایا کو کیا حقوق دیتی ہے، بلکہ کچھ دیتی بھی ہے یا نہیں۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ مسلمان کافروں کو دیکھ دیکھ کر اپنا لا بھ ک عمل بنائے، وہ انصاف کریں تو یہ بھی کرے، اور وہ ظلم کرنے لگیں تو یہ بھی ظلم پر اتر آئے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قطعی اور واضح اصول کے حیروں ہیں اور ہمیں بہر حال اپنے حدود اختیار میں اپنے اصولوں پر ہی عمل کرنا ہے۔ جو ہم دین گے نیک نیتی کے ساتھ دین گے، صرف کاغذی پر نہیں بلکہ زمین پر بھی دین گے۔ اور اپنی لی ہوئی ذمہ داریوں کو انصاف اور سچائی کے ساتھ ادا کریں گے۔

اس کے بعد یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں رہتی کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لئے تحفظ، امن اور خوش حالی کی اس سے بڑھ کر، بلکہ درحقیقت اس کے سوا کوئی قابل اعتماد خانست نہیں ہو سکتی کہ یہاں ایک غالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ صرف اسی صورت میں ظلم اور جوابی ظلم کا وہ شیطانی چکر نوٹ سکتا ہے جو بد نیتی سے بر عظیم ہند میں چل رہا ہے۔ صرف اسی صورت میں پاکستان بھی انصاف کا مگر بن سکتا ہے اور انہیں یونیورسٹی کو بھی انصاف کا راستہ نظر آ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ غیر مسلم ایک دلت سے اسلام کی علاط تعبیریں سنتے اور دیکھتے چلے آ رہے ہیں، اس لئے وہ اسلامی حکومت کا نام من کر گمراہتے ہیں، اور ان میں سے بعض لوگ یہ شور چانے لگتے ہیں کہ یہاں بھی انہیں یونیورسٹی کی طرح بے دین جمیعت قائم ہوئی

چاہئے۔ مگر ہم کو تجربہ ہے کہ وہ خود ہی اصرار کر کے یہاں اس چیز کا تجربہ کرنا چاہئے ہیں جس کا مزہ آج انہیں پونہن کے مسلمان چکھے رہے ہیں۔ کیا واقعی وہ کوئی خونگوار حالت ہے جس کی تمنا کی جاسکتی ہو؟ کیا اس کے بجائے ایک ایسے نظام کا تجربہ کرنا زیادہ بہتر نہ ہو گا جس کی بنیاد خدا تری اور دیانت اور مستقل اصولوں کی عروی پر ہو۔

---

باب ۱۳

اسلام اور عدل اجتماعی

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل اجتماعی اور کفالت عامہ کا نکام قائم کرے اور اپنے حدود میں رہنے والے ہر تنفس کے لیے باعزت زندگی گزارنے کی سوتیں فراہم کریں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی<sup>7</sup> نے اس موضوع پر حج کے موقع پر مکہ مطہر میں منعقد کی جانے والی موتمر عالم اسلامی کے اجتماع میں ایک مقالہ پڑھا تھا جسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ اسلامی ریاست کی معashi اور تحری پالیسی پر روشنی ڈالتا ہے۔

مرتب

## اسلام اور عدل اجتماعی

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اس کے محیب کر شموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عرب فساد اور بے نقاب نفثے کی طرف کمی را غب ہوتا ہے اور اس بنا پر شیطان اکثر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے نفثہ و فساد کو کسی نہ کسی طرح صلاح و خیر کا دھوکہ دینے والا لباس پہن کر اس کے سامنے لائے۔ جنت میں آدم علیہ السلام کو یہ کہہ کر شیطان ہر گز دھوکا نہ دے سکتا تھا کہ میں تم سے خدا کی نافرمانی کرانا چاہتا ہوں تاکہ تم جنت سے نکال دیئے جاؤ۔ بلکہ اس نے یہ کہ کر انہیں دھوکا دیا کہ ہل لد لک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلی۔ (کیا میں تمہیں وہ درخت جتاوں جو حیات ابدی اور لازوال پاؤ شایی کا درخت ہے) میں انسان کی فطرت آج تک بھی چل رہی ہے۔ آج بھی جتنی غلطیوں اور حماقتوں میں شیطان اس کو جلا کر رہا ہے وہ سب کسی نہ کسی پر فریب نہ رے اور کسی نہ کسی لباس زور کے سارے مقبول ہو رہی ہیں۔

### دور جدید کے چند فریب

انہی دھوکوں میں سے ایک بہت بڑا دھوکا وہ ہے جو موجودہ زمانے میں اجتماعی عدل (Social Justice) کے نام سے بنی نوع انسان کو دیا جا رہا ہے۔ شیطان پلے ایک مدت تک دنیا کو حرمت فرد (Individual Liberty) اور فراخندی (Liberalism) کے نام سے دھوکا ریکھ رہا اور اس کی بیمار پر اس نے اٹھا رہا ہے۔

صدی میں سرمایہ داری اور لا رینی جموریت کا ایک نظام قائم کرایا۔ ایک وقت اس نظام کے غلبے کا یہ حال تھا کہ دنیا میں اسے انسانی ترقی کا حرف آخر سمجھا جاتا تھا اور ہر دہ عینچھ جو اپنے آپ کو ترقی پسند کھلانا چاہتا ہو مجبور تھا کہ اسی انفرادی آزادی اور فرائدی کا نزدہ لگائے۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خیات انسانی کے لئے اگر کوئی نظام ہے تو بس وہ بھی سرمایہ داری نظام اور بھی لا رینی جموریت ہے جو مغرب میں قائم ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے وہ وقت بھی آگیا جب ساری دنیا یہ محوس کرنے لگی کہ اس شیطانی نظام نے زمین کو ظلم و جور سے بھر دیا ہے۔ اس کے بعد ابلیس لعین کے لئے ممکن نہ رہا کہ اس نفرے سے مزید کچھ مدت تک نوع انسانی کو دھوکا دے سکے۔

پھر کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہی شیطان ایک دوسرا فریب اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نام سے ہالا لایا اور اب اس جھوٹ کے بیاس میں وہ ایک دوسرا نظام قائم کرو رہا ہے۔ یہ نیا نظام اس وقت تک دنیا کے متعدد ملکوں کو ایک ایسے ظلم عظیم سے لبرز کر چکا ہے جس کی کوئی نظر انسانی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کے فریب کا یہ زور ہے کہ بہت سے دوسرے ملک اسے ترقی کا حرف آخر سمجھ کر قبول کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ابھی اس فریب کا پردہ پوری طرح چاک نہیں ہوا ہے۔

مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں ایک دائیٰ وابدی ہدایت موجود ہے جو انہیں شیطانی و سادوس پر مقابہ کرنے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہدایت کی روشنی دکھانے کے لئے ابد تک کافی ہے، مگر یہ مساکین اپنے دین سے جاہل اور استغفار کی تہذیب و نکری تائیت سے بری طرح مغلوب ہیں۔ اس لئے ہر دہ نزدہ جو دنیا کی غالب قوموں کے یہ پس سے بلند ہوتا ہے، اس کی صدائے بازگشت فوراً ہی یہاں سے بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں انقلاب فرانس کے اٹھائے ہوئے افکار کا زور تھا، مسلمان ملکوں میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انہی افکار کا موقع بے موقع انھمار کرے اور

انی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کوئی عزت قائم نہ ہوگی اور وہ رجعت پسند سمجھ لیا جائے گا۔ یہ دو رجب گزر گیا تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمت قبلہ بھی تبدیل ہونے لگی اور نیادور آتے ہی اجتماعی عدل اور اشتراکیت کے نظرے بلند کرنے والے ہمارے درمیان پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک بھی بات قابل مبرہ تھی۔ لیکن غصب یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا بھی اختار ہا ہے جو اپنے قبلے کی ہر تبدیلی کے ساتھ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اپنا قبلہ تبدیل کرے۔ کویا اسلام کے بغیر یہ بیچارے جی نہیں سکتے۔ اس کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ جس کی پیروی کر کے یہ ترقی کرنا چاہتے ہیں اس کی پیروی سے اسلام بھی مشرف ہو جائے اور ”دین رجعی“ ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اسی بناء پر پہلے کوشش کی جاتی تھی کہ حریت فرد اور فراغ دلی اور سرمایہ داری اور بے دین جمورویت کے مغربی تصورات کو عین اسلامی ثابت کیا جائے، اور اسی بناء پر اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں بھی اشتراکی تصور کی عدالت اجتماعیہ موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی غلامی اور ان کی جاہلیت کی تغییانی ذلت کی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے۔

### عدالت اجتماعیہ کی حقیقت

میں اس مختصر مقالے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عدالت اجتماعیہ درحقیقت نام سی چیز کا ہے اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے۔ اگرچہ اس امر کی امید بہت کم ہے کہ جو لوگ اشتراکیت کو عدالت اجتماعیہ کے قیام کی واحد صورت سمجھ کر اسے نافذ کرنے پر تھے ہوئے ہیں وہ اپنی غلطی مان لیں گے اور اس سے رجوع کر لیں گے، کیونکہ جاہل جب تک محض جاہل رہتا ہے اس کی اصلاح کے بہت کچھ امکانات باقی رہتے ہیں، مگر جب وہ حاکم ہو جاتا ہے تو ماعلمنت لكم من الله غیری۔

کا ذمہ اسے کسی سمجھانے والے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہنے پڑتا۔ لیکن عامہ الناس خدا کے خل سے ہر وقت اس قابل رہتے ہیں کہ معقول طریقے سے بات سمجھا کر انہیں شیطان کے فریبیوں پر مجبہ کیا جاسکے۔ اور یہی عامہ الناس ہیں جنہیں فریب دے کر گراہ اور گراہ کن لوگ اپنی ملالتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اس لئے میرے اس مقالے کی غرض دراصل عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو کھول کر بیان کر رہا ہے۔

### اسلام میں عدالت اجتماعیہ

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو میں اپنے مسلمان بھائیوں کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو لوگ "اسلام میں بھی عدالت اجتماعیہ موجود ہے" کا انفراد بلند کرتے ہیں وہ بالکل ایک غلط بات کہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام یہی میں عدالت اجتماعیہ ہے۔ اسلام وہ دین حق ہے جو خالق کائنات اور رب کائنات نے انسان کی پرایت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ نظر کرنا کہ ان کے لئے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے، انسانوں کے خالق و رب یہی کا کام ہے۔ دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل و ظلم کا معیار تجویز کرے، اور نہ دوسرے کسی میں یہ الیت پاکی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کر سکے۔ انسان اپنا آپ مالک اور حاکم نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے معیار عدل خود تجویز کر لینے کا مجاز ہو۔ کائنات میں اس کی حیثیت خدا کے مخلوق اور رعیت کی ہے، اس لئے معیار عدل تجویز کرنا اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے مالک اور فرمان رو اکا کام ہے۔ پھر انسان، "خواہ" کہتے ہی بلند مرتبے کا ہو، اور خواہ ایک انسان نہیں بہت سے بلند مرتبہ انسان مل کر بھی اپنا ذہن استعمال کر لیں۔ برعکس انسانی علم کی محدودیت اور عمل انسانی کی کوتاہی و نارسائی اور انسانی عمل پر خواہشات و تحفظات کی دست برداشتے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان خود اپنے لئے کوئی ایسا نظام بنائے جو درحقیقت عدل پر مبنی ہو۔ انسان کے بنائے

ہوئے نظام میں ابتدا "بظاہر کیسا ہی عدل نظر آئے" بہت جلدی عملی تجربہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ فی الحقیقت اس میں عدل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہر انسانی نظام کچھ مدت بکھ پڑنے کے بعد ناقص ثابت ہو جاتا ہے اور انسان اس سے بیزار ہو کر ایک دونرے احتمانہ تجربے کی طرف پیش قدمی کرنے لگتا ہے۔ حقیقی عدل صرف اسی نظام میں ہو سکتا ہے جو ایک عالم الغیر والشادوہ اور سیوح و قدوس ہستی نے بنایا ہے۔

### عدل ہی اسلام کا مقصود

دوسری بات جو آغاز ہی میں سمجھ لینی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص "اسلام میں عدل ہے" کہتا ہے وہ حقیقت سے کم تر بات کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ عدل قائم کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لقد أرسلنا رسلنا بالبيت و انزلنا معهم الكتب والميزان ليقوم  
الناس بالقسط و أنزلنا الحدود فيه باس شديد ومنافع للغافل وليعلم  
الله من ينصره ورسله بالغيب إن الله قوي عزيز۔ (الحمد ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسان انصاف پر قائم ہو، اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت طاقت اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں، تاکہ اللہ یہ معلوم کرے کہ کون بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً" اللہ قوی اور زبردست ہے۔"

یہ دو باتیں ہیں جن سے اگر ایک مسلمان غافل نہ ہو تو وہ کبھی عدالت اجتماعیہ کی علاش میں اللہ اور اس کے رسول کو محروم کر کسی دوسرے ماذد کی طرف توجہ کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ جس لمحے اس عدل کی ضرورت کا احساس ہو گا اسی لمحے اسے معلوم ہو جائیگا کہ عدل اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کے پاس نہ

ہے، اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جان لے گا کہ عدل قائم کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ کرنا نہیں ہے کہ اسلام، پورا کا پورا اسلام، بلا کم و کاست اسلام، قائم کر دیا جائے۔ عدل، اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ اسلام خود عدل ہے۔ اس کا قائم ہونا اور عدل کا قائم ہو جانا ایک ہی چیز ہے۔

### عدل اجتماعی کیا ہے؟

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ عدل اجتماعی درحقیقت ہے کس چیز کا نام اور اس کے قیام کی صحیح صورت کیا ہے؟

### انسانی شخصیت کی نشوونما

ہر انسانی معاشرہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں افراد سے مل کر ہتا ہے۔ اس مرکب کا ہر فرد ذی روح، ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ ہر فرد اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جسے پہلنے پھولنے اور نشوونما پانے کے لئے مواقع درکار ہیں۔ ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی ذوق ہے۔ اس کے اپنے نفس کی کچھ رغبات و خواہشات ہیں۔ اس کے اپنے جسم و روح کی کچھ ضروریات ہیں۔ ان افراد کی حیثیت کسی مشین کے بے روح پرزوں کی نہیں ہے کہ اصل چیز مشین ہو اور یہ پر زے اس مشین ہی کے لئے مطلوب ہوں، اور بجائے خود پرزوں کی کوئی شخصیت نہ ہو۔ بلکہ اس کے بر عکس انسانی معاشرہ جیتے جائیں جسے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ افراد اس مجموعے کے لئے نہیں ہیں بلکہ مجموعہ ان افراد کے لئے ہے، اور افراد جمع ہو کر یہ مجموعہ بناتے ہی اس غرض کے لئے ہیں کہ ایک دوسرے کی مدد سے انہیں اپنی ضروریات حاصل کرنے اور اپنے نفس و جسم کے مطالبات اور تقاضے پورے کرنے کے مواقع میں۔

### انفرادی جوابدہی

پھر یہ تمام افراد فردا "فردا" خدا کے سامنے جواب دہیں۔ ہر ایک کو اس دنیا

میں ایک خاص مدت اختیان (جو ہر فرد کے لئے الگ مقرر ہے) گزارنے کے بعد اپنے خدا کے حضور جا کر حساب دینا ہے کہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اسے دنیا میں دی گئی تھیں ان سے کام لے کر اور جو ذرائع اسے عطا کیے گئے تھے ان پر کام کر کے وہ اپنی کیا شخصیت بنا کر لایا ہے۔ خدا کے سامنے انسان کی یہ جواب دہی اجتماعی نہیں بلکہ افرادی ہے۔ وہاں کنبے اور قبیلے اور قومیں کھڑی ہو کر حساب نہیں دیں گی، بلکہ دنیا کے تمام رشتہوں سے کاٹ کر اللہ تعالیٰ ہر ہر انسان کو الگ الگ اپنی عدالت میں حاضر کرے گا اور فردا "فرد" اس سے پوچھے گا کہ تو کیا کر کے آیا ہے اور کیا بن کر آیا ہے۔

## افرادی آزادی

یہ دونوں امور ۔۔۔۔۔ یعنی دنیا میں انسانی شخصیت کا نشوونما اور آخرت میں انسان کی جواب دہی ۔۔۔۔۔ اسی بات کے طالب ہیں کہ دنیا میں فرد کو حرمت حاصل ہو۔ اگر کسی معاشرے میں فرد کو اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی محیل کے موقع حاصل نہ ہوں تو اس کے اندر انسانیت ٹھہر کر رہ جاتی ہے، اس کا دم سکھنے لگتا ہے، اس کی قوتیں اور قابلیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور اپنے آپ کو محصور و محبوس پا کر انسان جمود و تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت میں ان محبوس و محصور افراد کے قصوروں کی پیشتر ذمہ داریاں ان لوگوں کی طرف تحفظ ہو جائے والی ہیں جو اس قسم کے اجتماعی نظام کو ہنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہوں۔ ان سے صرف ان کے افرادی اعمال ہی کا محاسبہ نہ ہو گا بلکہ اس بات کا محاسبہ بھی ہو گا کہ انہوں نے ایک جابرانہ نظام قائم کر کے دوسرے پے شمار انسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف اور اپنی مرضی کے مطابق ناقص شخصیتیں بننے پر مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی مومن بالآخر یہ بھاری بوجو اٹھا کر خدا کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر خدا سے ڈرنے والا انسان ہے تو لازماً "وہ افراد کو زیادہ سے زیادہ حرمت دینے کی طرف مائل ہو گا تاکہ ہر فرد جو کچھ بھی بنے اپنی ذمہ داری پر بنے"

اس کے ایک بُلٹِ شخصیت بننے کی ذمہ داری اجتماعی نظام چلانے والے پر عائدہ ہو جائے۔

## اجتمی ادارے اور ان کا اقتدار

یہ معاملہ تو ہے افرادی آزادی کا۔ دوسری طرف معاشرے کو دیکھیجئے جو کنہوں، قبیلوں، قوموں اور پوری انسانیت کی محل میں علی الترتیب قائم ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء ایک مرد اور ایک عورت اور ان کی اولاد سے ہوتی ہے جس سے خاندان بنتا ہے۔ ان خاندانوں سے تعلیم اور برادریاں بنتی ہیں، ان سے ایک قوم وجود میں آتی ہے، اور قوم اپنے اجتماعی ارادوں کی تنفیذ کے لئے ایک ریاست کا نظام ہاتی ہے۔ ان مختلف شکلتوں میں یہ اجتماعی ادارے ادارے اصلاح "جس غرض کے لئے مطلوب ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی حفاظت اور ان کی مدد سے فرد کو اپنی شخصیت کی سمجھیل کے وہ موقع نصیب ہو سکیں جو وہ تمباکپنے میں بونے پر حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن اس بیوادی مقصد کا حصول اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک ادارے کو افراد پر، اور بڑے ادارے کو چھوٹے اداروں پر اقتدار حاصل ہو تاکہ وہ افراد کی الی آزادی کو روک سکیں جو دوسروں پر دست درازی کی حد تک پہنچی ہو، اور افراد سے وہ خدمت لے سکیں جو بھیت مجھی تمام افراد معاشرہ کی فلاخ و ترقی کے لئے مطلوب ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مخفج کر عدالت اجتماعیہ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور افرادیت و اجتماعیت کے مقابلہ قاضیے ایک سمجھی کی محل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرف انسانی فلاخ اس بات کی متفصیلی ہے کہ فرد کو معاشرے میں آزادی حاصل ہو تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور اپنی پسند کے مطابق اپنی شخصیت کی سمجھیل کر سکے۔ اور اسی طرح خاندان، قبیلے، برادریاں، اور مختلف گروہ بھی اپنے سے بڑے دائرے کے اندر اس آزادی سے متعین ہوں جو ان کے اپنے دائرہ عمل میں انہیں حاصل ہونی ضروری ہے۔ مگر دوسری طرف انسانی فلاخ یہ اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ افراد پر خاندان کا، خاندانوں پر قبیلوں اور برادریوں کا، اور

تمام افراد اور چھوٹے اداروں پر ریاست کا اقتدار ہو، تاکہ کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسروں پر ظلم و تعدی نہ کر سکے۔ اور یہی مسئلہ آجے چل کر پوری انسانیت کے لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف ہر قوم اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے، اور دوسری طرف کسی ہالاتِ قوتِ ضابطہ کا ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ قویں اور ریاستیں خدا سے تجاوز نہ کر سکیں۔

اب عدالت اجتماعیہ درحقیقت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ افراد، خاندانوں، قبیلوں، برادریوں اور قوموں میں سے ہر ایک کو مناسب آزادی بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ظلم و عدوان کو روکنے کے لئے مختلف اجتماعی اداروں کو افراد پر اور ایک دوسرے پر اقتدار بھی حاصل رہے، اور مختلف افراد مجتمعات سے وہ خدمت بھی لی جاسکے جو اجتماعی فلاح کے لئے درکار ہے۔

### سرمایہ داری اور اشتراکیت کی خامیاں

اس حقیقت کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے گا وہ پہلی یعنی نظر میں یہ جان لے گا کہ جس طرح حق فرد، فراغ دلی، سرمایہ داری اور بے دین جمورویت کا وہ نظام اجتماعی عدل کے منافی تھا جو انقلاب فرانس کے نتیجے میں قائم ہوا تھا، تھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اشتراکیت بھی اس کے قطعی منافی ہے جو کارل مارکس اور انگلز کے نظریات کی ہیروی میں اختیار کی جا رہی ہے۔ پہلے نظام کا قصور یہ تھا کہ اس نے فرد کو حد مناسب سے زیادہ آزادی دے کر خاندان، قبیلے، برادری، معاشرے اور قوم پر تعدی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی اور اس سے اجتماعی فلاح کی خدمت لینے کے لئے معاشرے کی قوتِ ضابطہ کو بہت ڈھیلا کر دیا۔ اور اس دوسرے نظام کا قصور یہ ہے کہ یہ ریاست کو حد سے زیادہ طاقت ور بنا کر افراد، خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی آزادی قریب قریب بالکل سلب کر دیتا ہے، اور افراد سے جمع کی خدمت لینے کے لئے ریاست کو اتنا زیادہ اقتدار دے دیتا ہے کہ افراد ذی روح انسانوں کے بجائے ایک مشین کے بے روح پرزوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

بالکل جھوٹ کتا ہے جو کتا ہے کہ اس طریقے سے عدالت اجتماعیہ قائم ہو سکتی ہے۔

## اشتراکیت ظلم اجتماعی کی بدترین شکل

درحقیقت یہ ظلم اجتماعی کی وہ بدترین صورت ہے جو کبھی کسی نمودر، کسی فرعون اور کسی چنگیز خان کے دور میں بھی نہ رہی تھی۔ آخر اس چیز کو کون صاحب عدل اجتماعی عدل سے تعبیر کر سکتا ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص بیٹھ کر اپنا ایک اجتماعی فلسفہ تصنیف کر لیں، پھر حکومت کے غیر محدود اختیارات سے کام لے کر اس فلسفے کو زبردستی ایک پورے ملک کے رہنے والے کروڑوں افراد پر زبردستی مسلط گر دیں۔ لوگوں کے اموال ضبط کریں، زمینوں پر قبضہ کریں، کارخانوں کو قوی ملکیت بنائیں اور پورے ملک کو ایک ایسے جیل خانے میں تبدیل کر دیں جس میں تنقید، فریاد، شکایت، استغاثہ اور عدالتی انصاف کا ہر دروازہ لوگوں کے لئے مسدود ہو۔ ملک کے اندر کوئی جماعت نہ ہو، کوئی تنظیم نہ ہو، کوئی پلیٹ فارم نہ ہو جس پر لوگ زبان کھول سکیں، کوئی پرنس نہ ہو جس میں لوگ انعامات خیال کر سکیں، اور کوئی عدالت نہ ہو جس کا دروازہ انصاف کے لئے مکھنا سکیں۔ جاسوسی کا نظام اتنے بڑے پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ہر ایک آدمی دوسرے آدمی سے ڈرنے لگے کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہو، حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی ایک آدمی زبان کھولتے ہوئے پہلے چاروں طرف دیکھ لے کہ کوئی کان اس کی بات سننے اور کوئی زبان اسے حکومت تک پہنچانے کے لئے کہیں پاس ہی موجود نہ ہو۔ پھر جمہوریت کا فریب دینے کے لئے انتخابات کروائے جائیں، مگر پوری کوشش کی جائے کہ اس فلسفے کی تصنیف کرنے والوں سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص ان انتخابات میں حصہ نہ لے سکے، اور نہ کوئی ایسا شخص ان میں دخیل ہو سکے جو خود اپنی کوئی رائے بھی رکھتا ہو اور اپنا ضمیر فروخت کرنے والا بھی نہ ہو۔

بالفرض اس طریقے سے اگر معاشری دولت کی مساوی تقسیم ہو بھی سکے — در آنحال یہ کہ آج تک کوئی اشتراکی نظام ایسا نہیں کر سکا ہے۔

بھی کیا عدل محسن معاشی مساوات کا نام ہے؟ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ اس نظام کے حاکموں اور مخصوصوں کے درمیان بھی معاشی مساوات ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس نظام کا ذکر کیا اور اس کے اندر رہنے والا ایک کسان کیا اپنے معیار زندگی میں مساوی ہیں؟ میں صرف یہ پوچھتا ہوں گہ اگر ان سب کے درمیان واقعی پوری معاشی مساوات قائم بھی ہو جائے تو کیا اس کا نام اجتماعی عدل ہو گا؟ کیا عدل یہی ہے کہ ذکر کیا اور اس کے ساتھیوں نے جو فلسفہ گھرا ہے اس کو تو وہ پولیس اور فوج اور جاسوسی نظام کی طاقت سے بالجبر سادی قوم پر مسلط کر دیتے ہیں بھی آزاد ہو۔ اور قوم کا کوئی فرد اس کے قلمخانے پر۔ یا اس کی حفیذہ کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جزوی عمل پر محسن زبان سے ایک لفظ نکالنے تک میں آزاد نہ ہو؟ کیا یہ عدل ہے کہ ذکر کیا اور اس کے چند مٹھی بھر مای اپنے قلمخانے کی ترویج کے لیے تمام ملک کے زرائع و سائکل استعمال کرنے اور ہر قسم کی تنظیمات بنانے کے حق دار ہوں مگر ان سے مختلف رائے رکھنے والے دو آدمی بھی مل کر کوئی عظیم نہ کر سکیں، کسی مجمع کو خطاب نہ کر سکیں، اور کسی پولیس میں ایک لفظ بھی شائع نہ کر سکیں؟ کیا یہ عدل ہے کہ تمام زمینداروں اور کارخانہ واروں کو بے دخل کر کے پورے ملک میں صرف ایک ہی زمیندار اور کارخانہ دار رہ جائے جس کا نام حکومت ہو، اور وہ حکومت چند گھنے پنے آدمیوں کے ہاتھ میں ہو، اور وہ آدمی ایسی تمام تباہی اختیار کر لیں جن سے پوری قوم بالکل بے بس ہو جائے اور حکومت کے اختیارات کا ان کے ہاتھ سے بالکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں چلا جانا قطعی ناممکن ہو جائے؟ انہاں اگر محسن پیٹ کا نام نہیں ہے، اور انسانی زندگی اگر صرف معاش تک محدود نہیں ہے، تو محسن معاشی مساوات کو عدل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ہر شے میں ظلم و جور قائم کر کے، اور انسانیت کے ہر رخ کو دپا کر صرف معاشی دولت کی تقسیم میں لوگوں کو برابر بھی کر دیا جائے، اور خود ذکر کیا اور اس کے اذنا ب بھی اپنے معیار زندگی میں لوگوں کے برابر ہو کر رہیں، تب بھی اس ظلم عظیم کے ذریعہ سے یہ مساوات

قائم کرنا اجتماعی عدل قرار نہیں پاسکا بلکہ یہ، جیسا کہ ابھی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں، وہ بدترین اجتماعی غلام ہے جس سے تاریخ انسانی کمی اس سے پہلے آشنا نہ ہوئی تھی۔

### اسلام میں عدل کا تصور

اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو ہتاوں گا کہ اسلام میں جس چیز کا نام عدل ہے وہ کیا ہے۔ اسلام میں اس امر کو کوئی سمجھائش نہیں ہے کہ کوئی شخص، یا انسانوں کا کوئی گروہ انسانی زندگی میں عدل کا کوئی فلسفہ اور اس کے قیام کا کوئی طریقہ بیٹھ کر خود گھڑلے اور اسے بالجبر لوگوں پر سلط کر دے اور کسی بولنے والی زبان کو حرکت نہ کرنے دے۔ یہ مقام ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو تو کیا، خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل نہ تھا۔ اسلام میں کسی ڈیکٹیٹر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف خدا ہی کا یہ مقام ہے کہ انسان اس کے حکم کے آگے بے چون چاہر جھکا دیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس کے حکم کے تابع تھے اور ان کے حکم کی اطاعت صرف اس لیے فرض تھی کہ وہ خدا کی طرف سے حکم دیتے تھے نہ کہ مجاز اللہ اپنے نفس سے گھڑ کر کوئی فلسفہ لے آتے تھے۔ رسولؐ اور خلفائے رسول کے نظام حکم میں صرف شریعت الیہ تقدیم سے بالاتر تھی۔ اس کے بعد ہر شخص کو ہر وقت ہر معاملے میں زبان کھولنے کا پورا حق حاصل تھا۔

### آزادی فرد کے حدود

اسلام میں اللہ تعالیٰ نے خود وہ حدود قائم کر دیے ہیں جن میں افراد کی آزادی کو محدود ہونا چاہئے۔ اس نے خود مشین کر دیا ہے کہ ایک فرد مسلم کے لیے کون کون سے افعال حرام ہیں جن سے اس کو پہنچا چاہئے اور کیا کچھ اس پر فرض ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہئے۔ کیا حقوق اس کے دوسروں پر ہیں اور کیا حقوق دوسروں کے اس پر ہیں۔ کن ذرائع سے ایک مال کی ملکیت کا اس کی طرف منتقل

ہونا جائز ہے اور کون سے ذرائع ایسے ہیں جن سے حاصل ہونے والے مال کی ملکیت جائز نہیں ہے۔ افراد کی بھلائی کے لئے مجتمع پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور مجتمع کی بھلائی کے لئے افراد پر، خاندانوں اور برادریوں پر اور پوری قوم پر کیا پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں اور کیا خدمات لازم کی جاسکتی ہیں۔ یہ تمام امور کتاب و سنت کے اس مستقل دستور میں ثبت ہیں جس پر کوئی نظر ہانی کرنے والا نہیں ہے اور جس میں کسی کو کمی و بیشی کر دینے کا حق نہیں ہے۔ اس دستور کی رو سے ایک شخص کی انفرادی آزادیوں پر جو پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں ان سے تجاوز کرنے کا تو وہ حق نہیں رکھتا لیکن ان حدود کے اندر جو آزادی اس کو حاصل ہے اسے سلب کر لینے کا بھی کسی کو حق نہیں ہے۔ کب اموال کے جن ذرائع اور صرف مال کے جن طریقوں کو حرام کر دیا گیا ہے ان کے وہ قریب نہیں پڑک سکتا اور پچکے تو اسلامی قانون اسے مستوجب سزا سمجھتا ہے، لیکن جو ذرائع حال ٹھیرائے گئے ہیں ان سے حاصل ہونے والی ملکیت پر اس کے حقوق بالکل محفوظ ہیں اور اس میں تصرف کے جو طریقے جائز کیے گئے ہیں ان سے کوئی اس کو محروم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مجتمع کی فلاح کے لئے جو فرائض افراد پر عاید کر دیے گئے ہیں۔ ان کے ادا کرنے پر تو وہ مجبور ہے، لیکن اس سے زائد کوئی بار جبرا "اس پر عاید نہیں کیا جاسکتا" الایہ کہ وہ خود رضا کارانہ ایسا کرے۔ اور یہی حال مجتمع اور ریاست کا بھی ہے کہ افراد کے جو حقوق اس پر عاید کیے گئے ہیں انہیں ادا کرنا اس پر انتہائی لازم ہے جتنا افراد سے اپنے حقوق وصول کرنے کے اسے اختیارات ہیں۔ اس مستقل دستور کو اگر عملاً نافذ کر دیا جائے تو ایسا مکمل عدل اجتماعی قائم ہوتا ہے جس کے بعد کوئی شے مطلوب باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ دستور جب تک موجود ہے اس وقت تک کوئی شخص خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مسلمانوں کو ہرگز اس دھوکے میں نہیں ڈال سکتا کہ جو اشتراکیت اس نے کسی مجہ سے مستعار لے لی ہے وہی عین اسلام ہے۔

اسلام کے اس دستور میں فرد اور مجتمع کے درمیان ایسا توازن قائم کیا گیا ہے

کہ نہ فرد کو وہ آزادی دی گئی ہے جس سے وہ مجتمع کے مفاد کو نقصان پہنچا سکے اور نہ مجتمع کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کر سکے جو اس کی خصیت کے نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

### انتقال دولت کے شرائط

اسلام ایک فرد کی طرف دولت کے انتقال کی صرف تین صورتیں معین کر دیتا ہے۔ وراثت، بہرہ، کسب، وراثت صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک سے اس کے وارث کو شرعی قاعدے کے مطابق پہنچے۔ بہرہ یا عطیہ صرف وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک نے شرعی حدود کے اندر دیا ہو۔ اور اگر یہ عطیہ کسی حکومت کی طرف سے ہو تو وہ اسی صورت میں جائز ہے جب کہ وہ کسی صحیح خدمت کے صلے میں یا مجتمع کے مفاد کے لیے املاک حکومت میں سے معروف طریقے پر دیا گیا ہو۔ نیز اس طرح کا عطیہ دینے کی حق دار بھی وہ حکومت ہے جو شرعی دستور کے مطابق شورمنی کے طریقے پر چلانی جاری ہو اور جس سے محابہ کرنے کی قوم کو آزادی حاصل ہو۔ رہا کسب تو اسلام میں صرف وہ کسب جائز ہے جو کسی حرام طریقے سے نہ ہو۔ سرقہ، غصب، ناپ، تول میں کمی بیشی، خیانت، رشوت، غبن، فتحہ، گری، احکام، اس، سور، جوا، دھوکے کا سورا، مسکرات کی صنعت و تجارت اور اشاعت فاحشہ کرنے والے کار و پار کے ذریعہ سے کسب اسلام میں حرام ہے۔ ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے جو دولت بھی کسی کو طے وہ اس کی جائز ملک ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ ایسی ملکیت کے لیے نہ کمی کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے نہ زیادتی کی۔ نہ اس کا کم ہونا اس بات کو جائز کر دیتا ہے کہ دوسروں سے چھین کر اس میں اضافہ کیا جائے، اور نہ اس کا زیادہ ہونا اس امر کے لیے کوئی دلیل

<sup>۱</sup> قیمتیں چڑھانے کے لئے ضروریات زندگی کو روک رکھنا۔

ہے کہ اسے زبردستی کم کیا جائے۔ البتہ جو دولت ان جائز حدود سے تجاوز کر کے حاصل ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ سوال اٹھانے کا مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ من این لکھ مذکور (یہ تجھے کہاں سے ملا)۔ اسی دولت کے بارے میں پہلے قانونی تحقیق ہوئی چاہئے، پھر اگر ثابت ہو جائے کہ وہ جائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوئی ہے تو اسے ضبط کرنے کا اسلامی حکومت کو پورا حق پہنچتا ہے۔

### صرف دولت پر پابندیاں

جائز طریقے پر حاصل ہونے والی دولت پر تصرف کے بارے میں بھی فرد کو بالکل محلی چھوٹ نہیں دے دی گئی ہے بلکہ اس پر کچھ قانونی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں تاکہ کوئی فرد اپنی ملکیت میں کسی ایسے طریقے پر تصرف نہ کر سکے جو معاشرے کے لئے نقصان دہ ہو، یا جس میں خود اس فرد کے دین و اخلاق کا نقصان ہو۔ اسلام میں کوئی شخص اپنی دولت کو فقیر و فقیر میں صرف نہیں کر سکتا۔ شراب نوشی اور قمار پازی کا دروازہ اس کے لئے بند ہے۔ زنا کا دروازہ بھی اس کے لئے بند ہے۔ وہ آزاد انسانوں کو پکڑ کر انہیں لوہڈی غلام ہنانے اور ان کی بیع و شری کرنے کا بھی کسی کو حق نہیں دینا کہ دولت مندوں اپنے گروں کو خریدی ہوئی لوہڈیوں سے بھر لیں۔ اسراف اور حد سے زیادہ ترفہ اور تنعم پر بھی وہ حدود عائد کرتا ہے اور وہ اسے بھی جائز نہیں رکھتا کہ تم خود عیش کرو اور تمہارا ہمسایہ رات کو بھوکا سوئے۔ اسلام صرف شروع اور معروف طریقے پر ہی دولت سے ممتنع ہونے کا آدمی کو حق دینا ہے اور اگر ضرورت سے زائد دولت کو مزید دولت کمانے کے لئے کوئی شخص استعمال کرنا چاہے تو وہ کب مال کے صرف حال طریقے ہی اختیار کر سکتا ہے۔ ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو شریعت نے کب پر عائد کر دی ہیں۔

### معاشرتی خدمت

پھر اسلام معاشرے کی خدمت کے لئے ہر اس فرد پر جس کے پاس نصیب ہے

زادہ مال جمع ہو زکوٰۃ عائد کرتا ہے۔ نیز وہ اموال تجارت پر، زمین کی پیداوار پر، مواثی پر، اور بعض دوسرے اموال پر بھی ایک خاص شرح سے زکوٰۃ مقرر کرتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی ملک کو لے لجئے اور حساب لگا کر دیجئے لجئے کہ اگر شرعی طریقے کے مطابق وہاں باقاعدہ زکوٰۃ وصول کی جائے اور اسے قرآن کے مقرر کیے ہوئے مصارف میں باقاعدہ تقسیم کیا جائے تو کیا چند سال کے اندر وہاں ایک شخص بھی حاجات زندگی سے محروم رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد جو دولت کسی ایک فرد کے پاس مرتکز ہو گئی ہو، اسلام اس کے مرتبے ہی اس دولت کو وراثت میں تقسیم کر دیتا ہے تاکہ یہ ارتکاز ایک دائمی اور مستقل ارتکاز بن کر نہ رہ جائے۔

### استیصال ظلم

اس کے علاوہ اسلام اگرچہ اس کو پسند کرتا ہے کہ مالک زمین اور مزارع، یا کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان خود باہمی رضا مندی سے معروف طریقے پر معاملات طے ہوں، اور قانون کی مداخلت کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن جہاں کہیں ان معاملات میں ظلم ہو رہا ہو وہاں اسلامی حکومت مداخلت کرنے کا پورا حق رکھتی ہے اور قانون کے ذریعہ سے انصاف کے حدود قائم کر سکتی ہے۔

### مصالح عامہ کے لئے قومی ملکیت کے حدود

اسلام اس امر کو حرام نہیں کرتا کہ کسی صنعت یا کسی تجارت کو حکومت اپنے انتظام میں چلانے۔ اگر کوئی صنعت یا تجارت الیکی ہو جس کی اجتماعی مصالح کے لئے ضرورت تو ہو مگر افراد اس کو چلانے کے لئے تیار نہ ہوں، یا افراد کے انتظام میں اس کا چنان اجتماعی مفاد کے خلاف ہو تو اسے حکومت کے انتظام میں چلا یا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صنعت یا تجارت کچھ افراد کے ہاتھوں میں ایسے طریقوں سے چل رہی ہو جو اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہو تو حکومت ان افراد کو معاوضہ دے کر وہ کاروبار اپنے ہاتھوں میں لے سکتی ہے اور کسی دوسرے مناسب طریقے سے اس کے چلانے کا انتظام کر سکتی ہے۔ ان مذاہیر کے اختیار کرنے میں کوئی مانع شرعی نہیں

ہے۔ لیکن اسلام اس بات کو ایک اصول کی جیشیت سے قبول نہیں کر سکے دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کی ملک میں ہوں اور حکومت ہی ملک کی واحد صنایع و تاجر اور مالک اراضی ہو۔

### بیت المال میں تصرف کے شرائط

بیت المال کے بارے میں اسلام کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ اللہ اور مسلمانوں کا مال ہے اور کسی شخص کو اس پر مالکانہ تصرف کا حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تمام امور کی طرح بیت المال کا انتظام بھی قوم یا اس کے آزاد نمائندوں کے مشورے سے ہونا چاہئے۔ جس شخص سے بھی کچھ لیا جائے، اور جس معرف میں بھی مال صرف کیا جائے وہ جائز شرعی طریقے پر ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو اس پر محاسبے کا پورا حق ہے۔

### ایک سوال

اس کلام کو ختم کرتے ہوئے میں ہر سوچنے والے انسان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر عدالت اجتماعیہ صرف معاشری عدل ہی کا نام ہے تو کیا یہ معاشری عدل جو اسلام قائم کرتا ہے، ہمارے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد کوئی ضرورت الکی باقی رہ جاتی ہے جس کی خاطر تمام افراد کی آزادیاں سلب کرنا، لوگوں کے اموال خبط کرنا، اور ایک پوری قوم کو چند آدمیوں کا غلام بنا دینا ہی ناگزیر ہو؟ آخر اس میں کیا چیز مانع ہے کہ ہم مسلمان اپنے ملکوں میں اسلامی دستور کے مطابق خالص شرعی حکومتیں قائم کریں اور ان میں خدا کی پوری شریعت کو بلا کم و کاست نافذ کر دیں۔ جس روز بھی ہم ایسا کریں گے، صرف یہی نہیں کہ ہمیں اشتراکیت سے کب فیض کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی بلکہ خود اشتراکیت زدہ ممالک کے لوگ ہمارے نظام زندگی کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ جس روشنی کے بغیر وہ تاریخی میں بجھ کر رہے تھے وہ ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

## اسلامی ریاست کے رہنماء صول (قرآن کی روشنی میں)

- حکومت کا مقصد
- اسلامی حکومت کا مزاج
- شورائیت
- عدل و احسان
- قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول
- دفاع اور اصول جنگ و صلح
- معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی پالیسی کے عمومی اصول
- شریعت اور خارجہ پالیسی

اس حصہ کا آخری مضمون اسلامی ریاست کے رہنماء اصول ہے۔ یہ مضمون مولانا مودودی صاحب "کے ان حواشی سے مرتب کیا گیا ہے جو موصوف نے اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں پرورد قلم فرمائے ہیں، مولانا کی یہ تفسیر دور حاضر کے اسلامی لرزیچر کا شاہکار ہے۔ ہم حصہ اول میں اس تفسیر کے حواشی سے اسلام کے سیاسی تصورات کو پیش کر چکے ہیں اور اب اسلامی ریاست کے نظام کا اور اس کی پالیسی کے رہنماء اصول بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس میں اختصار محر جامعیت کے ساتھ دو اصول آگئے ہیں جن کی رہنمائی میں اسلامی ریاست اپنی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی پالیسی تھکیل کرے گی، ان میں سے ہر اصول اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو بہترین معاشرہ وجود میں آسکا ہے۔۔۔۔۔ اور یہی اسلام چاہتا ہے تاکہ اس زمین پر انسان اس طرح زندگی گزارے کہ یہاں بھی امن و چین قائم ہو اور آخرت کی زندگی میں بھی وہ سرخود ہو۔ آیات کا ترجمہ اور ان کی تشریح مولانا محترم کے قلم سے ہیں اور مرتب نے سلسلہ کلام کو جوڑنے کے لئے درمیان میں اپنی طرف سے حسب ضرورت چند جملوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب اپنے موضوع پر یہ مضمون ایک جامع چیز ہے اور اپنی موجودہ شکل میں پہلی بار زیور طباعت سے آرائستہ ہو رہا ہے۔

مرتب

## اسلامی ریاست کے رہنماء اصول

(۱)

### حکومت کا مقصد

قرآن کی نگاہ میں حکومت کا مقصد نیکی، انصاف اور قانون الہی کا قیام ہے۔

(الف) الذین ان مکنیم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتو الزکوة وامرُوا  
بالمعروف ونهوا عن المنكر طول اللہ عاقبۃ الامور (الجع - ۳۱)

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔۔۔ اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔۔۔“

یعنی اللہ کے مدھار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرمان روائی بخشی بجائے تو ان کا ذاتی کردار فقہ و فحور اور کبر و غور کی بجائے اقامت صلوٰۃ ہے ہو، ان کی دولت عیاشیوں اور نش پرستیوں کے بجائے اپنائے زکوٰے میں صرف ہو، ان کی حکومت نیکی کو دبانے کے بجائے اسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے، اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے

کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ اس ایک نظرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کار فرماوں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھتا چاہے تو اسی ایک نظرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس جیز کا نام ہے۔<sup>۱</sup>

اس امت کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لئے حق، خیر اور معروف کی داعی ہائی گئی ہے اور اسے انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کام کو انجام دیتا ہے۔

(ب) **وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أَهْلَهُ وَسْطًا لَّتَكُونُوا شَهِيدَ اُولَى النَّاسِ وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔** (آل بقرہ - ۱۳۳)

”اور اسی طرح تو ہم نے تمیں ایک ”امت وسط“ بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔“

یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے ”اسی طرح“ کا اشارہ دونوں طرف ہے، اللہ کی رہنمائی کی اس طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر پہنچے کہ امت وسط قرار دیئے گئے، اور تحويل قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے میں اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضافہ معزول کیا اور امت محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

”امت وسط“ کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجیح کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا اس سے مراد ایک ایسا

اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روشن پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہوا اور ناقص ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "امت وسط" اس لئے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔" تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا آکٹھا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ گھر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کامت پوری کی پوری پہنچا دی۔ اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھایا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے امانت ہو گا اور یہ شہادت رینی ہو گی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جمال فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا پار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لئے خدا تری، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندگی شہادت پئے، اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لئے زندہ شہادت بننا چاہئے حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور بر تاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا تری اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو

خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تمہی ہدایت جو تمہے رسولؐ کے ذریعے ہم تک پہنچی تھی تمہے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بت بڑی طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا لغزوہ ہاں ہمیں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فتنے اور فساد خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں ان سب کے لئے ائمہ شر اور شیاطین انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے؟۔

(ج) كنتم خير امته اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن  
المنكر وتومنون بالله۔ (آل عمران: ١١٠)

”اب دنیا میں تو بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ کے ستر ہویں رکوع میں بیان ہو چکا ہے نبی علی صلی اللہ علیہ وسلم کے تبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے نبی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لئے کہ اخلاق و عمل کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ ہن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامت عادلة کے لئے ضروری ہیں یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ اور اللہ وحدہ

لا شرک کو اعتقاداً" و عملاً اپنا اللہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہذا اب یہ کام تمہارے پردا  
کیا گیا ہے اور تمہیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور غلطیوں سے بچو جو  
تمہارے پیش رکھے ہیں۔<sup>۱</sup>

(د) لعنَ الظِّينَ كَفَرُوا مِنْ مُنْبِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسانِ دَاوُعِيْسَى ابْنِ مُرِيمٍ  
ذَالِكَ بِمَا عَصُوا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ○ كَانُوا لَا يَتَنَا هُونَ عَنْ مُنْكَرِ فَعْلَوْهُ  
لِبِئْسٍ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (المائدہ - ۷۸، ۷۹)

"منی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر  
دواو اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے  
تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال  
کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بر اطرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار  
کیا۔"

ہر قوم کا بکار ابتداء" چند افراد سے شروع ہوتا ہے اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ  
ہوتا ہے تو رائے عام ان بھرے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیت  
مجموعی بھونے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملہ میں شامل شروع کر دیتی  
ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انسین سوسائٹی میں غلط کاری کے  
لئے آزاد چھوڑ دیتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی  
پوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ لیکن چیز تھی جو آخر کار منی اسرائیل کے بکار کا  
موجب ہوئی۔<sup>۲</sup>

(ه) وَجَاهَهُوا فِي سَبِيلِهِ لِعِلْكَمْ تَفْلِحُونَ (المائدہ - ۳۵)

"... اس کی راہ میں جدوجہد کرو، شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے۔"

<sup>۱</sup> تفسیر القرآن جلد اول صفحہ ۲۷۹۔

<sup>۲</sup> تفسیر القرآن جلد اول صفحہ ۲۹۶۔

اصل میں لفظ جاہد و استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم مخفی "جدوجہد" سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلہ کا مفہوم ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں، جو تم کو خدا کی مرضی پر چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمہیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام امکانی طاقتوں سے سعیش اور جدوجہد کرو۔ اسی جدوجہد پر تمہاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمہارے تقرب کا دار و مدار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندہ مومن کو ہر محاذ پر چوکھی لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف الپیس لمحیں اور اس کا شیطانی لشکر ہے، دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں، تیری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدنی اور معاشی تعلقات میں بندھا ہوا ہے، چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں، اور بندگی حق کے بجائے بندگی باطل پر انسان کو مجبور کرتے ہیں، ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطبع بنا میں بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا اور تقرب خداوندی کے مقام تک اس کے عروج کا انحراف بالکلیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطبع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالت "اس کا بندہ بن جائے۔ لہذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزمہ ہو، ہر وقت، ہر حال میں ان سے سعیش کرتا رہے اور ان ساری رکاوٹوں کو پاماں کرتا ہو اخدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔"

(۲)

## اسلامی حکومت کا مزاج

اسلامی حکومت کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ حکومت اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور دنیا کی باقی تمام اقوام کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے۔ اس حکومت کی حیثیت ایک مبلغ اور مضم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، مشاورت، رحم اور ہمدردی کی بنیاد پر انجام پاتا ہے اور یہی اس کا مخصوص مزاج ہے۔

(الف) وَلَوْ شاء اللَّهُ مَا شرِكُوا طَوْ ما جعلناك عَلَيْهِمْ حَفِظًا طَوْ ما انت  
عَلَيْهِمْ بُوكَيلٌ وَلَا تسبُوا الَّذِينَ يَدعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيُسَبِّوا اللَّهَ عَدُوًا  
بِغَيرِ عِلْمٍ طَ (الانعام: ۱۰۷ - ۱۰۸)

”اوہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ وار ہو اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جمالت کی ہماء پر اللہ کو گالیاں دیجئے لگیں۔“

مطلوب یہ ہے کہ تمہیں داعی مبلغ بنایا گیا ہے، کو تو اس نہیں بنایا گیا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرو اور اظہار حق کا حق ادا

کرنے میں اپنی حد تک کوئی سر نہ اٹھا رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کونہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری وجواب دیتی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقوہ نہوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہذا اس گھر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ انہوں کو کس طرح بنا بنا لیا جائے اور جو آنکھیں کھوں کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمت الٰہی کا تقاضا ہی ہو تو اسکے دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی سخوبتی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا۔ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی زوشی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لئے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھاوی گئی ہے اس کے اجائے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس طرف دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو جس انعام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر صریہ اس کی طرف جانے کے لئے انہیں چھوڑ دو۔

یہ فتحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو دی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ منافرے اور بحث و بکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور میعبدوں کو گالیاں دینے تک کی توبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب

لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔<sup>۱</sup>

(ب) فبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَفَتَاهُمْ وَلَوْكَنْتُ فَظًا" غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نَفْضُوا  
مِنْ سُؤْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَّمْتَ  
فَتَوَكِّلْ عَلَى اللَّهِ طَانِ اللَّهِ يَحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ۔ (آل عمران: ۱۵۹)

(اے غیربر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے  
بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خواور سمجھ دل  
ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے تصور  
معاف کردو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان  
کو بھی شریک مشورہ رکھو، البتہ جب تمہارا عزم کسی رائے پر مسحکم ہو  
جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر  
کام کرتے ہیں۔

(ج) وَلَا تَجَادُ لَوْا أَهْلَ الْكِتَابَ إِلَّا بِاللَّتِي هِيَ أَحْسَنُ قِيلَةً إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا  
مِنْهُمْ (الْعَنكُوبَةُ: ۳۶)

”اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمرہ طریقہ سے ----  
سوائے ان لوگوں کے جو ان میں نے ظالم ہوں۔“

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و  
تفہیم کی اپرٹ میں ہونا چاہئے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے  
خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ وہ مخالف کے دل  
کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتاردے اور اسے راہ راست پر لائے اس کو  
ایک پلوان کی طرح نہیں لٹنا چاہئے جس کا مقصد اپنے مر مقابل کو نجاو کھانا ہوتا ہے  
 بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہئے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے

ہر وقت یہ بات محو ڈر کھاتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھنے جائے اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفا باب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے مگر یہ اہل کتاب کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے مثلاً:-

”وَعُوتْ رَوْ اپْنِي رَبْ کَے رَاستَے کَی طَرفِ حَكْمَت اَوْ عَزَّهٖ پَندَوْ  
نَصَّاحَ کَے ساتھ اَوْ لَوْگُوں سے مَباشَه کرو ایسے طریقے پر جو بَتْرَن ہو۔“  
(النحل - ۱۷۵)

”بَحْلَائِی اَوْ بَرَائِی کیساں نہیں ہیں (خالقین کے حلول کی) بِدَافَعَت  
ایسے طریقے سے کرو جو بَتْرَن ہو تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور  
تمہارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کرم جوش دوست  
ہے۔“ (حمد سجدہ - ۳۲)

”تَمْ بَدِی کو اچھے عی طریقہ سے دفع رُو کیں معلوم ہے جو باقی  
وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔“ (المؤمنون - ۹۶)

”وَرَكْزَر کی روشن اختیار کرو، بَحْلَائِی کی تَلْقِین کرو اور جاہلوں کے  
منہ نہ لوگ اور اگر (ترکی بہتر کی وجہ پر جواب دینے کے لئے) شیطان تمہیں  
اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔“ (الاعراف - ۱۴۹ - ۲۰۰)

یعنی جو لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے  
خلاف سے مختلف رویہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں  
اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلے میں زرم دشیریں ہی نہ بننے رہنا چاہئے کہ دنیا  
و داعی حق کی شرافت کو کمزوری اور سکفت سمجھ بیشے۔ اسلام اپنے ہیروؤں کو  
شانشی، شرافت اور محتولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر غاہی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ

وہ ہر ظالم کے لئے نرم چارہ بن کر رہیں۔

(د) ان فرعون علایق الارض و جعل اہلہ شیعہ۔

(القصص - ۲)

”واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے پاشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔“

یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیئے جائیں، بلکہ اس نے تمدن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمران گروہ شہیر ایا جائے اور کسی کو محروم بنا کر دیا اور پیسا اور لوٹا جائے۔

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و امتیازات ہر جیشیت سے یکساں نہیں رکھتی یہ شبہ اس لئے غلط ہے کہ اس فرق و امتیاز کی بنیاد فرعونی تفریق کے بر عکس نہ، رنگ، زبان، یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں ”قطعاً“ کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمران جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حاصل ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا مسکر ہو جائے پر آخر اس تفریق میں اور اس فرعونی طرز تفریق میں کیا وجہ مشابہت ہے جس کی بنا پر محروم گروہ کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ

میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس میں محکوم گروہ کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکار بیشادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے، حتیٰ کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ جس میں محکوموں کے لئے کسی حق کی بھی کوئی حفاظت نہیں ہوتی، تمام فوائد و منافع اور حفاظت و درجات صرف حکمران قوم کے لئے حصہ ہوتے ہیں، اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمران قوم میں پیدا ہو جائے۔<sup>۱</sup>

(۴) يَا إِيَّاهَا النَّلْسَ ابْقِوا رَبِّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَ مِنْهَا مَارِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔

(النساء: ۱)

”لوگو! اپنے رب سے ڈر جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔“

چونکہ آگے ہل کر انسانوں کے باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی نظام کی بھرپوری و استواری کے لئے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں، اس لئے تمہید اس طرح اٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تائید کی اور دوسری طرف یہ بات ذہن لشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشہ پوست ہیں۔

”تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔“ یعنی نوع انسانی کی تخلیق ابتداء ایک فرد سے کی دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسل انسانی پھیلی۔

”اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔“ اس کی تفصیل کیفیت ہمارے علم

میں نہیں ہے یا مطور پر جو بات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بالیل میں بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی پلی سے حوا کو پیدا کیا گیا لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔<sup>۱</sup>

(و) لا اکراہ فی الدین۔ (البقرہ: ۲۵۶)

”دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔“

یہاں دین سے مراد اللہ کے متعلق وہ عقیدہ ہے جو اور پر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے اور وہ پورا نظام زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”اسلام“ کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں نہونسا جا سکتا۔ یہ ایسی چیزی نہیں ہے جو کسی کے سر جبراً منڈی جائے۔<sup>۲</sup>

اوپر کی آیات اور ان کی تشریع ہے اسلامی حکومت کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد ریاست ہے جو قوت قاہرہ کو بھی ہدردی، رحم اور مودت کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ جب جس کا مزاج نہیں۔ تشدد جس کے نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہی وہ ریاست ہے جو انسانیت کیلئے رحمت بنتی ہے۔ شورائیت بھی اس کے اس مخصوص مزاج ہی کا ایک تقاضا ہے۔

۱۔ تفسیر القرآن جلد اول صفحات ۳۱۹ - ۳۲۰۔

۲۔ تفسیر القرآن جلد اول - صفحہ ۱۹۶۔

(۳)

## شورائیت

ارشاد رباني ہے:-

وامرهم شورئ بیشم۔ (الشورائی - ۳۸)

”اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔“

اس چیز کو یہاں اہل امانت کی بہترن صفات میں شمار کیا گیا ہے اور سورہ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کبوب دی گئی ہے؟ اس کے وجہ پر اگر خور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد ادمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کروانا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے۔ اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتبر علیہ نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مالی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لئے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے یا بھروس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو خیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں۔ اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شاید بھی نہیں پایا جاسکا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے اور نہ وہ مکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقل کل اور علیم دخیر سمجھے۔

تمیرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور معاوے سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی کبھی اس بھاری بوجھ کو تھا اپنے سر لینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جرات میں صرف دی دی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے نگر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پر اس کا احسان رکھنے والا آدمی "تلذما" یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو، ان سب کو، یا ان کے اپنے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شرک مشورہ کرنے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لائگ اور بینی بر انصاف فیصلہ کیا جاسکے، اور اگر بادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تھا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آپڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آئتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بد اخلاقی ہے، جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں بر تما جائے۔ مگر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی بابیم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی

شریک مشورہ کیا جائے، خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کبھی کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے، ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ممکن نہ ہو تو ان کا فیصلہ کوئی الیک پنچاہت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کو چلاسے کے لئے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلاسے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایمان دار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بننے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزرگ قوم پر مسلط ہو جائے اور پھر جرکے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لئے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ الیک ہر خواہش صرف اس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے ملوث ہو اور اس خواہش کے ساتھ امرهم شوف بینہم کی ظاہری حل بنائے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور علقم دونوں کو دھوکہ دینے میں کوئی باک نہ ہو حالانکہ نہ خدادھوکہ کھا سکتا ہے اور نہ ہی علقم اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علائیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔ امرهم شوف بینہم کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفادات سے تعلق رکھنے ہیں انسان اطمینان رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح

پا خبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلانے جا رہے ہیں اور اُنہیں امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتایی دیکھیں تو اس پر نوک سمجھیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کارروں کو بدل سمجھیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح ہے ایمانی ہے جسے کوئی شخص بھی امرِ ہم شوں یہ نہ کے اصول کی ہیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبراور تخفیف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص و ابلیح سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور عکارپوں سے کھوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا صربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لئے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معمون میں حقیقی اعتماد کے حوال قرار نہیں دیجے جاسکتے جو دباؤ دال کر، یا مال سے غریب کر، یا جھوٹ یا سکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نماہنگی کام مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں اور اس طرح کے انہمار رائے کی اُنہیں پوزی آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لائج یا خوف کی ہٹاپڑا کسی جتہرہ بندی میں کے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہو گی نہ کہ امرِ ہم شوں یہ نہ کی ہیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے ریا جائے یا جسے

ان کے جمودر (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اسے تسلیم کیا جائے کیون کہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی ختنے کے بعد اپنی من مانی کا عقایر ہو تو مشاورت بالکل بے صحت ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرم رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرم رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے شورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی قصیلِ محض مشورہ لئے لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصول شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کی حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے۔ اور اس اصل الاصور کی پابندی ہے کہ "تمارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔" اور تمارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔" اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کا صحیح بنتووم کیا ہے اور اس پر غسل درآمد کس طریقے سے کیا جائے تاکہ اس کا خشائیک طور سے پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلے کر سیں۔

(۳)

## عدل و احسان

لَنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَا عَنِ الْفَحْشَاءِ  
وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ۔ (النحل - ۹۰))

الله عدل اور احسان اور صلح رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے  
حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔“

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی  
معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل جیتوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ  
لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور نسبت قائم ہو دوسرے یہ کہ ہر ایک کو  
اس کا حق بے لائی طریقے سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ  
”الاعاد“ سے ادا کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس سے خواہ  
خواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی  
نیاد پڑھو اور پھر اسی سے عدل نکے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لئے گئے ہیں  
جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن  
اور نسبت ہے نہ کہ برابری۔ بعض جیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں  
مساویات چاہتا ہے مثلاً حقوق شریعت میں مگر بعض دوسری جیتوں سے مساوات  
بالکل خلاف عدل ہے مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی  
مساویات اور اعلیٰ درجے کی خدمات انعام رجھے والوں اور کم تر درجے کی خدمات

ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم  
دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تفاسیر  
ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق  
پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ  
رویہ، رواداری، خوش طقی، درگزر، ہاہی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ،  
دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو  
جانا، یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی  
زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال  
ہے، عدل اگر معاشرے کو ٹاگواریوں اور تلیقوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں  
خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کفرناہیں  
رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا حق کیا ہے اور  
اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے  
دے۔ ایسے ایک شخص ہے اور کہرے معاشرے میں کنکش تو نہ ہو گی، مگر محبت اور  
شکر مگزا ری اور عالی عمری اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم  
رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشو  
نمادینے والی قدریں ہیں۔

تیسرا چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے مذکور تھی ہے جو رشتہ داروں  
کے مقابلے میں احسان کی ایک خاص صورت معین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف  
یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و عنی  
میں ان کا شریک حال ہو، اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنتے، بلکہ اس  
کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور  
اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم

کرے۔ شریعتِ الٰی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دینی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا شکار چھوڑیں اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اسی ہے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص بھیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بد روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عصر ترکیبی قرار دینی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی نصیلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار انس کے والدین، اس کے بھوی بیچے اور اس کے بھائی بیٹیں ہیں، پھر وہ جوان کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جوان کے بعد قریب تر ہوں، اور یہی لصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حجتیم بیچ کے چھاڑا بھائیوں کو مجوز کیا کہ وہ اس کی پزورش کے نمہ دار ہوں۔ اور ایک دوسرے حجتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعد ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پزورش لازم کر دیتا۔۔۔۔۔ اندازوں کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (Unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشری حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت، اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔ اور کی تین بھائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین بھائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز نہاد ہے جس کا املاق تمام ہے ہوئے اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے

ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت فجع ہو، بخش ہے۔ مثلاً بجل، زنا، برہنگی و عربانی، عمل قوم لوٹ، محمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، کالیاں بکنا اور بد کلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی بخش ہے، مثلاً جھونٹا پروپیگنڈا، تھت تراشی، پوشیدہ جرامم کی تشیز، بد کاریوں پر ابھارنے والے افغانی و ذرا مے، اور قلم، عربان تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسنج پر عورتوں کا چڑنا اور تحرکنا اور نازو او اکی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز مگر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برائجاتے ہیں یہی سے برائکتے رہے ہیں، اور تمام شرائع ایسے نے جس سے منع کیا ہے۔ تیری چیز بخی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔ ا-

(۵)

## قیادت اور اہل منصب کے انتخاب کے اصول

اسلامی حکومت میں قیادت کے انتخاب کا اصول بھی دوسری حکومتوں سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اصل چیز الہیت، امانت، دیانت، تقویٰ اور حسن سلوک ہے۔

(الف) انَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوا الْأَمْمَاتَ إِلَى أَهْلِهَا لَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعُدْلِ إِنَّ اللَّهَ نَعَمَا يَعَظِّمُ كُمْ بِهِ مَا تَفْعَلُونَ  
سمیعاً بصیراً ۝ (النساء: ۵۸)

”مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے پرداز کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تم کو نہایت عمرہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً ”اللہ سب کچھ سنا اور زیکر ہے۔“ یعنی تم ان برائیوں نے پچے رہنا جن میں میں اسرائیل جلا ہو گئے ہیں۔ میں اسرائیل کی بیادی خلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قوی سرداری کے رہتے (Positions of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیئے جو نااہل، کم عرف، بد اخلاق، بد دیانت، اور بد کار تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو بہادریت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے پرداز کرو جو ان کے اہل ہوں۔ یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ میں اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ

العاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے وہ مخفی اور قوی اغراض کے لئے بے حکم ایمان نہیں جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھری برداشت جاتے تھے۔ العاف کے لئے پرچھری پھیرنے میں انسس ذرا تماں نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجربہ اس زبانہ میں خود مسلمانوں کو ہوا رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے عورتیں بیویوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں قصیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پونج رہے تھے۔ بیٹیوں کو زندہ گاؤتے تھے، سوچلی ماوں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد مادرزاد بیٹھے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام فہاد اہل کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنیبہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ مبن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کبو، العاف کی کبو، اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔<sup>۱</sup>

(ب) وَلَا تطْبِعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا

يَصْلِحُونَ (الشوراء: ۱۵۱ - ۱۵۲)

”ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پر پا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔“

یعنی اپنے ان امراء و رؤسا اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظام زندگی چل رہا ہے، یہ صرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں چھاند کر شر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلا گئی گے اس میں بگاڑی پھیلے گا۔ تمہارے لے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور

(ج) ولا تطع من أغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هونه وكأن أمره  
فقطاً۔ (الكعب: ٢٨)

”کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی چیزوں کی اختیار کرنی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر منی ہے۔“

یعنی اس کی بات نہ مانو، اس کے آگے نہ جھکو، اس کا فشائے پورا نہ کرو، اور اس کے پر نہ چلو۔ یہاں اطاعت کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔  
کان امرہ فوٹا کا ایک مطلب تودہ ہے جو ہم نے ترجیحے میں اختیار کیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”جو حق کو یکجھے چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑ کر بگٹھ پلٹنے والا ہے۔“ دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اس کے ہر کام میں بے احترامی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حدود نا آشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مطاعع بیکے اسی میں مطیع بھی بھکتا چلا جائے۔

اب تضییم القرآن جلد سوم - صفحہ ۵۲۳

٢٣- تفسیر القرآن جلد سوم - صفحہ ۲۳

(۶)

## دفع اور اصول جنگ و صلح

اسلامی حکومت کی پالیسی کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ وہ ہر اعتبار سے مضبوط ہو۔ عسکری اعتبار سے بھی اور معاشری اعتبار سے بھی۔ جو عظیم ذمہ داری اسے ادا کرنی ہے وہ دفاعی قوت کی تیاری کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی۔

(الف) وَاعْدُوا لِهِمْ مَا أَسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ  
عَدُوُ اللَّهِ وَعُدُوُكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمْ جَنَاحُ اللَّهِ يَعْلَمُهُمْ ط

(الانفال: ۶۰)

”اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے محوڑے ان کے مقابلہ کے لیے میا رکھو۔ تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔“

اس سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامان جنگ اور ایک مستقل فوج جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گمراہی میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ اور سامان رصد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثناء میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔<sup>۱</sup>

(ب) انما جزءاً الَّذِينَ يَحْارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيُسْعَونَ فِي الْأَرْضِ  
فَسَادٌ أُنْ يَقْتَلُوا أَوْ يُصْلَبُوا أَوْ تُقطعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُدُهُمْ مِنْ خَلْفٍ أَوْ يُنْفَوْا  
مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكُمْ خَرْجٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

(الحاکمه: ۳۳)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس  
لئے جنگ و دو کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے  
جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سوتون سے  
کٹ دیئے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں یہ ذلت و رسوائی تو ان کے  
لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔“

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے  
کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لونے کا  
مطلوب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں  
قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی لئے اس نے اپنا رسول بھیجا تھا  
کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر  
اس جیز کو جو زمین پر ہے امن بخشدے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمال  
مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ  
وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں گے کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب  
کسی سر زمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس سے  
کہ وہ چھوٹے پیانے پر قتل و غارت اور رہنمی و ذکریت کی حد تک ہو یا بڑے پیانے  
پر اس صالح نظام کو اٹھنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لئے ہو،  
در اصل خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تحریرات  
ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ اٹھنے کی کوشش کرے  
”بار شاہ کے خلاف لڑائی“ (Waging War Against The King) کا

مجرم قرار دیا گیا، چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دست رس سے کتنا ہی دور ہو۔ اس آئیت میں مختلف سزا میں بر سبیل اجھاں بیان کردی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اللئے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاوں میں سے کوئی سزادی جاسکتی ہے۔<sup>۱</sup>

(ج) قاتلوا الذین لا یؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا یحرمون  
ما حرم الله ورسوله ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الكتاب حُشِّ  
یعطوا الجزية عن يدهم صغارون۔

(التوبہ: ۲۹)

”جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول<sup>ؐ</sup> نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے“ اور دین حق کو اپناؤں نہیں بنتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔“

یہاں ان لوگوں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے جو اس شریعت کو اپنا قانون زندگی نہیں بنتے جو اللہ نے اپنے رسول<sup>ؐ</sup> کے ذریعے سے نازل کی ہے۔ لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیروں بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود بھاری اور بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کرنہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور

فرماں روائی اور امامت کے اختیارات تین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ہاتھ، تالع و مطیع بن کر رہیں۔

جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تالع امر پنچ پر راضی ہیں ”ہاتھ سے جزیہ دینے“ کا مفہوم سید ہجی طرح مبلغانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں، بلکہ وہ اہل ایمان بڑے ہوں جو خلافت الہی کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

ابتداً یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق دیا گیا تھا لیکن آگے چل کر خود نبی ملکہ نے بھوس سے جزیہ لئے کر انہیں ذمی بنایا۔ اس کے بعد صحابہ کرام نے پالاتفاق پر دون عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔

یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لئے بڑی بڑی مخذلہ تین انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور اس دور کی یادگار کچھ لوگ اپ بھی موجود ہیں جو صفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا کا دین اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے مخذلہ پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔ سید ہجی اور صاف پات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یاد و سروں کی نکالی ہوئی غاط راہ پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انہیں اس کا قطعاً ”کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرماں روائی کی بائیکیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی، فیاد رونما ہو گا اور اہل ایمان کا فرض ہو گا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔ اب رہایہ سوال کہ یہ جزیہ آخر کس چیز کی قیمت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو انہیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لئے دینی پڑتی ہے اور اس قیمت کو

اس صالح نقام حکومت کے ل Clem و نق پر صرف ہونا چاہئے جو انہیں اس آزادی کے استھان کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا برواقا کردہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کرتے وقت ہر سال ذمیوں میں یہ احساس تازہ ہوتا رہے گا کہ خدا کی راہ میں زکوٰۃ دینے کے شرف سے محروم اور اس کے بجائے مگر انہیوں پر قائم رہنے کی قیمت ادا کرنا کتنی بڑی بد صحی ہے جس میں وہ جلا ہیں۔<sup>۱</sup>

(د) الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ إِنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ جَفَاعِلْمُوا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

رحیم۔ (المائدہ: ۳۳)

مگر جو لوگ توبہ کر لیں تبلیغ اس کے کہ تم ان پر تابو پاؤ۔۔۔۔۔  
تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔<sup>۲</sup>

یعنی اگر وہ سعی فساد سے باز آگئے ہوں اور صالح نقام کو درہم برہم کرنے یا اللہ کی کوشش چھوڑ دیکھے ہوں اور ان کا بعد کا طرز عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند مطیع قانون اور نیک چلن انسان بن دیکھے ہیں اور اس کے بعد ان کے سابق جرائم کا پتہ چلتے تو ان سزاویں میں سے کوئی سزا ان کو نہ دی جائے گی جو اپر بیان ہوئی ہیں البتہ آدمیوں کے حقوق پر کوئی دست درازی اگر انہوں نے کی تھی تو اس کی زمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی مثلاً اگر کسی انسان کو انہوں نے قتل کیا تھا یا کسی کا مال لیا تھا یا کوئی اور جرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا تو اسی جرم کے بارے میں فوج داری مقدمہ ان پر قائم کیا جائے گا لیکن بغاوت اور غداری اور خدا اور رسول<sup>ﷺ</sup> کے خلاف محاربہ کا کوئی مقدمہ نہ چلا یا جائے گا۔<sup>۳</sup>

۱۔ تفسیر القرآن جلد دو نعم۔ صفحہ ۱۸۸۔

۲۔ تفسیر القرآن جلد اول۔ صفحہ ۳۶۶۔

(۷)

## معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی پالیسی کے عمومی اصول

(الف) وَقُضِيَ رَبُّكَ إِلَّا تَعْبُدُ وَإِلَّا أَيَاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ أَحْسَانًا١ ط اما يَبْلُغُنْ عَنْكَ الْكَبَرُ احْدَهُمَا أَوْ كُلُّهُمَا فَلَا لِقَلْ لَهُمَا فَوْلَادٌ وَلَا تَنْهَرُهُمْ وَقُلْ لَهُمَا قُولًا٢ كَرِيمًا٢ وَأَخْفُضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبُّ أَرْحَمَهُمَا كَمَا رَبِّيَّشَ صَفِيرًا٣ ○ رَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي لِفْوَسِكُمْ ط انْ تَكُونُوا صَلَحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَابِينَ غَفُورًا٤ ○ وَاتَّذَاقُ الْقَرِيبَيْنَ حَقَّهُ وَالْمُسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا٤ انَّ الْمُعْذَرِيْنَ كَانُوا اخْوَانَ الشَّيْطَانِ ط وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا٤ ○ وَإِنَّمَا تَعْرَضُنَّ عَنْهُمْ أَبْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَهُمْ قُولًا٤ مِيسُورًا٤ ○ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَفْلُولَةً إِلَى عَنْقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدْ مَلُومًا٤ مَحْسُورًا٤ ○ انَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ط انَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا٤ مَبْصِيرًا٤ ○ وَلَا تَقْتُلُوا الْوَلَادَ كَمْ خَشِيَّةً امْلَاقَ ط نَحْنُ نُرْزُتُهُمْ وَإِيَاكُمْ ط انْ قَتْلُهُمْ كَانَ خَطَاً٥ كَبِيرًا٥ ○ وَلَا تَقْرِبُوا الزَّئْنَ انَّهُ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَاءَ سَبِيلًا٥ ○ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ط وَمَنْ قَتَلَ مُظْلُومًا٥ فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلَيْهِ سَلْطَنًا٥ فَلَا يُسْرِفْ فِي قَتْلِ ط انَّهُ كَانَ مُنْصُورًا٥ ○ وَلَا تَقْرِبُوا مَالَ الْيَتَيمِ إِلَّا بِالْقِنْقِنَى٦ اهْسَنْ حَتَّى٦ يَبْلُغَ اشْدُهُ ○ أَوْفُوا بِالْعَهْدِ جَ انَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسُؤُلًا٦ ○ وَأَوْفُوا الْكِيلَ اذَا كَلْتُمْ وَرَزَنَوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ط ذَلِكَ خَيْرٌ وَاحْسَنْ تَأْوِيلًا

○ ولا تتف مالیس لک بہ علم طان السمع البصر والغواکل اولنک کان  
عنه مسؤلاً ○ ولا تمیش فی الارض مرحأ ج انک لین تخرق الارض ولن  
تبلغ الجبال طولاً کل ذالک کان سینه عند ربک مکروهاً ○ ذالک معا  
او حن الیک ربک من الحکمة ط

(بی اسرائیل: ۳۹-۴۳)

”تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ : (۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ  
کرو، مگر صرف اس کی۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر  
تمارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو زکر رہیں تو  
انہیں اف بک نہ کو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام  
کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جمک کر رہو،  
اور دعا کرو کہ ”پروزدگار“ ان پر رحم فرماجس طرح انہوں نے رحمت خود  
شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ ”تمارا رب خوب جانتا ہے کہ  
تمارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں  
کے لیے در گزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر مقابہ ہو کر بندگی کے  
رویے کی طرف پلت آئیں۔ (۳) رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین  
اور مسافر کو اس کا حق (۴) فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ  
شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ (۵) اگر ان  
سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں  
کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار  
ہو تلاش کر رہے ہو، تو انہیں نرم جواب دے دو (۶) نہ تو اپنا ہاتھ گردن  
سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ طامت زدہ اور عاجز  
بن کر رہ جاؤ۔ تمرا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس  
کے لیے چاہتا ہے تجھ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے

اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ (۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندر بیٹھے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ (۸) زنا کے قریب نہ پھکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی براراستہ۔ (۹) قتل بنس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد بے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی (۱۰) مالِ جنہیں کے پاس نہ پھکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو ہجیج جائے۔ (۱۱) عمد کی پابندی کرو، بے شک عمد کے بارے میں تم کو جواب دی کرنی ہو گی۔ (۱۲) پیائے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تو لو تو نجیک ترازو سے تو لو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بمحاذ انجام بھی بھی بہتر ہے (۱۳) کسی الگی چیز کے پیچے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً "آنکھ، کان اور دل سب یہ کی باز پرس ہوتی ہے۔ (۱۴) زمین میں اکڑ کرنہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پھاڑوں کی بلندی کو ہجیج سکتے ہو۔ ان احکام میں سے ہر ایک لا برا پھلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجوہ پر وحی کی ہیں۔"

یہاں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے جا رہے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا منشور ہے جسے کمی دور کے خاتمے اور آئئے والے، مدنی دور کے نقطہ آغاز پیش کیا گیا، تاکہ دنیا بھر کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد کن گلری، اخلاقی، تحریکی، معاشی اور قانونی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس موقع پر سورہ انعام روایت ۱۹ اور اس کے حواشی پر بھی ایک لکھا ڈال لیتا مفید ہو گا۔

۱۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو، بلکہ یہ بھی ہے ٹھہر بندگی اور غلامی اور بے چون و چڑا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو، اس کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مافو اور اس کے سوا کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ، اور صرف انفرادی طرز عمل کے لئے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اس پرے نظام اخلاق و تمدن و سیاست کا سمجھ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیبہ پنج گرنی مصلی اللہ علیہ وسلم نے عملہ قائم کیا۔ اس کی عمارت اسی نظریے پر انجامی گئی تھی کہ اللہ جل شانہ، ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور اسی کی شریعت تک کا قانون ہے۔

۲۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطبع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہئے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جو اولاد کو والدین سے بے نیاز بنانے والا نہ ہو، بلکہ ان کا احسان مندا اور ان کے احترام کا پابند بنائے، اور بڑھاپے میں اسی طرح ان کی خدمت کرنا سکھائے جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش اور تازبرداری کرچکے ہیں۔ یہ آیت بھی صرف ایک اخلاقی سفارش نہیں ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر بعد میں والدین کے وہ شرعی حقوق و اختیارات مقرر کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آداب تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور ان کے حقوق کی گحمداشت کو ایک اہم غصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی، نہ کہ اسے کمزور بنانے کی۔

۳۔ ان تین دفعات کا منشاء یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لئے ہی مخصوص نہ رکھے، بلکہ اپنی ضروریات اعتدال کے ساتھ پوری

کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجت مند لوگوں کے حقوق بھی ادا مگر نہ۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری و ساری ہو۔ ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون، اور ہر مستحق انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے، اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو، ان کی خدمت کرے تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ ان کا حق ادا کر رہا ہے، نہ یہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لاد رہا ہے۔ اگر کسی کی خدمت سے محفوظ ہو تو اس سے معافی مانگے اور خدا سے فضل طلب کرے تاکہ وہ بندگان خدا کی خدمت کرنے کے قابل ہو۔

منشور اسلامی کی یہ دفعات بھی صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں، بلکہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کے معاشرے اور ریاست میں انسی کی بنیاد پر صدقات و اجرہ اور صدقات نافلہ کے احکام دیئے گئے، دصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے، قبیلوں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا، ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی روح جاری و ساری ہو گئی، حتیٰ کہ لوگ آپ ہی آپ قانونی حقوق کے مابوأ ان اخلاقی حقوق کو بھی سمجھنے اور ادا کرنے لگے جنہیں نہ قانون کے زور سے مانگا جا سکتا ہے، نہ دلوایا جا سکتا ہے۔

۶۔ ہاتھ باندھنا استعارہ ہے بھل کے لئے، اور اسے کھلا چھوڑ دینے سے مراد ہے فضول خرچی۔ دفعہ ۲ کے ساتھ دفعہ ۶ کے اس فقرے کو ملا کر پڑھنے سے نشا صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ بخیل ہن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع

کریں۔ اس کے برعکس ان کے اندر توازن کی الگی صحیح جس موجود ہوئی چاہیے کہ وہ بجا خرج سے باز بھی نہ رہیں اور بے جا خرج کی خرایوں میں چلا بھی نہ ہو۔ فخر اور ریا اور نمائش کے خرج، عیاشی اور فتن و فنور کے خرج، اور تمام ایسے خرج جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بھاریں، دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرج کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

یہ دفاتر بھی محض اخلاقی تعلیم اور انفرادی ہدایات تک محدود نہیں ہیں بلکہ صاف اشارہ اس بات کی طرف کر رہی ہیں کہ ایک صالح معاشرے کو اخلاقی تربیت، اجتماعی دیاً اور قانونی پابندیوں کے ذریعے سے بے جا صرف مال کی روک تحام کرنی چاہیے۔ چنانچہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کی ریاست میں ان دونوں دفاتر کے مٹاکی صحیح ترجمانی مختلف عملی طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو از روئے قانون حرام کیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بے جا صرف مال کی روک تحام کی گئی۔ تیسرا طرف معاشرتی اصلاح کے ذریعہ سے ان بہت سی رسوم کا خاتمه کیا گیا۔ جن میں فضول خرچیاں کی جاتی تھیں۔ پھر حکومت کو یہ اختیارات دیئے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے۔ اسی طرح زکوٰۃ و صدقات کے احکام سے بھل کا زور بھی توڑا گیا اور اس امر کے امکانات باقی نہ رہنے دیئے گئے کہ لوگ ذرائدوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک الینی رائے عام پیدا کی گئی جو فیاضی اور فضول خرچی کا فرق ٹھیک ٹھیک جانتی تھی اور بھل اور اعتدال میں خوب تمیز کرتی تھی۔ اس رائے عامہ نے بخیلوں کو ذمیل کیا۔ اعتدال پندوں کو معزز بنایا، فضول خرچوں کو ملامت کی اور فیاض لوگوں کو پوری سوسائٹی کا محل سربد قرار دیا۔ اس وقت کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا یہ اثر آج تک مسلم معاشرے میں موجود ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں سنجوں اور

زدائد و زوں کو بڑی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور جنی انسان آج بھی ان کی نگاہ میں محروم ہیں۔

ای سلسلے میں یہ بات بھی سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کم و بیش کا جو فرق رکھا ہے انسان اس کی مصالحوں کو نہیں سمجھ سکتا، لہذا تفسیر رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے داخل انتہا از نہ ہونا چاہیے۔ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا، یا اس نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انسانی کی حد تک پہنچاؤ، دونوں ہی یکسان علاوہ ہیں۔ ایک صحیح معاشری نظام وہی ہے جو خواکے مقرر کیے ہوئے طریق تفسیر رزق سے قریب تر ہو۔

اس فقرے میں قانون فطرت کے جس قاعدے کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخيّل سرے سے کوئی راہ نہ پاسکا کہ رزق اور وسائل رزق میں تفاوت اور تفاضل بجاۓ خود کوئی برائی ہے جسے منٹا اور ایک بے طبقات سوسائٹی پیدا کرنا کسی ذریعے میں بھی مطلوب ہو۔ اس کے بر عکس مذپہ طیبہ میں انسانی تہذیب کو صالح بنيادوں پر قائم کرنے کے لئے جو راہ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرۃ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر برقرار رکھا جائے اور اوپر کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق و امور اور قوانین عمل کی اس طرح امتلاع کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انسانی کا موجب بننے کے بجاۓ ان بے شمار اخلاقی، روحانی اور تہذیب فوائد و برکات کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالق کا نکات لے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

— فقرہ نمبر ۷: ان معاشری بنيادوں کو قطبی مددم کر دیا ہے جن پر قدم زمانے سے آج تک مختلف اور اس میں ضبط و لاوت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلام کا خوف قدیم زمانے میں قتل اطفال اور استغاثہ حمل کا محرك ہوا کرتا تھا، اور آج وہ

اکی تحریری تدویر ہے جنی میں حمل کی طرف دنیا کو دھکیل سا ہے۔ لیکن منثور اصولی کی یہ دفعہ انسان کو بدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گذاں کی تحریک کو جس پھرود کران تحریری مسائی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن ہے اللہ کے ہنانے ہوئے قانون فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی روئے نے ہاتھ انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ ہمارا بار معاشری ذرائع کی بھی کے اندر یہ سے افزائش نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متقبہ کرتی ہے کہ رزق رسالی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ ان خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں پیدا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی رکتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی لکھتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے، اتنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشری ذرائع و سعی ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہذا خدا کے تحلیقی اختلافات میں انسان کی بے جا دھل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزول قرآن کے دور سے لے کر آج تک کسی دور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔

۸۔ ”زن کے قریب نہ پکلو۔“ اس حکم کے مخاطب افراد بھی ہیں، اور معاشرہ بھیثت مجموعی بھی۔ افراد کے لئے اس حکم کے معنی یہ ہیں کہ وہ محسِ فعل زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ زنا کے مقدمات اور اس کے ان ابتدائی حرکات سے بھی دور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رہا معاشرہ تو اس حکم کی روئے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا اور حرکات زنا، اور اسہاب زنا کا سد باب کرے اور اس غرض کے لئے قانون سے، تعلیم و تربیت سے، اجتماعی ماخول کی اصلاح سے، معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے اور دوسری تمام موثر تدابیر سے کام لے۔

یہ وضع آخر کار اسلامی نظام زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہی۔ اس کے مطابق زنا اور تہمت زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا، پر دے کے احکام جاری کیے گئے، فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا، شراب اور موسيقی اور رقص اور تصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بند شیں لگائی گئیں، اور ایک ایسا آزاد و اچی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہو گیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

۹۔ قتل نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں، بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔ اسی لیے کہ نفس، جس کو اللہ نے ذی حرمت ٹھیکرا یا ہے، اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔ لہذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتل انسان ہے، اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خود کشی بھی ہے۔ آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک، اور اپنی اس ملکیت کو با اختیار خود تکف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے، حالانکہ یہ جان اللہ کی ملکیت ہے، اور ہم اس کے اطلاف تو درکنار، اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان ہے، اسی طرح ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے، خواہ حالات امتحان اچھے ہوں یا بُرے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً "ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے، کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جرم عظیم کے ذریعہ سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسائیوں سے فتح کر عظیم تر اور ابدی تکلیف و رسائی کی طرف بھاگتا ہے۔

اسلامی قانون نے قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں محدود کر دیا ہے: ایک قتل عمد کے مجرم سے قصاص۔ دوسرے دین حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والے سے جنگ۔ تیسرا اسلامی نظام حکومت کو اللئے کی تسبی کرنے والوں کو سزا۔

چونتھے شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکاب زنا کی سزا۔ پانچویں ارتداوی کی سزا۔ صرف یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انبانی جان کی حرمت مرتفع ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

”اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطابق کا حق عطا کیا ہے۔“ اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول لکھا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعا حکومت نہیں۔ بلکہ اولیائے متقول ہیں، اور وہ قاتل کو معاف کرنے اور قصاص کے بجائے خون بھالینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔

قتل میں حد سے گزرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ سب ممنوع ہیں۔ مثلاً ”جو ش انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا“ یا مجرم کو عذاب دے دے کے مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالنا، یا خون بھالینے کے بعد پھر اسے قتل کرنا وغیرہ۔

چونکہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اس لیے اس بات کو نہیں کھولا گیا کہ اس کی مدد کون کرے گا۔ بعد میں جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو یہ طے کر دیا گیا کہ اس کی مدد کرنا اور اس کے قبیلے یا اس کے طیفون کا کام نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اس کے نظام عدالت کا کام ہے۔ کوئی شخص یا گروہ بطور خود قتل کا انتقام لینے کا مجاز نہیں ہے بلکہ یہ منصب اسلامی حکومت کا ہے کہ حصول انصاف کے لیے اس نے مدد مانگی جائے۔

۱۰۔ یہ بھی شخص ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی بلکہ آگے چل کر جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو ہتا کی کے حقوق کی حفاظت کے لیے انتظامی اور قانونی، دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ اسلامی ریاست اپنے ان تمام شروں کے مفاد کی حفاظت ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انا ولی من لا ولی له (میں ہر اس شخص کا سرپرست ہوں جس

کا کوئی سرست نہ ہو) اسی طرف اشارہ کرتا ہے، اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

۱۰۔ یہ بھی صرف انفرادی اخلاقیات ہی کی ایک دفعہ نہ تھی بلکہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اسی کو پوری قوم کی داخلی و خارجی سیاست کا سچ بنا کر بنیاد تھیں۔

۱۱۔ یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی، بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور چیزوں کی نگرانی کرے اور لفیعت کو بزور بند کر دے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیزوں کا سد بابت کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

۱۲۔ اس دفعہ کا فشار یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کے بجائے "علم" کی پیدا کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس فشار کی ترجیحی وسیع پیارے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظام ملکی میں، علوم و فنون اور نظام تعلیم میں، غرض ہر شعبہ حیات میں کی گئی اور ان پے شمار خرایوں سے فکر و عمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیدا کرنے سے انسانی زندگی میں رو نہ ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بد گمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول طے کر دیا گیا کہ محض شبہ پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ بر تاؤ میں یہ پالیسی متعین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اور نہ مجرد شبہات پر انواعیں پھیلانی جائیں۔ نظام تعلیم میں بھی ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض غنی و تمیز اور لا طائل قیاسات پر مبنی

ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عطا پر میں اولام پرستی کی جڑ کا لشکری گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سمجھایا گیا کہ صرف اس چیز کو مانیں جو خدا اور رسول کے دینے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔

۱۲۔ اس نظرے میں ہدایت کی گئی کہ جباروں اور ہنگمیوں کی روشن سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرز عمل اور قوی روپیے، دنوں پر یکساں حاوی ہے۔ اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ ہندہ طیبہ میں جو حکومت اس مشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں، گورنروں اور پہ سالاروں کی زندگی میں جباری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ حتیٰ کہ عین حالت جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے غزوہ غور کی کوئی بات نہ تھی۔ ان کی نشت و برخاست، چال ڈھال، لباس، مکان، سواری اور عام برآمد میں اکھار و تواضع، بلکہ فتحی و درودی کی شان پائی جاتی تھی، اور جب وہ قلع کی حیثیت سے کسی شر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تختر سے کبھی اپنار عرب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

آخر میں ارشاد ہوا کہ ہر حکم میں جو چیز منوع ہے اس کا ارتکاب اللہ کو ناپسند ہے یاد سرے الفاظ میں، جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے۔

(ب) ریاست کی قلمبی پالیسی کے متعلق یہ ہدایت بھی قرآن رہتا ہے کہ:-

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لَيَنْفِرُوا كَلَافَةً طَفْلًا لَا نَفْرَمْ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ  
طَافِقَةً لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلَيَنْذَرُوا قَوْمَهُمْ لَذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لِعِلْمٍ  
يَعْذِرُونَ

(آل عمران: ۱۳۲)

”اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی کل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آپادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ کل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر

اپنے علائقے کے ہاشمیوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روشن سے) پرہیز کرے۔"

اس آہت کا فٹا سمجھنے کے لئے رکوع ۱۲ کی وہ آہت پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:-

"بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناقص رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔"

وہاں صرف اتنی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا کہ دارالاسلام کی دینماں آہادی کا بیشتر حصہ مرض نفاق میں اس وجہ سے جلا ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ جمالت میں پڑے ہوئے ہیں، علم کے مرکز سے وابستہ ہونے اور اہل علم کی صحبت میسر نہ آئے کی وجہ سے اللہ کے دین کی حدود ان کو معلوم نہیں ہیں۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دینماں آہاد پوں کو اس حالت میں پڑا نہ رہے دیا جائے بلکہ ان کی جمالت کو دور کرنے اور ان کے اندر شور اسلامی پیدا کرنے کا اب باقاعدہ انتظام ہونا چاہئے۔ اس غرض کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ تمام دینماں عرب اپنے اپنے گروں سے نکل نکل کر مدینے آ جائیں اور یہاں علم حاصل کریں۔ اس کے بعد ہوتا یہ چاہئے کہ ہر دینماں علاقے اور ہر بستی اور قبیلے سے چند آدمی نکل کر علم کے مرکزوں، مثلاً مدینے اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں آئیں اور یہاں دین کی سمجھ پیدا کریں، پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس جائیں اور عامہ الناس کے اندر بیداری پھیلانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو تحریک اسلامی کو محفوظ کرنے کے لئے تھیک موقع پر دی گئی۔ ابتداء میں جب کہ اسلام عرب میں بالکل نیا نیا تھا اور انتہائی شدید مخالفت کے ماحول میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت اسلام قبول کرتا ہی وہ شخص تھا جو پوری طرح اسے سمجھ لیتا

تحا اور ہر پلو سے اس کو جانچ پر کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی کے مർحلوں میں داخل ہوئی اور زمین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں کی آبادیاں فوج در فوج اس میں شامل ہونے لگیں، جن کے اندر کم لوگ ایسے تھے جو اسلام کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ سمجھ بوجھ کر اس پر امکان لاتے تھے، ورنہ بیشتر لوگ محض وقت کے سیالاب میں غیر شوری طور پر نہیں چلے آ رہے تھے۔ نو مسلم آبادی کا یہ تجزیہ رفتار پھیلاو بظاہر تو اسلام کے لئے سبب قوت تھا، کیوں کہ بیرون اسلام کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن فی الحقيقة اسلامی نظام کے لئے الیک آبادی کسی کام کی نہ تھی بلکہ الشی نعصان دہ تھی جو شور اسلامی سے خالی ہوا اور اس نظام کے اخلاقی مطالبات پورے کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ چنانچہ یہ نعصان غزوہ جنوب کی تیاری کے موقع پر محل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس لئے عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ تحریک اسلامی کی یہ توسعی جس رفتار کے ساتھ ہو رہی ہے اسی کے مطابق اس کے احکام کی تدبیر بھی ہونی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ ہر حصہ آبادی میں سے چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے، پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ مسلموں کی پوری آبادی میں اسلام کا شور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لئی چاہیے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا حکم اس آئیت میں دیا گیا ہے اس کا اصل مقصد عامۃ الناس کو محض خواندہ بناانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد حقیقی یہ تعلیم کیا گیا تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کرو دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویہ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور کتاب خوانی اور دینی علوم کی واقفیت پھیلانا

نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں الگی تعلیم کیا جانا چاہتا ہے جو اور پر کے خط کشیدہ مقصود تک پہنچائی ہو۔ ورنہ ایک ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن شہزاد اور فرائذ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور فیر مسلمانہ رویہ زندگی میں بستکا ہوا ہو تو اسلام الگی تعلیم پر لعنت بھیجا ہے۔

اس آہت میں لفظ لیتفقہو افری الدین جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہم پیدا ہو گئی جس کے ذہریلے اثرات ایک دن سے مسلمانوں کی ندیمی تعلیم بلکہ ان کی ندیمی زندگی پر بھی بری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توتفقه فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے خاتم میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ مگر وہ عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کون سا طریق مگر اور کون سا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے پہل کر جو قانونی علم اصطلاحاً "فقہ" کے نام سے موسم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (مقابلہ روح) کا تفصیل علم بن کر رہ گیا، لوگوں نے اشتراک لفظی کی بناء پر سمجھ لیا کہ یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الہی کے مطابق تعلیم کا منتهائی مقصود ہے۔ حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزو مقصود تھا۔ اس تعلیم الشان غلط فہم سے جو نقصانات دین اور ہر دن دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لئے تو ایک کتاب کی دست دوڑ کا رہے، مگر یہاں ہم اس پر متعبر کرنے کے لئے مخترا "اع اشارہ کیے دینے ہیں" کہ مسلمانوں کی ندیمی تعلیم کو جس چیز نے روح دین سے خالی کر کے محض جسم دین اور ٹھیل دین کی تحریک پر مر تکز کر دیا، اور بالآخر جس چیز کی بد دلت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان غاہرداری، دین داری کی آخری حوصل بن کر رہ گئی، وہ بڑی حد تک بھی غلط فہمی ہے۔

(۸)

## شریت اور خارجہ پالیسی

(الف) لَنِ الَّذِينَ امْفَرَا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ لَمْ يَرْأُوا نِصْرًا أَوْ لَكْ شَيْءًا بِعْضُهُمْ لَوْلَيَاءً بَعْضُهُمْ طَ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا وَلَمْ يَهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَيْتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يَهَاجِرُوا جَ وَان  
لَتَنْصُرُو كُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النِّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ مِمْ بَيْنَهُمْ  
مِثْقَطٌ طَ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

(الأفال - ۷۲)

”جن لوگوں نے ایمان قول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں  
اپنی جانیں لاائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے  
والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے  
ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے  
(دارالاسلام میں) آئنیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق  
نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین  
کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔  
لیکن کسی الی کوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معابدہ ہو۔ جو کچھ  
تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔“

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک ایک اہم دفعہ ہے۔ اس میں یہ

اصول مقرر کیا گیا ہے کہ "ولایت" کا تعلق صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہو گا جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آ جائیں۔ باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود ارضی سے باہر ہوں، تو ان کے ساتھ نہ ہی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن "ولایت" کا تعلق نہ ہو گا۔ اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلق ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دارا لکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دارالاسلام میں آئیں۔

"ولایت" کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی، اور اس سے متعلق بڑے مفہومات کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس آیت کے سیاق و سبق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شریوں سے، اور شریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت "دستوری و سیاسی ولایت" کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے۔ اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایسا اشارہ کافی ہو گا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارا لکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے، باہم شارہ بیاہ نہیں کر سکتے، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دار لکفر سے شریعت کا تعلق نہ توزا ہو۔ علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہوں۔ باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمہ داری کا ہمارا اس کے سر نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ انا بُری من کل

مسلم بین ظہر ائمہ المشرکین میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حماقت کا زندہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔” اس طرح اسلامی قانون نے اس جھوٹے کی جگہ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیغمبر گروں کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لتی ہے تو اسکی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لا ایسا بھی نہیں سمجھا سکتیں۔

اوپر کے فقرے میں دارالاسلام سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو ”سیاسی ولایت“ کے رشتہ سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ بعد کافقرہ اس امر کی توضیح کرتا ہے کہ اس رشتہ سے خارج ہونے کے باوجود ”دینی اخوت“ کے رشتہ سے خارج نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ اسلامی برادری کے تعلق کی بناء پر دارالاسلام کی حکومت اور اس کے پاشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔ لیکن اس کے بعد مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ انہوں نے انجام نہیں دیا جائے گا بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس دلخواہ رکھتے ہوئے عی انجام دیا جاسکے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دارالاسلام کے معاهداتہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جاسکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آئیت میں معاهدہ کے لیے ”یثاق“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ ”وثوق“ ہے جو عربی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یثاق ہر اس چیز کو کہیں گے جس کی بناء پر کوئی قوم بطرق معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ ہمارا اس کے ساتھ صریح طور پر عدم محاربہ کا عهد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

بھر آیت میں یعنیکم و یعنیهم میثاق کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی ”تمارے اور ان کے درمیان معاهدہ ہو۔“ اس سے یہ صاف جریح ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی حکومت نے جو معاهداتہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کیے ہوں وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں اور ان کی اخلاقی ذمہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔ اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً ”جاز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد بسکدوش رہیں۔ البتہ حکومت دارالاسلام کے معاهدات کی پابندیاں صرف ان مسلمانوں پر ہی عاید ہوں گی جو اس حکومت کے دائرہ عمل میں رہتے ہوں۔ اس دائیرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ دار ملنوں میں شریک نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حصہ یہ میں جو صلح نبی مصطفیٰ اللہ علیہ وسلم نے کفار کہ سے کی تھی اس کی بنا پر کوئی پابندی حضرت ابو بصر اور ابو جندل اور ان دوسرے مسلمانوں پر عاید نہیں ہوئی جو دارالسلام کی رعایا نہ تھے۔<sup>۱</sup>

(ب) وَمَا تَخَلَّفُنَّ مِنْ قَوْمٍ خَيَالَةً فَأَمْبَذَ الْيَمَمَ عَلَى سَوَادِطِ

(الأنفال: ۵۸)

”اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندریشہ ہو تو اس کے معاهدے کو اعلانیہ اس کے آگے پہنچ دو۔“ اس آیت کی رو سے ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاهدہ ہو اور تمہیں اس کے طرز عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عهد کی پابندی میں کوتایی برداشت رہا ہے یا یہ

اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاهدہ نہیں رہا اور یکاکہ اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاهدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے بعد ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فرقہ ہائی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاهدہ باقی نہیں رہا تاکہ فتحِ معاهدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے دیسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاهدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمانِ الہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ "من کان بینہ و بین قوم عهد فلا یحلن عقدہ حتن ینقض عهدها او ینبذ الیهم علی سواد۔" جس کا کسی قوم سے معاهدہ ہوا ہے چاہیے کہ معاهدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا محمد بر ابری کو ملاحظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پہنچ دے۔ "پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھر لایا کہ تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ "لا تحن مل خانک" "جو تیری خیانت کرے تو اس کی خیانت نہ کر۔" اور یہ اصول صرف وعدوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لئے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیرِ معاویہ نے اپنے عہدِ باشانی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاهدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکاکہ روی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عمرو بن حبہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حدیث سنائی کہا کہ معاهدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیرِ معاویہ کو اس اصول کے آگے سرجھا دیتا پڑا اور سرحد پر اجتماع فوج روک دیا گیا۔

یک طرف نسخ معاهده اور اعلان جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جالیت میں بھی تھا اور زمانہ حال کی منذب جالیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگ عظیم ۲ میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کارروائی کے لئے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرے فرقہ ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھایتا۔ لیکن اس قسم کے بھانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لئے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بھانے نہ کیا جاسکتا ہو۔ ہرچور، ہرڑا کو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرام کے لئے الی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ میں الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لئے ان کے بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قوی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فرقہ ہائی علی اعلان معاهدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ الی یہ صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق نسخ معاهدہ کا نوٹس دیں بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فتحابے اسلام نے یہ استثنائی ہمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے نکلا ہے کہ قریش نے جب نبی خزاعہ کے مقابلے میں صلح حدیبیہ کو اعلانیہ توڑ دیا تھا تو آپؐ نے پھر انہیں نسخ معاهدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قابلہ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام

حالات ہمارے پیش نظر ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی تاکہ حیروی ہو تو آپ کے پورے طرز عمل کی ہونہ کہ اس کے کسی ایک منفرد مطلب جزو کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ :

اولاً ”قریش کی خلاف ورزی الی مرتضیٰ“ تھی کہ اس کے نقص عدد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے مترف تھے کہ واقعی معاهدہ ثوث گیا ہے۔ انہوں نے خود ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقص عہد قوم کو خود بھی اپنے نقص عہد کا اعتراض ہو۔ البتہ یہ یقیناً ”ضروری ہے کہ نقص عہد بالکل مرتضیٰ اور غیر مشتبہ ہو۔“

ثانیاً ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ثوث جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتہ“ یا اشارۃ و کنایۃ ”الی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایماں لٹتا ہو کہ اس بد عہدی کے باوجود آپ ابھی تک ان کو ایک معاهدہ قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کے معاهدہ اور روابط اب بھی کام نہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ ہتھی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آ کر تجدید معاهدہ کی درخواست پیش کی تو آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ہالاً ”قریش کے خلاف جنگ کارروائی آپ نے خود کی اور حکم کھلا کی، کسی الی فریب کاری کا شایدہ تک آپ کے طرز عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپ نے بظاہر صلح اور بپاٹن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔“

یہ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہے۔ لذا آیت نہ کوہہ بالا کے حکم عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقہ سے کی جاسکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید بر آنی اگر کسی معاهدہ قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاکت ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنبہ اور بیان الاقوای ہاشمی کے ذریعے سے وہ نزاکت طے نہیں ہوتی یا یہ کہ فرقہ ہاشمی اس کو بزور طے کرنے پر ٹلا ہوا ہے تو ہمارے لئے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں مالک استھان کریں لیکن آئتِ خدا کو رہ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استھان مالک صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہئے اور حکم کھلا ہونا چاہئے۔ چوبی چھپے ایک جگل کا روایا جان کرنا جن کا اعلامیہ اقرار کرنے کے لئے ہم تیار نہ ہوں، ایک بد اخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔<sup>۱</sup>

(ج) فَلَمَّا تَلَقَّبُوكُمْ فِي الْعَرْبِ فَشَرَوْبِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ لِعِلْمٍ

یذکرون

(الأنفال - ۵۷)

”ہم اگر یہ لوگ تھیں لا ای میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کر ان کے بعد ہو دوسرے لوگ ایسی روشن انتیار کرنے والے ہوں، ان کے خواص باختہ ہو جائیں۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاهدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاهدہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ لے، تو ہم بھی معاهدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے بے کدوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لا ای ہو رہی ہو اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایک ایسی قوم کے افراد بھی شریک جنگ ہیں جس سے ہمارا معاهدہ ہے تو ہم ان کو قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سامعاملہ کرنے میں ہرگز کوئی تأمل نہ کریں گے، کیونکہ انہوں نے اپنی انفرادی

حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اس کا سخت نہیں رہنے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملے میں اس معاہدہ کا احترام طور پر کھا جائے جو معاہدے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔<sup>۱۱۸</sup>

(د) وَلَنْ جِنِحُوا لِلْكُلُومْ فَلِجْنَعْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ طَالِه  
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ○ وَلَنْ يَرِدْ وَالَّذِينَ يَخْدُعُوكُمْ فَإِنَّ حَسْبَكُ اللَّهُ

(الأنفال - ۷۲ - ۷۳)

”اور اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مارکی ہوں تو تم بھی اس کے لئے جسک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً“ اللہ سب کچھ سخنے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے۔“

یعنی بین الاقوای معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلالتہ نہیں ہونی چاہئے بلکہ خدا کے بھروسے پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب سمجھ کوئے صاحبت کی خواہش ظاہر کرے، بے خلاف اس کے لئے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لئے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرتا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بر حال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شہر کے خوزیری کو طول کیوں دو اور اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تم خسیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہئے صلح کے لئے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو اور لوائی کے لئے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت پازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم جسمیں نرم چارہ سمجھنے کی جرات نہ کرے۔<sup>۱۱۹</sup>

۱۱۸ تفسیر القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۵۲۔

۱۱۹ تفسیر القرآن جلد دوئم۔ صفحہ ۱۵۱۔

اوپر کے صفحات میں جو آیات اور ان کی تشریع پیش کی گئی ہے وہ قرآن  
کے سیاسی تصورات اور اسلامی حکومت کے رہنمای اصولوں پر روشنی ڈالتی ہے۔  
قرآن نے اس شعبہ زندگی کے بارے میں واضح اور دلوك ہدایات دی ہیں اور  
مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اجتماعی معاملات ان ہدایات کی روشنی میں  
ملے کریں۔ صرف اس طرح وہ اپنے دین و ایمان کے تھانے پورے کر سکیں  
گے۔

حصہ چہارم

اسلامی انقلاب کی راہ

باب ۱۶

## اسلامی انقلاب کی راہ

- اسلامی انقلاب کی راہ
- اسلامی حکومت کی خصوصیات
- اسلامی انقلاب کی سبیل
- اسلامی تحریک کا مخصوص طریقہ کار
- پر امن انقلاب کا راستہ
- ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریقہ کار
- نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب
- سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب

آخر میں ہم مولانا مودودی صاحب کا وہ مقالہ دے رہے ہیں جو موصوف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اشتراکی ہال میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ کے وہ حصے حذف کردیے گئے ہیں جو اس وقت کے خاص حالات سے متعلق تھے اور ان تمام اصولی مباحث کو باقی رکھا گیا ہے جو اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی انقلاب کے مزاج اور طریق کا پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مرتب

(I)

## اسلامی انقلاب کی راہ

اس مقالہ<sup>۱</sup> میں مجھے آپ کے سامنے اس عمل (Process) کی تعریف کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔

اہل علم کے اس مجمع میں مجھے اس حقیقت کی توضیح پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو۔ مصنوعی طریقہ سے نہیں بناتی۔ وہ کوئی الگی اچھتی نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جا دیا جائے۔ اس کی پیدائش ٹھاکر سوسائٹی کے اخلاقی، نفسیاتی، تہذیبی اور تاریخی اسیاب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites) کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری متفقینات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور دور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیبی سے برآمد ہوتا ہے۔ جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیائی مرکب ہیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر لٹھنے ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ایک حکومت صرف ان حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بھم پہنچ گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ ان حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس

<sup>۱</sup> یہ مقالہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو انجمن اسلامی تاریخ و تدن کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بمقام اشتہری ہال پر ڈھاگیا۔

کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور بکل آئے، کیساوی اجزاء کی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ بچل آم دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسہاب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، ان کے مل کر کام کرنے کا ذہنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لئے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ سمجھیں کے قریب پہنچے تو انہی اسہاب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجئے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دغل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی ننگی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسہاب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرز عمل اختیار کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ولیم ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ذہنگ کی لیڈر شپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا انتظام اس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرة کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسہاب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مرتب تک جدوجہد سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا بینا و شوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لئے ان طاقت ور اسہاب نے جدوجہد کی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بچ سے جب درخت پیدا ہوتا ہے، اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک

خاص حد پر جنگ کر اس میں وہی بھل آئے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اس کی فطری ساخت نور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تأمل نہ ہو گا کہ جہاں تحریک لیڈر شپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمت عملی، ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام زندگی پیدا کرنے کے لیے مناسب و موزوں ہو۔ اور امید یہ کی جائے کہ ان کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہو گا۔ وہاں بے شوری، خام خیالی، اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

---

(۲)

## اسلامی حکومت کی خصوصیات

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے متاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خالص قوم پرستی کا عصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ نا آشنا رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ مگر ایک اصولی حکومت اس بیان پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت اُنیٹ کے چلانے میں حصہ دار ہو گا، دنیا کے ٹنگ زہن میں کبھی نہ سا سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سائقش پایا مگر اس کو وہ مکمل نظام فکر شہ مل سکا جس کی بیان پر کوئی ریاست تغیر ہوتی۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی۔ مگر بیشنظام کی تاریکی میں گھم ہو گئی، اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چڑھا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بیان پر تغیر کرنے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اس کی رُگ و پے میں بھی آخر کار بیشنظام گھس گیا۔ ابتداء سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شعبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئینہ یا لوجی کی بیان پر تغیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو

دھوت رہتا ہے کہ اس آئیڈیا الوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔ یہ چنچڑوں کے نزدیک نہ رالی ہے، اور گردوپیش کی تمام دنیا اس کے خلاف جل رہی ہے، اس لئے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جملہ مختصرات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے مگر میں پیدا ہوئے ہیں، مگر جن کے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ، اور یورپی کے سیاست اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، ان کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ افسوس ہے کہ وہ ممالک جن کی پیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس حکم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آکی، تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں ایک ٹولیدہ ٹھری پائی جاتی ہے، لوگ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر یہاں پر اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر ہمار کرونقہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومتی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز ٹھر (Nationalistic Ideology) میں دانستہ دنادانستہ پھنس جاتے ہیں اور جو پروگرام منحصر ہیں وہ ہمیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیٹ، امیر، امامت امیر، اور اسی حکم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اسی ٹھر کے اختبار سے یہ سب ان کے لئے ذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش نسبتی سے پرانے ذخیرے سے گھر سے گھر رائے مل گئے ہیں اور غیر اسلامی ٹھر کو چھپانے کے لئے اسلامی رنگ کے خلاف کا کام دینے لگے ہیں۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی وقت پیش نہ آئے گی کہ اس کی ہمار کھنے کے لئے یہ طرز ٹھر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطہ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا۔ کجا کہ تغیر کے انجام تک پہنچا

سکے، بلکہ زیادہ سمجھ یہ ہے کہ اس کا ہر جزو یک تیش ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تختیل کی تو بیوادی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام اور حکومت کا دعائیجہ تغیر کرنے میں ان کی اپنی فلاح ہے اور جو اس کو قانون کر سکے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ خود کچھ اس تختیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جس کے دلائی، زبان افعال و حرکات، ہر جزئیہ قومیت اور قوم پرستی کا نسبہ کا ہوا ہو؟

### خلافت اسلامیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پوری عمارت خدا کی حاکیت کے صور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بیوادی نظریہ ۱۔ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے اور وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خادان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکیت ۔۔۔ (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حرم دینے اور قانون بانے کا حق صرف خدا کے لئے خاص ہے۔ حکومت کی سمجھ ٹھیں اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے اور یہ حیثیت سمجھ طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے! یا تو کسی انسان کے پاس برادر ایسا ہے خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی یہودی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر امکان لا سیں اور اس کی یہودی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلا یا جائے گا کہ ہم بحیثیت مجموی، اور ہم میں سے ہر ایک فرد "فردا" خدا کے سامنے جواب دہے، اس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر جزئیہ کو جانتے والا ہے، جس کے علم سے

۱۔ اس نظریہ کی تشرع کتاب کے پہلے ابواب میں ہو چکی ہے۔ مرتب۔

کوئی چیز چھپنے نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے مرکر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے پردوں کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلاٹیں، ان کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سراپے آگے جھکوائیں، ان سے نیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش اور اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریاکی کا سامان کریں، بلکہ یہ بارہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانون عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر زراسی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصباً جانب داری یا بد دیناتی کو داخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے، خواہ دنیا میں ہر سڑا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت، کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کی فوج، اس کی پولیس، اس کی عدالت، اس کے مالیت، اس کے حاصل، اس کی انتظامی پالیسی، اس کی خارجی سیاست، اس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی عدالتون کے بیچ، چیف جش، اس کی عدالت کے گلرک بلکہ چہرائی تک بنتے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انپکٹر جنرل وہاں کافی سیل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ ان کے جنرل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ ان کے وزراء خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دعا اور بددیانیستوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے کار و بار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال

کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں اس کو اپنے شری، اپنے دوڑ، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے نجح اور مجھریٹ، اپنے حکموں کے ڈائریکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء، اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اس ضابطہ اور اس طرز عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جن کی تمام سی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو۔ جن پر مخفی یا قوی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلائی مسلط ہو، جو بیک نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نئے میں بدست ہو جائے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے ان کی دست قدرت میں آئے تو وہ راتوں کی غیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں۔ جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بد کاری و شہوت رانی کا کوئی اندریشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں۔ جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ ان کی راستی، انصاف پسندی، اصول و اخلاق کی پابندی اور عمد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے ماہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality)

مختصری یا قوی مصلحتوں کی خاطر بھی ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیش نظر نہ خدا ہونہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکزو محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نفعان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت ہنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہوں گے۔ ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک فمارت میں دیک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

(۳)

## اسلامی انقلاب کی سیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدائیں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم کے ملکی، اخلاقی، تحریکی اسہاب و حرکات فراہم ہوتے ہیں ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کوئیل سے لے کر پورا درخت بننے سک تو یہوں کی حیثیت سے نشوونما پائے گھر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یہاں ایک آم دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی مجموعے کی شکل میں صدور نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لئے ناجائز ہے کہ ابتدائیں ایک الی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسب رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہ لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے ساتھ میں ڈھلنے کے لئے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹانپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنسیت، مسلم قانونی، مسلم متورخ، مسلم ماہرین مالیت و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں۔ جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک

پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصول پر مرتب کر سکیں۔ اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمہ غفر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکھ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملہ اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش کی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیحتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جائیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مفہومی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھی میں تپائے جائیں۔ اور ایسا سونا بن کر ٹھیک جس کو پڑھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوف کامل العیار سونا ہی پائے۔ اپنی لٹاوی کے دوران میں وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئینہ بالوچی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ ان کی ہربات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوگ بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، پا اصول، خدا ترس لونگ انسانیت کی فلاج کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہو گا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کچھ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور اولیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس تحریک کے مقابلہ میں دبئے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو گا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو گی اور سوسائٹی کے اس بدالے ہوئے ماحول میں کسی دوسرے طرز کے نظام حکومت کا چنان مشکل ہو جائے گا۔ پھر جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہو گا اس کو چلانے کے لیے ابتدائی الہکاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پر زے اس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے، جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ حضرات! یہ ہے اس انقلاب کے ظور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری

طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ آپ سب اہل علم لوگ ہیں۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اسی نوعیت کی تحریک اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اسی نوعیت کا اجتماعی شور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والشیر اور مانشسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب رووس صرف مارکس کے افکار، لینن اور ٹرالسکی کی لیڈر شپ اور ان ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے ساتھے میں ڈھل چکی تھیں۔ جری کا بیٹھل سو شلزم اس مخصوص اخلاقی، نفیاتی، اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جس کو ہیگل، فٹے، گوئٹھے، نبیٹھے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا ہے۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفیاتی اور تمدنی بنیادوں کو طاقت و رجد و جد سے بدل ڈالے۔

---

(۲)

## اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے آپ کے سامنے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بیانوں بدلتے اور از سرنو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

(Technique) اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدا نے واحد کی حاکیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانے سے ایک ہی ہبھاؤ اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آ رہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رسول اللہ (اللہ کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لا محالہ ان ہی لیڈروں کے طرز عمل کی پیروی کرنی ہو گی، کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرز عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی وقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ہتے ہیں۔ مگر ان سے مکمل ایکم نہیں بن سکتی۔ باسل کے عهد جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستور اقوال ہیں، جن سے کسی حد تک اس پل پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل

ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلا کی جاتی ہے اور کس مسائل سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت سعیؑ کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور کامل رہنمائی ملتی ہے۔ اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نہیں ہے بلکہ دراصل اس را کے نیب و فرماز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام یہودیوں میں صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنالیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظام حملکت کے نفع تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستخر تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا میں اسی مأخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مأمور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بست سے اخلاقی، تدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ روی اور ایرانی امپریلیزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتصاع (Economic Exploitation) بھی ہوا تھا۔ اخلاقی زمام بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک یہودی کے ہاتھ مذہب کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جمالت، اخلاقی پستی، افلس، طوائف الملوكی اور خانہ جنگی میں جلا تھی۔ بحرین سے یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقوں عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی سلطنت میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک روی سلطنت پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے بھی مقابل افریقہ میں جہش کی عیسائی حکومت

موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم نہ ہوں اور اس سے ایک گونہ معاشری و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جماعت خود حجاز اور بیہن کے درمیان نجراں کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر جس لیذر کو اللہ نے راہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے، اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سواتھام الہوں کو چھوڑ دو، اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس رہنمائی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لاکن ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئللوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتداء میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطہ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود عتار آپ اپنا اللہ بنتا ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے خواہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اپری اصلاح انفرادی بگاڑیا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سرٹال لے گی۔ لذما اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود عتاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے باوشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک باوشاہ موجود ہے، اور اس کی باوشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، اور نہ تو اس

کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امت اور اٹھ کی موجودگی میں تیرا خود بختاری کا زعم ایک احتمانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا تھان لامحالہ تیرے ہی اور پر عاید ہو گا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے آگے سرجھا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دیکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی بختار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلانا ہے۔ اس لئے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سرنہ جھکا۔ یہاں کوئی ہر سمجھنی نہیں ہے، سمجھنی اسی ایک کے لئے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہر ہائی نس نہیں ہے، ہر ہائی نس ساری کی ساری اسی کے لئے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہر ہائی نس نہیں ہے، ہر ہائی نس صرف اسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہر لارڈ شپ نہیں ہے، لارڈ شپ بالکل یہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے، قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ، مہاراجہ، کوئی ولی یا کار ساز، کوئی دعا میں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی سنجیان نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوکیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے، اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابند حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت ادھیر کراز سرنو ایک نقشہ پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے برآہ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی

منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی ہیر پھیر کار راستہ اختیار نہیں کیا کہ پسلے کچھ سیاسی اور سو شل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لئے جائیں پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹے ہی اس نے لا الہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اس کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ چیز برانہ جرات اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کاری ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مدد مگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں۔ اسی چیز میں ان کے لئے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنا لائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لئے اٹھیں۔ لذا اسلامی تحریک چلانے کے لئے جس خاص قسم کے تذیر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی ہے کہ کسی تہمید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور مخفی ایک نہ ہی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکیت والوہیت کی بنیاد پر بنتا ہو، جذب بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موزنوں کو اشهاد ان لا الہ الا اللہ کی صدائیں کرتے ہوئے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سے لتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سنتے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا

جان بوجو کراس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی پادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdictions) مجھے تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے انتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدائ کیسی بھی شخص کے پیشوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لونے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ نے لونے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یہاں کہ زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لئے سانپ، پھپو، اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لئے جس پر جس پلوس سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو بانے کے لئے انہوں کھڑا ہوا۔ پھر یوں کو اپنی بر بمنیت و پیاسیت کا خطرہ اس میں طر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہو کاروں کو اپنی ساہو کاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفویق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت ا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ وادا کے سور وٹی طریقہ کا، غرض ہربت کے پرستار کو پنے بنت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا۔ اس لئے الکفر ملة واحدۃ کے بمصدق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس نئی تحریک سے لونے کے لئے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کوئی اور موت سے کھینچنے کے لئے

تیار ہو جائیں۔ الحکمی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو، دو، چار چاد کر کے آتے رہے اور سمجھش بدھتی رہی۔ کسی کا روز مگر چھوٹا، کسی کو گھروالوں نے نکال دیا، کسی کے عزیز، دوست، آشناس بچھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تھی ہوئی رہت پر سمجھیا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لامب دے کر خریدنے کی کوشش کی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ ان کا آنا ضروری تھا۔ ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ ملکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا تم کے، کچھ کیر کڑ اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جو ہر تھا، جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوانہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قوی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے، اسی کے لیے وہ پڑے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تحائف مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیر کڑ پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس ذبر دوست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے انتہا ہے اور اس کی راہ میں سمجھش، جدو جدد، مصیبت تکلیف، پریشانی، نار، قید، فاقہ، جلا و ملنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تحریک کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں، اور اس کی

پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی بھیل میں مدد دینے کے لیے نمازان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پاندھی کا ہر امکان دور ہو جائے، اپنے نصب الحکوم پر ان کی نگاہ جبی رہے، جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکیت کا پار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مفبوط ہو جائیں، جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے۔ اس کا عالم الغیب والشهادۃ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاهر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن ششیں ہو جائے اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرا کی اطاعت کا خیال تک ان کے دلوں میں نہ آئے پائے۔

ایک طرف آئے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی سکھش کی وجہ سے اسلامی تحریک بھی بھیل رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹھے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں۔ گروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ گواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پڑ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر مخفف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں، آخرالیٰ کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو بھکرارہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قریان کر رہے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں، ان کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذاتی

وجاہت کے سکریا اجداد پرستی کی جمالت یا اغراض دینوی کی محبت نے انڈھائیا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف سمجھتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دریں تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سوری ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اس کی طرف سمجھنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہربات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی روح سمجھتی تھی اور آدمی کو سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریع کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصرًا "چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

ان کی یوں حضرت خدیجہ "حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں" اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنانا یعنی کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور یوں دونوں نے اس تحریک کو پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا مالک التجار کملاتا تھا اس کی سواری کے لیے ایک گدھا تک میرنہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت ' کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ذمیر آپ کے قدموں میں لگادیں گے، بشر طیکہ آپ اس تحریک سے باز آ جائیں، مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو تھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ "میرا! ہم تمہارے پاس کیسے آکر

بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاز اللہ کہنے لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انہیں ہٹاؤ تم ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اویج خیج برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھنکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ، انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ، اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیرہائیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ، عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو جیش کے بلال، ردم کے سیب، اور فارس کے سلمان کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی۔ ہر ذاتی، خاندانی، قومی، دینی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کر کے لٹکے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چل دیتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی کوشش کی، اور اس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے، اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد میدان بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے

ہوں گے کہ یہ تم کس سے ٹوڑ رہے ہو؟ اس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھوٹا؟ اس وقت ان کے ہاتھ خد کی ہنا پر ٹوٹے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے بھج رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی تکشیت کے اخلاقی اسیاب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

تبہ برس کی شدید جدوں بعد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے کارکن فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لئے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصری مدت میں ہر شعبہ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرادی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیا لوچی کے ایک بھروسہ حخل (Abstract Idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تھا نہیں کا دوسرے جس میں اسلام کے انتظامی، قضیٰ، عدالتی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبہ زندگی کے لئے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منتقل کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس ٹھیک میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس

کے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے۔ ابو جمل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے۔ ابو سفیان قائل ہوئے۔ قاتل حزہ و حشی قائل ہوئے۔ ہند جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سرتسلیم خم کرونا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلظتی سے تاریخ نگاروں نے غزوہات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عرب کا یہ انقلاب لاائیوں سے ہوا۔ حالانکہ پانچ سال کی تمام لاائیوں میں، جن سے عرب جیسی جگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار پارہ سو سے زیادہ تھیں ہے۔ انقلاب کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سونپنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائص بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی محنت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علبردار بن گئے۔ جو چور اور اچھے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تماں تھا کہ مہادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضر نہیں۔ جوڑا کو اور لیرے تھے وہ اتنے تین دین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایہ تخت ایران کی تخت کے موقع پر کوڑوں کی قیمت کا تاج شاعی ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پونڈ لگے ہوئے کبل میں اسے چھپا کر پہ سالار کے حوالے کرنے کے لئے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریا کاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفنی

کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ ملی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو پیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری معاملہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آও حاصلہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ذمیر آئنے سامنے لا گاویئے۔ اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ذمیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس زائل قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انجمن بدندال رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے لکڑا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انسی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدا پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے اتردیو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور بیٹی کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ پہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شرخالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہذا جو نیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ اپنی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے پہ سالار ان ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر اسی بر محل تقدیم کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی پاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقت کا پیچ اسی وقت پڑ گیا ہو گا۔ ان میں وہ شری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن

جرائم کی سزا ہاتھ کائیں اور پھر مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزادے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش نہ ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لوتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مال غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کام سارا پہ سالار کے سامنے لا کر رکھ دیتے تھے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محس لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تکوار نے انسانوں کو اس طرح پر بدل ڈالا؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے، مگر بعد کے دس سال میں سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معنے کو لوگ حل نہیں کر سکتے، اس لئے عجیب عجیب تو جیسیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے جب تک اس نئی آئندیا لوچی پر زندگی کا نقش نہیں بناتھا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نہی شاعرانہ باتیں ہیں کوئی کہتا کہ یہ شخص بجنوں ہو گیا ہے، اور کوئی اسے محس خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے نہیں کا حق ادا کر دیتا۔ اس وقت صرف غیر معمولی ذہانت اور سمجھ رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی لگاہ حقیقت ہیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیا ہا "آگئے" تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جس کو بنانے کے لئے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد خند اور ہٹ دھرمی کے لئے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی پیشانی پر

دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لئے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام بہپا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو مجھہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی یعنی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا واقعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علمت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنسیک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی عتائق برآمد ہو سکتے ہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لئے ایمان، شور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ اور مخصوصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لئے جو انہیں لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ نہوا کرے وہ اپنے نصب الحین کے راستے سے ایک انج نہ ہیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جبکہیں، مزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، دہن جو چیز بھی ان کے نصب الحین کی راہ میں حائل ہو اس سے لا رجاء میں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا۔ ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیسے سے ہو سکتا ہے۔

(۵)

## پر امن انقلاب کا راستہ۔

سوال :- ذیل میں دو شہمات پیش کرتا ہوں۔ براہ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرمائیں صاف کرو جئے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے یوں ہے پہنچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مظہم ایشیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک مظہم ایشیت تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدار کلی ختم کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بودھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار احتیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ ایشیت اس دور سے کئی گنا زیادہ ہدہ کیرہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کا طریق کار احتیار کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ ۱۔ مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو

۱۔ یہ سوال و جواب ترجمان القرآن محرم ۱۴۵ھ دسمبر ۲۰۰۵ء سے لے جا رہے ہیں۔ اگر تم تقسیم کا پس مظہر سامنے آئے تو ان کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ مرتب

۲۔ یہ خط اور اس کا جواب اس مجموعے کے اگلے حصے میں ”ہدہ کیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار“ کے زیر عنوان درج ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لئے تو مرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جدا گانہ ریاست کی تعمیر و تکمیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہمارے لئے بھی طریق کار اب یہی ہے۔ واضح فرمائیے کہ میری یہ رائے کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجودہ الوقت وستوری طریقوں سے نظام باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جاسکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہو گا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک حد تک اسہلیوں میں آنے کے لئے تیار ہے اور ایکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔

جواب:- ہمارے لئے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتبع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرز عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس طریق کار کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسے کہ وہ جو نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کرم نے اس پر لعنت بھیجتے اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قول کرنے سے حضرت

یوسف علیہ السلام کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلا گئیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریمؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپؐ بھی اسے قول کر لیتے اور خواہ مخواہ لا کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح بھی ہم کو اگر یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظام حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اس کے قول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔

(۲) الیکشن لڑنا اور اس بدلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ اگر ایک فیر اسلامی دستور کے تحت ایک لاوی (Secular) جموروی (Democratic) ریاست کے نظام کو چلا دیا جائے تو یہ ہمارے عقیدہ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ شیز ہی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لججھے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:-

اولاً:- ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لئے ہمار ہو جانا ہی عمل اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔  
ثانیاً:- ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ٹالا:- انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

(۶)

## ہمسہ کی ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کارا۔

سوال :- یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لئے بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شور حاصل کر چکا ہو، صرف ایک یعنی چیز مقصد زندگی قرار پاسکتی ہے، اور وہ ہے حکومت اپنے کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے صرف دینی طریق کار اخیار کیا جاسکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلائی مناسبت رکھتا ہو۔ اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عمل اخیار کیا ہو۔ حکومت الہی کے نصب العین کے داعی انہیاء کرام ہیں۔ اس لئے طریق کار بھی وہی ہے جو انہیاء کا طریق کار ہو۔

انہیاء کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں :-

ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت ایشیت ایک منظم اور مکوڑ طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کار فرا نظر آتا ہے، اور اکثر حالات میں وہ ایسا ایشیت ہوتا ہے جس میں اقدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت

موسىٰ علیہ السلام۔

دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک الگ سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں ایٹھ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ سرفیلی (Patriachal) دلسلم۔

دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے، "جو غالباً" اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامیعت اور ہمہ سیری ایٹھ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آج کل فرد کو چاروں طرف سے سمجھ رکھا ہے اور جس ملکم و موثر اور مضبوط طاقت، لگری اور عملی دونوں جیشتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے۔ اس کی مثال شاید بھیل تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وعی طریق کار جو تقریباً "غیر ریاستی (Stateless) سوسائٹی یا حد سے خارج سے سرفیلی حکومت میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا اب بھی اس حتم کی کامیابی کا شامن ہو سکا ہے؟ کیا آج کل کے بدلتے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لئے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فن انقلاب انگلیزی کافی حد تک بدلتا پڑے گا؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ملکم ایٹھ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے بر عکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک ملکم ایٹھ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب قوت مسلط (Sovereign Power) کو اقتدار خلل کرنے پر آمادہ پایا تو اجعافی علی خزانہ الارض کہ کر اقتدار سنبھال لیا اور اس طرح اپنا مشن پورا کرنے کے لئے پہلے کے قائم شدہ ایٹھ کو استعمال میں لے آئے۔ موجودہ زمانہ کا ایٹھ حضرت یوسف علیہ السلام کے عد کے ایٹھ سے

کہیں زیادہ جامع، ہمہ کیروں مضمون ہے۔ اس کو اکھیز کر ایک نیا ائمہت وجود میں لائے کے لئے جو انقلاب بھی ہو گا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا۔ جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محس توڑ پھوڑ حتم کا انقلاب نہیں چاہتا بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ کی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ طبق کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہو گی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائے گی۔

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سرس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے، بلکہ ایک مضمون جماعت کی جدوجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوت حاکم (Sovereign Power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب :- بلاشبہ ایسی حالت میں جب کہ فیر اسلامی ائمہت ہمہ کیروں اس حالت کی پہ نسبت جب کہ فاسد سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اصولی طریق کار بھی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر اپنے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود وقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں

آ جانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشری نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی شامل نہ ہو گا۔ اس لئے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریق کار (Method) سے، لیکن اگر پر امن ذرائع سے جو ہر اقتدار ملے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انھاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

---

(۷)

## نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب۔

سوال:- جن لوگوں سے پاکستان کے آئندہ نظام کے حقوق محفوظ ہوتی ہے وہ اکثر اس خیال کا انکھار کرتے ہیں کہ آپ اور ووسرے اہل علم اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئینہ ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ اس سوال سے صرف بھی کوئی نہیں دوسرے کارکنوں کو بھی اکثر ویشنٹر سابقہ پیش آتا ہے۔ مگر ہم اپنی حد تک لوگوں کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ آپ اس سوال کا جواب ترجمان القرآن میں دیں تاکہ وہ بہت سے ظلا نہیں صاف ہو سکیں جن پر یہ سوال مبنی ہے۔

جواب:- آپ نے ہو سوال کیا ہے اس کا مفصل جواب تو مردست نہیں دیا جا سکتا لیکن مختصر طور پر میں ایک بات عرض کروں گا جس سے امید ہے کہ آپ معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل ہمارہ ہے کہ جماں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہونے اخلاق اسلامی، جماں کا سیاسی و معاشی اور قطبی نظام بھی اب تک فیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہے، اور جماں ایک محدود سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یا ایک نوبت آگئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر اتنا کا ہوا ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کریں اور بر راقدار لوگ اسے لے کر نافذ کر دیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ لگان کرے کہ ایک درست یا ایک بینک کو ہپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہپتال کا

خالہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے ملین یا جیک کے اضاف کو دے رہا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرنے پڑے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعریف سمجھا ہے!

واضح طور پر سمجھ لجھتے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کا رہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے علاج اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو امیت ان کے اندر مفتود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کا رہی ہے کہ پسلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے اصولاً ضروری ہیں۔ (جنہیں ہم نے اپنے "مطلوبہ" میں بیان کر دیا ہے) "پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور نائے پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کا رہ سنبھالنے کے لئے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تغیر کے لئے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جموروی طریق پر انتیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت ختم ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تغیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسری طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جذب سے نجیک کرنے کی ہٹوٹش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں غالباً اسلامی شور و ارادہ کو بتدربیج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پیشی کو پہنچ تو خود بخود اس سے

ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اسی وقت پہلے طریقہ کو آزمائیں ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب الحین تک پہنچنے کے لیے ایک سلسلہ ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ لیکن اگر خدا انخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قریانوں کا صریح خیال ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انسوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطہ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے، جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

امید ہے کہ اس توفیع سے لوگ ہماری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ہم کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرنا چاہتے۔ سروdest ہم نے اسلامی نظام کے بنیادی امور کو ایک مطابہ کی ٹھکنہ میں پیش کر دیا ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو دستور سازی کے کام میں جس حد تک ممکن ہو گا ہم پوری مدد کریں گے۔ لیکن اگر سرے سے یہ بنیادی امور ہی بر سراقدار لوگوں کو منظور نہ ہوں تو پھر دستور کا خاکہ پیش کرنے سے آخر کیا فائدہ متصور ہے؟

(۸)

## سیاسی انقلاب پہلے یا سماجی انقلاب؟۔

سوال :- ہمارے ملک میں یہ احساس عام ہے کہ اسلام کے اصول و احکام پسندیدہ اور مستحسن تو ہیں مگر بحالت موجودہ قابل عمل نہیں ہیں۔ عوام و خواص میں اسلام سے جذباتی و انسگی تو ضرور ہے لیکن اسلام کا صحیح مفہوم اور آمادگی عمل بہت کم ہے۔ اسلام جس ذہنی و عملی انضباط کا مطالبہ کرتا ہے اسے دیکھ کر یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کو نافذ کروایا گیا تو کہیں اس کے خلاف شدید رد عمل نہ رونما ہو جائے۔ سیاسی انقلاب سے پہلے سماجی انقلاب ضروری ہے اور اصلاح کا جذبہ اور پر سے اور باہر سے پیدا کرنے کے بجائے اندر سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے کیا اسلامی ریاست کا مطالبہ قبل از وقت نہیں ہے؟

جواب :- اس مسئلے کی اگر پوری وضاحت کی جائے تو اس کے لئے ہرے تفصیلی جواب کی ضرورت ہے۔ لیکن مختصر جواب یہ ہے کہ بلاشبہ سیاسی انقلاب سے پہلے ایک تہذی، اجتماعی اور اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اسلامی انقلاب کا فطری طریقہ ہے۔ اور بلاشبہ یہ بات بھی درست ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین صرف اور سے ہی مسلط نہیں کیا جاسکتے بلکہ اندر سے ان کے اجماع کا دلی جذبہ بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال چیز رہا بالکل ہے کہ معاشرتی انقلاب پہلے برپا کرنا چاہیے اور سیاسی انقلاب بعد میں۔ اب تو سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک قوم میں ذہنی انقلاب واقع نہ ہو اس وقت تک

آیا ہم سیاسی اختیارات کو کافر انہ اصولوں کے مطابق استعمال کرتے رہیں یا ان اختیارات کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق کام میں لائیں۔ سیاسی اقتدار کا کوئی نہ کوئی صرف اور مقصود بہر حال ہمیں تحسین کرنا پڑے گا۔ حکومت کی مشینی کو اخلاقی انقلاب رونما ہونے تک معطل بہر حال نہیں کیا جاسکتا۔ ایک قوم جو خدا اور اس کے رسول کی حاکیت اور بالادستی پر ایمان رکھتی ہو، اجتماعی اور قومی زندگی کی باعثیں اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنا نظام حیات وہ خود تغیر کرنے کے قابل ہو اور کوئی دوسری کافر انہ طاقت اس پر کوئی کافر انہ نظام مسلط کرنے والی نہ ہو، تو کیا اس قوم کے افراد کے لئے یہ چانز اور درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اخلاقی و عدالتی تحریک کرتے رہیں گے۔ حاکم کو فیر اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لئے چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس صورت حل کو کورا کر لیں تو ہم انفرادی ارتکاد کے مرکب نہ ہوں، اجتماعی اور قومی حیثیت سے ہم ضرور ارتکاد کے مرکب ہوں گے۔

پھر اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اجتماعی و اخلاقی انقلاب لانا چاہئے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس انقلاب کے ذرائع و وسائل کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع میں تعلیم و تربیت، معاشرتی اصلاح، ذہنی اصلاح اور اسی حتم کی بہت سی چیزوں شامل ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ حکومت کے قانونی اور سیاسی ذرائع و وسائل بھی ہیں۔ حکومت کی طاقت نہ صرف بجائے خود ایک بڑا ذریعہ اصلاح ہے، بلکہ وہ ساری اصلاحی تدابیر کو زیادہ منور، پتیجہ خیز اور ہمہ گیر بنا لئے کا بھی ذریعہ ہے۔ اب آخر کیا وجہ ہے کہ اخلاقی انقلاب لانے کے لئے حکومت کے وسائل کو بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ہمارے دو ٹوں اور ہمارے ادا کردہ بیکسوں اور مالیوں کے مل پڑی تو حکومت کا سارا نظام چل رہا ہے۔ آخر اس حفاظت اور جہالت کا ارتکاب ہم کیوں کریں کہ ایک طرف انفرادی حیثیت سے ہم اسلام کے سماجی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف حکومت کے سارے ذرائع اخلاق کے بکار نے اور فتنہ و فجور پھیلانے میں لگئے رہیں۔